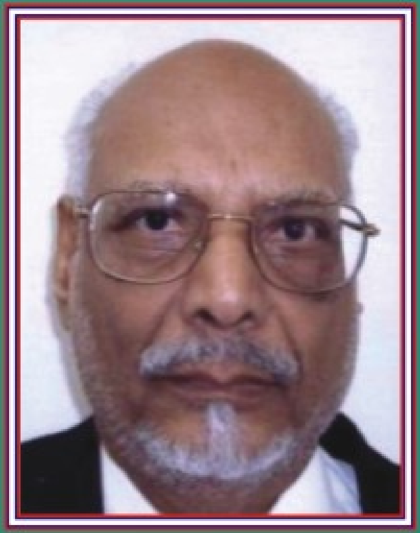
مکتوب آسٹریلیا

متفرق موضوعات پر نہایت دلچسپ، مفید، سبق آموز
علمی، معلوماتی و تربیتی مضامین کا خوبصورت مجموعہ

چوھدری خالد سیف اللہ خان

مکتوب آسٹریلیا
چوھدری خالد سیف اللہ خان



KHALID SAIFULLAH KHAN is a Retired Chief Engineer WAPDA Pakistan and a former Administrative Service Officer of the government of Australia. He has also served in a number of senior posts within the Ahmaidyya Community and has for the last 30 years, contributed a number of articles to various Ahmadi Ahmadiyya Community organs including The Review of Religions.Khalid Saifullah Khan has also studied the translation of the Holy Quran and Arabic at Qadian."

(The Review of Religions, May 2003, P 51)

....

Maktob-e-Australia is a compilation of some of the articles of Chaudhry Khalid Saifullah Khan published mostly in Alfazal International and some other Ahmadiyya Magazines.

مکتوب آسٹریلیا

مضامین: چوہدری خالد سیف اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم　　　　نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہٖ الکریم

پیش لفظ

’’مکتوب آسٹریلیا‘‘ مکرم ومحترم چوہدری خالد سیف اللہ خان صاحب (آف آسٹریلیا) کی ان نگارشات اور مضامین کے انتخاب پر مشتمل ہے جو مختلف اوقات میں جماعت احمدیہ کے اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے۔ بحیثیت ایڈیٹر ہفت روزہ الفضل انٹرنیشنل میرے لئے یہ امر باعث مسرت ہے کہ اس انتخاب کا ایک بڑا حصّہ آپ کی ان تحریرات پر مشتمل ہے جو ہفت روزہ الفضل انٹرنیشنل میں شائع ہوئیں۔

محترم خالد سیف اللہ خان صاحب الفضل انٹرنیشنل کے ان چند ابتدائی قلمی معاونت فرمانے والوں میں سے ہیں جو خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ اب تک بڑے استقلال اور استقامت کے ساتھ یہ تعاون جاری رکھے ہوئے ہیں۔ شروع شروع میں آپ نے مختلف دلچسپ خبریں اور تبصرے الفضل میں بھجوانے شروع کئے۔ بعد میں آپ کی مرسلہ تحریریں ایک لمبے عرصہ تک ’’مکتوب آسٹریلیا‘‘ کے سلسلہ وار کالم کے تحت شائع ہوتی رہیں۔ خاکسار کی تحریک پر آپ نے ’’دنیائے مذاہب‘‘ کے ایک اور سلسلہ وار کالم کے لئے بھی نہایت مفید اور معلوماتی مضامین ارسال فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت عمدہ علمی ذوق عطا فرمایا ہے اور صرف علم ہی نہیں نور علم سے بھی نوازا ہے۔ ’مکتوب آسٹریلیا‘ کے مطالعہ سے قارئین پر واضح ہوگا کہ آپ سائنسی تحقیقات، جدید انکشافات، نت نئی ایجادات، روزمرہ زندگی میں ہونے والے حادثات، متفرق حالات وواقعات اور

مشاہدات کو قرآن مجید، احادیث نبویہ اور مامور زمانہ حضرت اقدس مسیح موعودؑ اور آپ کے خلفاء کرام کے ارشادات وفرمودات کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ یہی ہمارے لئے آسمانی روشنی اور ہدایت کے وہ محکم اور مستحکم ذرائع ہیں جن کے تابع رہنے سے انسان فکر وعمل کی لغزشوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ مکرم خالد سیف اللہ خان صاحب ان آسمانی ونورانی ذرائع ہدایت سے فیضیاب ہوتے ہوئے نہایت خوش اسلوبی سے اور بڑی نفاست اور سلاست کے ساتھ سادہ ،مختصر مگر اثر انگیز الفاظ میں اپنے خیالات ومحسوسات کو قارئین کے لئے پیش کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔مَاشَاءَ اللّٰہ ۔اَللّٰھُمَّ زِدْ وَبَارِکْ۔

مکرم خالد سیف اللہ خان صاحب نے بڑی کثرت سے الفضل انٹرنیشنل کے لئے مضامین بھجوائے ۔کچھ شائع ہوئے اور کچھ نہیں ہوئے۔مگرانہوں نے نہ تو کبھی شائع نہ ہونے والے مضامین پر کوئی شکوہ کیا، نہ ہی مرسلہ مضامین کی اشاعت تک اپنی نئی نگارشات کو روکا اور نہ ہی کسی مضمون میں ادارتی کانٹ چھانٹ پر بُرا منایا بلکہ نہایت انکسار اور تواضع کے ساتھ الفضل انٹرنیشنل کے لئے اپنا بے لوث قلمی تعاون مسلسل جاری رکھا۔ میرے نزدیک یہ بات آپ کی سلسلہ سے گہری محبت اور عرفان پر دلالت کرتی ہے۔آپ ذاتی تجربہ سے اس حقیقت کو بخوبی جاتے ہیں کہ جماعت کے اخبارات ورسائل کے لئے لکھنا جماعت پر احسان نہیں بلکہ فی الحقیقت خود لکھنے والے کے لئے سعادت وبرکت کا موجب ہوتا ہے اور وہ لکھنے والے اپنے محبوب امام خلیفۂ وقت کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں ان مضامین سے استفادہ کرنے والے احباب جماعت کی بھاری اکثریت کی ان دعاؤں میں شامل ہوتے اور ان سے حصہ پاتے ہیں جو وہ دین کی خدمت کرنے والوں کے لئے کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے حضرت مسیح پاک کی اس جماعت میں مختلف علوم کے ماہرین موجود ہیں جو دینی ودنیوی علوم پر گہری دسترس رکھتے ہیں مگر بہت سے محققین، ریسرچ سکالرز، صاحب علم و عرفان دوست اپنے آپ کو پردوں میں لپیٹے ہوئے ہیں اور دُرِّ مکنونہ کی طرح ہیں۔فی زمانہ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ وہ سلطان القلم حضرت اقدس مسیح موعود ومہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی میں قلمی اسلحہ سے لیس ہو کر اور فتح کا علم ہاتھوں میں لے کر علمی وقلمی جہاد کے لئے میدان

کارزار میں اتریں کہ آسمانی روشنی اور الٰہی نصرت وتائید کے مبشر وعدے ان کے ساتھ ہیں۔ خدا کرے کہ وہ جماعت کے مرکزی وملکی سطح پر شائع ہونے والے اخبارات ورسائل میں خدا تعالیٰ کی توحید کے قیام اور اس کی عظمتوں اور قدرتوں کو آشکار کرنے، دین اسلام اور قرآن مجید اور حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت وبرتری کو ثابت کرنے اور بنی نوع انسان کی مادی وروحانی فلاح وبہبود کے لئے ٹھوس، مستند، علم ومعرفت اور روحانیت سے معمور اعلیٰ پایہ کے مضامین لکھ کر اپنے علم کا فیض عام کریں اور سب کی دعائیں لیں۔

مجھے امید ہے کہ "مکتوب آسٹریلیا" کے نام سے شائع ہونے والی یہ کتاب نہ صرف یہ کہ قارئین کے علم میں اضافہ اور دلچسپی کا موجب ہوگی بلکہ وہ اس کے مصنف کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے اور ان کے برادار اصغر مکرم ڈاکٹر محمد زبیر خان رانا صاحب کو بھی جنہوں نے ان مفید مضامین کی کتابی صورت میں اشاعت کے لئے مالی معاونت کا بیڑا اٹھایا اور عزیزم حافظ محمد نصر اللہ صاحب کو بھی جنہوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور تیاری کے مختلف مراحل کو محض للہ محبت اور اخلاص کے ساتھ انجام دینے کے لئے بے لوث تعاون فرمایا۔ فجزاهم الله احسن الجزاء۔

خاکسار

نصیر احمد قمر

(ایڈیٹر ہفت روزہ الفضل انٹرنیشنل

وایڈیشنل وکیل الاشاعت۔لندن)

7/6/2006

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہٖ الکریم

عرض حال

خاکسار نے مختلف اوقات میں جماعتی رسائل واخبارات کے لئے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک انتخاب پیش خدمت ہے۔کتاب کو مضامین کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ''مکتوب آسٹریلیا'' کا ہے دوسرا ''متفرق علمی مضامین کا'' اور تیسرا '' دنیائے مذاہب کا۔''

قرآن کریم سب علوم کا مخزن ہے اور ہر سچا علم قرآن کا خادم ہے۔اس اصول کو پیش نظر رکھ کر اگر دنیاوی علوم کا مطالعہ کیا جائے تو ان گنت انوکھے۔ نئے نئے اور دلچسپ مضامین دل و دماغ کو سوجھتے ہیں جس کا انحصار قاری کے اپنے علم اور استعداد کی نسبت سے ہوتا ہے۔حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی کتاب Revelation Rationality Knowledge And Truth (وحی۔عقل۔علم اور سچائی) اسی بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس کی ہلکی سی جھلک آپ خاکسار کے مضامین میں مشاہدہ فرمائیں گے۔جب دلچسپیاں سانجھی ہوں تو آقا کے حسن کی ایک جھلک اس کے غلاموں میں بھی آجاتی ہے۔حضور کے سوال وجواب کی مجالس سے خاکسار نے بہت کچھ سیکھا اور ان کو اپنے بہت سے مضامین کا مرکزی نقطہ بنایا اس لئے حق یہی ہے کہ

جمال ہم نشیں درمن اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ لکھنے کے لئے کوئی وجہ اور محرک درکار رہتا ہے۔اس مجموعہ کے اکثر مضامین کے لکھنے کا محرک الفضل انٹرنیشنل لنڈن ہوا ہے جس کے مدیر مولانا نصیر احمد قمر صاحب نے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور اپنے مؤقر اخبار میں جگہ دے کر انہیں عزت بخشی اور مقبول عام بنا دیا۔

انہوں نے ہی مجھے ایک بار فرمایا تھا کہ اپنے مضامین کو جمع کر کے کتاب کی شکل میں شائع کرا دیں لیکن تساہل آڑے آتا رہا۔اب یہی بات جب انہوں نے میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد زبیر خان رانا (سابق صدر احمدیہ ڈاکٹر ایسوسی ایشن برطانیہ) سے کہی تو انہوں نے خاکسار کے تعاون سے اس کا بیڑہ اٹھالیا۔اللہ تعالیٰ ان دونوں بھائیوں کو اس کی جزا دے۔آمین

تحدیث نعمت کے طور پر خاکسار عرض کرتا ہے کہ اللہ نے فضل فرمایا کہ بچپن ہی سے میرے دل میں قرآن کریم سیکھنے کی خواہش ڈال دی اور اس کے سیکھنے کے لئے اسباب بھی میسر فرما دیئے۔ خاکسار کا بچپن قادیان میں گذرا اور تقسیم ملک تک وہیں دسویں جماعت تک تعلیم الاسلام ہائی سکول کا طالب علم رہا۔اس زمانہ میں ہمارے سکول میں دینیات کا مضمون لازمی ہوتا تھا اور جو کوئی اس میں فیل ہوتا اسے سارے امتحان میں فیل کر دیا جاتا تھا۔سکول سے فارغ ہونے تک دینیات اور عربی کے طالب علموں کو سارے قرآن کریم کا ترجمہ۔کچھ احادیث و کتب مسیح موعود علیہ السلام ۔عربی ادب کی چند کتابیں مع صرف ونحو وغیرہ پڑھا دیا کرتے تھے جس سے بعد میں دینی علوم کے حصول کے لئے ایک بنیاد فراہم ہو جاتی تھی۔ مجھے قرآن کریم ناظرہ میری والدہ مرحومہ محترمہ آمنہ بیگم صاحبہ نے پڑھایا اور دینی علوم کے حصول کے لئے قادیان میں میرے والد صاحب مرحوم چوہدری محمد یعقوب خان صاحب (نمبردار موضع ِگل منج نزد قادیان وسب انسپکٹر محکمہ امداد باہمی) نے ہم کو رکھا اور خود بسلسلہ ملازمت قادیان سے باہر اکیلے رہنے کی تکلیف اٹھائی۔وہ خود بھی اسی سکول کے طالب علم رہ چکے تھے۔اللہ تعالیٰ دونوں سے اپنی مغفرت اور رحمت کا سلوک فرمائے۔آمین

پاکستان آکر 1954ء میں خاکسار نے انجینئرنگ کالج لاہور سے بی ایس سی انجینئرنگ (الیکٹریکل) کیا اور واپڈا میں بطور ایس ڈی او ملازمت کا آغاز کیا۔ملازمت کے دوران ایک سال بغرضِ ٹریننگ کوپن ہیگن (ڈنمارک) رہا اور ساڑھے چار سال تک حکومت کی طرف سے بنغازی لیبیا

میں کام کرتا رہا۔ وہیں سے آسٹریلیا میں مائیگریشن کی درخواست دی۔ پاکستان واپس آ کر ایک سال ملازمت کی اور 1988ء میں جب آسٹریلیا کا ویزا مل گیا تو 34 سال کی ملازمت کے بعد ریٹائرمنٹ لے کر آسٹریلیا مع فیملی آ گیا۔ واپڈا سے میں بطور ڈائریکٹر جنرل (چیف انجینئر) ریٹائر ہوا تھا آسٹریلیا آ کر پبلک سروس کمشن کا امتحان پاس کر کے بطور ایڈمنسٹر مٹیو سروس آفیسر کام کرتا رہا اور 1996ء میں 65 سال کی عمر میں ایک بار پھر ریٹائر ہو کر ملازمت سے فارغ ہو گیا۔ خدا کے فضل سے ملازمت کے دوران جہاں کہیں بھی رہا مختلف حیثیتوں سے جماعت کی خدمت کا موقع ملتا رہا۔ گذشتہ تیرہ چودہ سال سے بطور نائب امیر جماعت احمدیہ آسٹریلیا خدمت کی توفیق مل رہی ہے۔ الحمدللہ۔

خاکسار نے گزشتہ چالیس سال کے دوران جماعت کے رسائل واخبارات میں جو لکھا اس کا ایک حصہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اگر انہیں مفید پائیں تو جہاں خاکسار کے لئے دعا کریں وہاں سب احباب کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں جنہوں نے ان مضامین کے لکھنے لکھانے اور جمع کرنے میں مدد فرمائی ہے۔ جزاھم اللہ خیرا

(چوہدری) خالد سیف اللہ خان

سڈنی آسٹریلیا

7.6.2006

Add: 65 ROPES CREEK ROAD, MT. DRUITT,

NSW 2770 SYDNEY AUSTRALIA.

TEL\ FAX: 61-2-96254391

e- mail :Ahmad_khalid2000@hotmail.com

انڈیکس مضامین

حصہ دوم ۔ مضامین متفرقہ

حصہ سوم ۔ دنیائے مذاہب

حصہ اول

مکتوب آسٹریلیا

مکتوب آسٹریلیا

خلافت خامسہ کے آغاز پر مؤلف کا ایک خط

مولانا نصیر احمد قمر صاحب ایڈیٹر الفضل انٹرنیشنل کے نام

محترم مولانا نصیر احمد قمر صاحب الفضل انٹرنیشنل لندن

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی اچانک وفات پر دل سخت غمگین اور اداس ہے لیکن ساتھ ہی خلافت خامسہ کی شکل میں ''قدرت ثانیہ'' کے ایک بار پھر ظہور سے دل کو بڑی ڈھارس بندھی ہے اور دل سے کئی قسم کے اندیشے اور خوف دور ہو کر اس پر سکینت واطمینان کی ہوائیں چلتی محسوس ہوتی ہے

یوں تو ہر خلافت خدا تعالیٰ کے دائمی وعدہ کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے اور ضروری نہیں کہ ہر خلافت کے لئے علیحدہ علیحدہ پیشگوئی تلاش کی جائے لیکن اگر کوئی خدائی اشارے سامنے آجائیں تو خلافت کے وعدہ پر ایمان عرفان میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسلام واحمدیت کی سچائی پر ایک نیا یقین پیدا ہوتا ہے۔

پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کا خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۹۷ء ایم ٹی اے پر دوبارہ سننے پر بہت حیرت ومسرت ہوئی کہ اس میں حضرت مرزا مسرور احمد ایدہ اللہ تعالیٰ کی خلافت

کے بارہ میں حضرت مسیح موعودعلیہ السلام کے الہامات میں واضح اشارے ملتے ہیں جن کی طرف پہلے ہمارا دھیان نہیں گیا تھا۔ان کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ

''اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت جس طرح سے پیشگوئی دلاتی ہے ایسا کوئی اور سچا علم نہیں۔معرفت کوزیادہ کرنے کا صرف یہی ایک طریق ہے۔''

(ملفوظات جلد۵صفحہ۱۳۶)

نیز حضرت مسیح موعودعلیہ السلام فرماتے ہیں:

''ایمان عرفان کیسے ہوتا ہے: یہ پیشگوئیاں جو ہیں یہ ایمان کوقوی کر کے عرفان بنادیتی ہیں۔نری باتوں سے ایمان قوی نہیں ہوسکتا جب تک اس میں قوت کی شعاعیں نہ پڑیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے ان نشانات سے پیدا ہوتی ہیں۔پس ان پیشگوئیوں کوخوب کان کھول کرسننا چاہئے۔دوسرے وقت جب یہ پوری ہوتی ہیں تو ایمان کی تقویت کا باعث ہوکراس کوعرفان بنادیتی ہیں۔اس لئے جوامر پیشگوئی پر مشتمل ہو میں اس کوضرور سنادیا کرتا ہوں اور میری غرض اس سے یہی ہوتی ہے۔یہ ایک نور بخشتی ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور نازل نہ ہوانسان غلطی میں پڑا رہتا ہے۔''

(ملفوظات جلد۴صفحہ۳۵۱۔۳۵۲)

اللہ تعالیٰ کے ہرقول وفعل کے کئی کئی بطن ہوتے ہیں۔ان میں تہ بہ تہ علوم ومعارف پوشیدہ ہوتے ہیں اس لئے پیشگوئیاں کئی کئی رنگ میں پوری ہوتی رہتی ہیں۔

حضرت مسیح موعودعلیہ السلام فرماتے ہیں کہ

''پیشگویوں میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ تمام باتیں ایک ہی وقت میں پوری ہوجائیں بلکہ تدریجاً پوری ہوتی رہتی ہیں اور ممکن ہے کہ بعض باتیں ایسی بھی ہوں کہ مامور کی زندگی میں پوری نہ ہوں اور کسی دوسرے کے ہاتھ سے جواس کے متبعین میں سے ہو پوری ہوجائیں۔''

(ملفوظات جلد۶صفحہ۲۰۲حاشیہ)

نیز فرمایا:

''اصل بات یہی ہے جس کو میں نے بارہا بیان کیا ہے کہ پیشگوئیوں کا بہت بڑا حصہ مجازات اور استعارات کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ ظاہری رنگ میں بھی پورا ہو جاتا ہے یہی ہمیشہ سے قانون چلا آتا ہے اس سے ہم انکار تو نہیں کر سکتے خواہ کوئی مانے یا نہ مانے۔''

(ملفوظات جلد۴ صفحہ۳۳)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام پیشگوئیوں کا ایک اصل یہ بیان فرماتے ہیں کہ پیشگوئیوں کی حقیقت اپنے وقت پر اس وقت کھلتی ہے جب واقعات کی رو سے وہ صحیح ثابت ہو جائیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

''اور باتوں کو جانے دو۔ واقعات بھی تو کچھ چیز ہیں۔ متشابہات کی بحث میں نہ پڑو۔ مگر یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ پیشگوئیوں کے وہ معنے ہوتے ہیں جو واقعات کی رو سے صحیح ثابت ہو جائیں۔''

(ملفوظات جلد۳ صفحہ۴۵۱)

اسی طرح فرمایا:

''بات یہ ہے کہ بہت سی باتیں پیشگوئیوں کے طور پر نبیوں کی معرفت لوگوں کو پہنچی ہیں اور جب تک وہ اپنے وقت پر ظاہر نہ ہوں ان کی بابت کوئی یقینی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ لیکن جب ان کا ظہور ہوتا ہے اور حقیقت کھلتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پیشگوئی کا یہ مفہوم اور منشاء تھا اور جو شخص اس کا مصداق ہو یا جس کے حق میں ہو اس کو اس کا علم دیا جاتا ہے۔''

(ملفوظات جلد۴ صفحہ۲۸)

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کو انسان خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ آ گیا اور پھر صبح اس کا کوئی ہم رنگ آ جاتا ہے۔ بعض دفعہ اگر خواب میں کسی شخص کو دیکھیں تو مراد اس کا بیٹا یا پوتا یا اس کی نسل میں سے کوئی شخص مراد ہوتا

ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:۔

''.....آپ لوگ ہمارے نبی کریم ﷺ سے زیادہ علم و فراست نہیں رکھتے۔صحیح بخاری کی حدیث دیکھو کہ جب آنحضرت ﷺ کو ایک ابریشم کے ٹکڑے پر حضرت عائشہ صدیقہ کی تصویر دکھائی گئی کہ تیرے نکاح میں آوے گی تو آپ نے ہرگز یہ دعویٰ نہ کیا کہ عائشہ سے درحقیقت عائشہ ہی مراد ہے۔بلکہ آپ نے فرمایا کہ اگر درحقیقت اس عائشہ کی صورت سے عائشہ ہی مراد ہے تو وہ مل ہی رہے گی ورنہ ممکن ہے کہ عائشہ سے مراد کوئی اور عورت ہو۔آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ابوجہل کے لئے مجھے بہشتی خوشۂ انگور دیا گیا مگر اس پیشگوئی کا مصداق عکرمہ نکلا۔جب تک خدا تعالیٰ نے خاص طور پر تمام مراتب کسی پیشگوئی کے آپ پر نہ کھولے تب تک آپ نے اس کی کسی شق خاص کا کبھی دعویٰ نہ کیا۔

(ازالہ اوہام روحانی خزائن جلد۳ صفحہ ۳۱۰)

پیشگوئیوں کے جو اصول حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بیان فرمائے ہیں اب ان کی روشنی میں آپ کے ان الہامات و کشوف پر ایک نظر ڈالیں جو حضرت مرزا شریف احمد رضی اللہ عنہ کے بارہ میں ہیں۔(یہ مضمون تفصیل کا متقاضی ہے کہ کس طرح مندرجہ ذیل پیشگوئیاں جزوی طور پر خود آپ کی ذات میں پوری ہوئیں۔پھر آپ کے صاحبزادے حضرت مرزا منصور احمد مرحوم و مغفور کی ذات میں پوری ہوئیں اور ایک بار پھر بڑی شان سے آپ کے پوتے حضرت مرزا مسرور احمد اطال اللہ عمرہ وایدہ بروح القدس کی ذات میں پوری ہو رہی ہیں)۔

(۱) جنوری ۱۹۰۷ء رؤیا:

''شریف احمد کو خواب میں دیکھا کہ اس نے پگڑی باندھی ہوئی ہے اور دو آدمی پاس کھڑے ہیں۔ایک نے شریف احمد کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ بادشاہ آیا۔دوسرے نے کہا ابھی تو اس نے قاضی بننا ہے۔فرمایا: قاضی حکم کو بھی کہتے ہیں۔قاضی وہ ہے جو تائید حق کرے اور باطل کو رد کرے۔''

(تذکرہ صفحہ ۶۹۱)

(۲)۲۸مئی ۱۹۰۷ء :''شریف احمد کی نسبت اس کی بیماری میں الہامات ہوئے۔ عَمَّرَہُ اللّٰہُ عَلٰی خِلَافِ التَّوَقُّعِ .اَمَّرَہُ اللّٰہُ عَلٰی خِلَافِ التَّوَقُّعِ. اَءَنْتَ لَا تَعْرِفِیْنَ الْقَدِیْرَ .مُرَادُکَ حَاصِلٌ .اَللّٰہُ خَیْرٌ حَافِظًا وَّھُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْن (تذکرہ صفحہ ۷۲۰تا۷۲۱)

(۳)۱۹۰۳ء :''چند سال ہوئے ایک دفعہ ہم نے عالم کشف میں اسی لڑکے شریف احمد کے متعلق کہا تھا کہ :''اب تو ہماری جگہ بیٹھ اور ہم چلتے ہیں۔'' (تذکرہ صفحہ ۴۸۷)

ان پیشگوئیوں میں حضرت مرزا شریف احمد صاحب کی نسل میں ایک وجود کے پیدا ہونے کی خبر ملتی ہے جس کے سر پر خلافت کی پگڑی رکھی جائے گی۔ وہ روحانی بادشاہ ہوگا اور اس کو روحانی سلطنت عطا کی جائے گی اور اس مقام پر پہنچنے سے پہلے اس کو ایسی خدمت دین کی توفیق دی جائے گی جس سے حق کی تائید اور باطل کا رد ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اُسے توقع کے خلاف عمر دے گا اور بغیر کسی توقع یا امید کے مومنوں کا امیر بنا دے گا۔ یہ قدیر خدا کے کام ہیں جو چاہے وہ کرے۔ اور اس کے ذریعہ حضرت مسیح موعودؑ کی مراد یعنی غلبۂ اسلام حاصل ہوگا۔ اللہ اس کا حافظ ہوگا اور اس کی رحمت کا سایہ اس کے سر پر ہوگا۔ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی جگہ بیٹھے گا یعنی خلیفۃ المسیح ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب ۔ ہماری خواہش اور عاجزانہ دعا ہے کہ یہ ساری پیشگوئیاں پوری شان کے ساتھ حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ کی ذات میں پوری ہوں۔ آمین

(الفضل انٹرنیشنل 23.5.03)

کم کھانے سے عمر لمبی ہوتی ہے اور انسان کئی بیماریوں سے بچتا ہے

حال ہی میں ایک دلچسپ سائینسی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ دودھ پلانے والے جانوروں پر کم خوری کے کیا اثرات ہوتے ہیں ان کا پہلی بار جائزہ لیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کم خوری اور غذا میں حراروں (Calories) کو کم کرنے سے ان کی عمریں ۳۰ فیصد تک بڑھ گئی ہیں ۔ یہ تجربات بالٹی مورامریکہ کے National Institute on Aging نے ۲۰۰ بندروں پر کئے ہیں جو Rhesus اور Squirrel اقسام سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر جارج راتھ (Dr.George Roth) جو ریسرچ ٹیم کے لیڈر تھے کہتے ہیں کہ اگر ہمیں یہ پتہ چل جائے کہ کم خوری بڑھاپے کے عمل کو کس طرح روکتی ہے تو اس پر عمل کر کے انسانوں کی عمروں میں ۲۰ تا ۳۰ سال کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف ایک اور زاویے سے بھی تحقیق کر رہے ہیں۔ وہ اس فکر میں ہیں کہ انہیں یہ پتہ چل جائے کہ جسم کا وہ نظام کو جو کم خوری کے نتیجہ میں طوالت عمر پر خوشگوار اثر پیدا کرتا ہے وہ کیسے کام کرتا ہے۔ اگر یہ راز کھل جائے تو کوئی دوا ایسی ایجاد کی جا سکتی ہے جو اس نظام کو اس طرح کا دھوکہ دے کہ گویا ہم جسم کو کم حرارے مہیا کر رہے ہیں اور پھر جو ہم چاہیں کھاتے پیتے رہیں۔ گویا رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

سڈنی یونیورسٹی کے شعبہ غذا کے پروفیسر سٹوارٹ کو جب اس خبر پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ تحقیق یقیناً دلچسپ ہے۔ لیکن جب میں کھانے کی میز پر بیٹھا ہوں اور مزید کھانا چاہتا ہوں تو یہ

ریسرچ میرا ہاتھ نہیں روک سکتی کہ میں اپنی معمول کی خوراک کم کردوں۔ گویا غالب کا سا حال ہے کہ

؎ جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مذکورہ بالا تجربات تو بندروں پر کیئے گئے تھے لیکن قبل ازیں یہ تجربات چوہوں اور کیڑوں مکوڑوں پر کیئے گئے تھے اور ان سے بھی ایسے ہی نتائج حاصل ہوئے تھے۔ انسانوں پر ایسے تجربات ابھی نہیں کیئے گئے لیکن تجربہ یہی بتاتا ہے کہ جو انسان ضرورت سے زائد کھانا نہیں کھاتے یا کم کر کے حقیقی ضرورت کی سطح پر لے آئے ان کا بلڈ پریشر کم ہوا۔ اچھا کولیسٹرل HDL بڑھا اور برا کولیسٹرل گھٹا جس سے دل کے امراض میں کمی ہوئی اور کینسر ہونے کا امکان بھی کم ہوا۔ لیکن یہ ہوتا کیسے ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ اس کا تعلق Metabolism سے ہے۔ یعنی غذا میں حراروں (Calories) کو کم کرنے سے جسم کا وہ کیمیائی عمل جو غذا کو قوت میں تبدیل کرتا ہے۔ فاضل مواد کو خارج کرتا ہے اور جسم کی نشو ونما کرتا ہے وہ کم حرارے ملنے پر اپنا رخ افزائش (Growth and Development) سے موڑ کر بقا (Survival) کی طرف کر لیتا ہے۔ نیز بڑھاپے کا عمل زنگ لگنے کے عمل سے مشابہ ہے۔ جسم کے ایسے ایٹم یا ان کا گروپ جو ہمارے سانس کی آکسیجن سے مل کر (زنگ کی طرح) Oxidise ہوتے ہیں ان کو Free Radicals کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جسم جتنا زیادہ غذا حاصل کرتا ہے اتنے ہی زیادہ جسم میں Free Radicals بنتے ہیں اور اس عمل تکسید (Oxidation) سے بڑھاپا آتا ہے۔ طاقتوں کو زوال آتا ہے اور جسم پر جھریاں پڑتی ہیں۔ بازار میں اس عمل کو روکنے کے لئے Anti Oxidant وٹامنز وغیرہ کی جو بھرمار ہے اس کے پیچھے یہی سوچ کارفرما ہے۔ حقیقت کیا ہے وہ تو ماہرین ہی جانیں۔

محققین کہتے ہیں غالباً Metabolism انسانی گاڑی کے گیئر کو جو 'نشو ونما' پر ہوتا ہے جب اسے کم حرارے ملتے ہیں تو ''بقا'' پر لے آتا ہے جس سے توڑ پھوڑ کم ہو کر عمر لمبی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اپنی گاڑی کو بلاوجہ ادھر ادھر نہ بھگائے پھریں۔ ضرورت کے مطابق احتیاط سے چلائیں تو گاڑی زیادہ عرصہ چلے گی۔

اخباری نمائندے نے ڈاکٹر راتھ سے سوال کیا۔ کہ چلو مان لیا کہ جن جانوروں پر آپ نے

تجربے کئے ہیں وہ غذا کی کمی (Malnutrition) کا شکار نہیں ہوئے بلکہ تندرست ہی رہے لیکن کیا بھوک کی وجہ سے ان کو ہر وقت کھانے کی اشتہاء نہیں لگی رہتی تھی اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ تھوڑا بہت بھوکے تو وہ ضرور رہتے ہونگے لیکن بھوکا رہنا بری بات نہیں۔ کئی تہذیبوں میں یہ بات عام کہی جاتی ہے کہ جب تمہارا پیٹ اسی فیصد (۸۰%) بھر جائے تو دستر خوان سے اٹھ کھڑے ہوا گرچہ کچھ اور بھی کھا سکتے ہو۔

بھوک رکھ کر کھانے کی تحقیق ہمارے لئے نئی نہیں۔ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خاندان نے کبھی جو کی روٹی دو دن مسلسل پیٹ بھر کر نہ کھائی یہاں تک کہ آپ وفات پا گئے۔

(بخاری و مسلم۔ از ریاض الصالحین روایت نمبر ۴۹۴)

نیز حضرت مقداد بن معدی کرب روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو فرماتے سنا کہ ''کوئی آدمی اپنے کسی برتن کو بھی اس بری طرح نہیں بھرتا جس طرح اپنے پیٹ کو بھرتا ہے۔ وہ چند لقمے جو انسان کی کمر کو سیدھا رکھ سکیں وہ اس کے لئے کافی ہیں لیکن اگر اس نے ضرور ہی زیادہ کھانا ہے تو اسے چاہئے کہ پیٹ کے تیسرے حصے کو کھانے سے اور تیسرے حصے کو پانی سے بھرے اور بقیہ تیسرے حصے کو آسانی سے سانس لینے کے لئے فارغ رکھے۔''

(ترمذی روایت ۵۱۹ ایضاً)

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا دو کا کھانا تین کیلئے کافی ہوتا ہے اور تین کا کھانا چار کے لئے کافی ہوتا ہے۔

(بخاری مسلم روایت ۵۶۸ ایضاً)

اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کا پیٹ جب کھانے پانی سے ستر پچھتر فیصد پُر ہو جائے تو وہ اس کے لئے کافی ہوتا ہے کیونکہ دو کا کھانا جب تین کھائیں گے تو ہر ایک کا پیٹ تقریباً ستر فیصد پر ہو جائے گا اور جب تین کا چار کھائیں گے تو ہر کھانے والے کا پیٹ پچھتر فیصد پر ہوگا اور پچیس فیصد خالی۔ یہ بات محققین کے لئے یقیناً دلچسپی اور حیرت کا باعث ہوگی کہ جو کچھ انہوں نے تجربات سے معلوم کیا ہے وہ ہمارے حکیم اعظم ﷺ پہلے ہی فرما چکے ہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 10.10.97)

عقیقہ کی حکمت

بچہ کی پیدائش پر خوشی ایک فطرتی بات ہے اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اس خوشی کے اظہار کے لئے بھی ایسی ہدایات دیں جس میں بچہ اور اس کے والدین کی خدا اور نیکی کی طرف توجہ پھرے، خدا کا شکر ادا ہو۔ جب کہ دنیا دار لوگ اس موقعہ پر راگ رنگ اور ناچ کی محفلیں سجاتے ہیں جو کہ کسی طرح بھی جائز نہیں ۔عرب اسلام سے پہلے بھی بچہ کی پیدائش پر جانور ذبح کیا کرتے تھے۔ جس کو ایک پاکیزہ رنگ دے کر قائم رکھا گیا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:۔

’’بچہ جب سات روز کا ہو جائے تو اس کا نام رکھا جائے اس کے بال منڈوائے جائیں اور قربانی دی جائے‘‘ (ابن ماجہ) ۔حدیث میں آتا ہے کہ جب آپ کے نواسے حضرت حسنؓ پیدا ہوئے تو آپ کا عقیقہ کیا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ’’جانور کی ایک ران دائی کو بھیج دو اور باقی خود کھاؤ اور دوسروں کو کھلاؤ۔‘‘ (سنن ابوداؤد)

ابن ماجہ باب العقیقہ کے حوالہ سے فقہ احمدیہ میں لکھا ہے:۔ ’’بچہ کی پیدائش پر ساتویں روز سر کے بال اتروانا اور ان بالوں کے برابر چاندی یا سونا بطور صدقہ دینا، نام رکھنا اور عقیقہ کرنا مسنون ہے۔......عقیقہ سے مراد جانور کا ذبح کرنا ہے ۔لڑکے کی صورت میں دو بکرے یا دنبے ۔لڑکی کی صورت میں ایک بکرا یا دنبہ ذبح کرنا چاہئے....عقیقہ کا گوشت انسان خود بھی کھا سکتا اور دوست احباب رشتہ داروں کو بھی دے سکتا ہے۔ پکا کر دعوت بھی کر سکتا ہے۔غریبوں کو بھی اس میں سے حصہ دینا چاہئے۔اگر بامر مجبوری دو جانور ذبح نہ کر سکے تو ایک پر بھی کفایت کر سکتا ہے۔‘‘

(فقہ احمدیہ ’عبادات‘ صفحہ ۱۸۳)

لفظ عقیقہ کا مادہ عَقّ ہے جس کے معنے ہیں اس نے آزاد کیا۔ اس نے ذبح کیا۔ اس نے کاٹا بچہ کی ولادت کا وقت بچہ اور اس کی ماں دونوں کے لئے نازک اور خطرات سے پر ہوتا ہے۔ بچہ کی بخیر و عافیت پیدائش پر خوش ہونا اور خدا کے فضل اور عطا پر اس کا شکر ادا کرنا فطرتی بات ہے۔ بچہ ایک طرف بطن مادر سے آزاد ہوتا ہے دوسری طرف ہر بچہ آزاد اور معصوم پیدا ہوتا ہے۔ اس پر ساتویں روز شکرانے کے طور پر جانور ذبح کرنا خود کھانا اور رشتہ داروں دوستوں کو کھلانا اور بالخصوص غریبوں کو گوشت میں سے حصہ دینا عقیقہ کہلاتا ہے۔ پیدائش کی خوشی میں مٹھائی تقسیم کرنا منع نہیں لیکن اس کو عقیقہ کا بدل بنا لینا جائز نہیں۔ کئی لوگ مٹھائی پر تو اتنا زور دیتے ہیں کہ گویا فرض ہے اور عقیقہ کو بالکل بھول جاتے ہیں یہ مناسب نہیں۔ خدا اور رسول کے احکام کو اولیت دینی چاہئے۔

بہت سے مذاہب میں بالوں کو منڈوانا اپنے آپ کو خدا کے لئے وقف کر دینے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ نوزائیدہ بچہ کے بال منڈوانے سے بھی یہی مراد ہے کہ اے خدا ہم اس بچہ کو تیری غلامی میں دیتے ہیں۔ اسے ساری عمر اپنا بندہ (غلام) ہی بنائے رکھنا یہ شیطان یا اپنی خواہشات کا غلام نہ بنے۔ تیرا اور تیرے رسولؐ کا غلام بنے۔ وقف کی اہمیت لڑکے کے لئے بنسبت لڑکی کے زیادہ ہے کیونکہ لڑکے آزادی کے ساتھ تمام خدمات بجالا سکتے ہیں۔ نیز لڑکے پر بیوی بچوں اور خاندان کی کفالت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اور جتنا کسی پر بوجھ ہوا تنا ہی اس کے گرنے کا امکان ہوتا ہے۔ اس دوسری ذمہ داری کے پیش نظر لڑکے کی طرف سے دو جانور ذبح کئے جاتے ہیں اور لڑکی کی طرف سے ایک۔ لیکن حالات کے پیش نظر یہ بھی جائز ہے کہ لڑکے اور لڑکی دونوں کی طرف سے ایک ایک جانور ہی ذبح کیا جائے اگر کوئی ایسی مجبوری ہو کہ ساتویں روز عقیقہ نہ ہو سکے تو بعد میں جب توفیق ملے کیا جا سکتا ہے۔ انسان اپنا عقیقہ خود بھی کر سکتا ہے۔

عقیقہ کے ساتھ بالوں کے وزن کے برابر حسب استطاعت چاندی اور سونے کا صدقہ بھی کرنا چاہئے بچہ کی پیدائش پر یہ صدقہ دینا نہیں بھولنا چاہیئے۔ لڑکے کی صورت میں یہ بھی مناسب ہے کہ ساتویں روز اس کا ختنہ بھی عقیقہ کے ساتھ ہی کر دیا جائے۔ ختنہ بھی اس عہد کا نشان ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے انبیاء اور بالخصوص آنحضرت ﷺ کے ساتھ خدا نے کیا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تم میری باتوں کو ماننا میں تمہاری دعاؤں کو سنوں گا اور تم پر دین و دنیا میں

فضل فرماؤں گا۔ خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور اموال جنت کے بدلہ میں خرید لی ہیں۔ ختنہ جس عہد کا (جو بندے اور خدا کے درمیان ہے) ظاہری نشان ہے اس کا بائبل میں بھی ذکر ہے اور قرآن میں بھی۔ پس ختنہ کرواتے وقت اس عہد کو بھی یاد کرنا چاہئے اور بعد میں بھی والدین اور بچوں کو اسے دہراتے رہنا چاہئے۔

بعض لوگ بالوں کو ساتویں روز منڈوانا (اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو بھی) اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ بال منڈوانے وقف کرنے کی علامت ہے اور ہر کام جو سنت نبویؐ کی پیروی کی نیت سے کیا جائے اس کا ثواب ہوتا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 18.4.03)

ذوق وشوق کی ترقی میں دماغ کا حصہ

سان ڈیاگو کے محکمہ صحت کے ایک حالیہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ ہر وہ کام جو انسان ذوق وشوق سے کرتا ہے وہ انسانی دماغ پر ایک نقش پیدا کرتا ہے یعنی اس کے کام سے متعلقہ حصہ کے خلیات (Brain cells) پر بجلی کی طرح کے کنکشن یا سرکٹ بن جاتے ہیں۔ایک ہی کام بار بار کرنے سے وہ نقش گہرے اور پختہ ہوتے جاتے ہیں۔لیکن اگر وہ کام کرنے چھوڑ دیئے جائیں تو وہ نقوش مدھم پڑتے پڑتے بے اثر ہو جاتے ہیں۔تجربہ میں دیکھا گیا کہ جب انسان کے سامنے ایسی چیز آتی ہے جس سے ان کاموں کی یادیں وابستہ ہوں۔تو متعلقہ سرکٹ روشن اور فعال ہو کر اسی قسم کا احساس ذہن میں پیدا کر دیتے ہیں۔دماغ میں ایک حصہ روحانی امور کے لئے بھی ہے جسے G-Spot کا نام دیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تجربہ ایک سکول کے تیس طلباء پر MRI کی مدد سے کیا گیا جس کے ذریعہ دماغ کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ کام کے دوران اس کا کونسا حصہ سرگرم عمل ہوتا ہے۔ان لڑکوں میں سے آدھی تعداد ان کی تھی جو شراب پینے کے عادی تھے اور دوسرے وہ تھے جنہوں نے کبھی ایک آدھ بار کے سوا شراب نہ پی تھی۔ان سب لڑکوں کو شراب کی مختلف قسموں کے اشتہار دکھائے گئے۔شرابیوں کے ذہن اشتہار کے دیکھتے ہی یوں روشن اور بیدار ہو گئے جس طرح گوشت دیکھ کر بلی کے منہ میں پانی آ جاتا ہے جب کہ دوسروں پر ان نظاروں کا کوئی اثر نہ تھا۔ان کا وہی حال تھا جیسے گائے بکری کے سامنے گوشت پڑا ہوا ہو۔اس تجربہ سے کئی دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں جن پر غور کر کے انسان خود اپنی اصلاح کے سلسلہ میں فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

دماغوں کے فعل کا مشاہدہ جس طریق سے کیا گیا اس کو MRI یعنی Magnetic Resonance Imaging کہا جاتا ہے۔انسان جب کچھ سوچتا ہے، محسوس کرتا یا کام کرتا ہے تو دماغ (Brain) کا جو خاص حصہ کام کرتا ہے وہ اس طریق سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ہر کام کے لئے دماغ کا ایک مخصوص حصہ فعال ہوتا ہے جس طرح زبان کے حصے کڑوے، میٹھے اور کھٹے مزوں کے لئے مخصوص ہیں۔انسانی دماغ میں تقریباً ایک سو ارب خلیات (Brain Cells) ہوتے ہیں۔ جتنے پیدائش پر خدائے رحمٰن کی طرف سے عطا ہوتے ہیں عمر بھر تقریباً اتنے ہی رہتے ہیں ان میں اضافہ نہیں ہوتا ہے۔ پیدائش سے لے کر عمر بھر انسان جو کچھ سوچتا ہے محسوس کرتا یا کام کرتا ہے اس سے ان خلیات میں باہم کنکشن یا سرکٹ بنتے رہتے ہیں۔ جتنا زیادہ کوئی دماغ سے کام لیتا ہے اتنے ہی دماغ میں کنکشن بنتے جاتے ہیں اور انسان ان معاملات میں ذہین ہوتا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کوئی انسان اپنے دماغ کا پانچ فیصد استعمال کرتا ہے کوئی دس فیصد اور ۱۵ فیصد تک استعمال کرنے والے خوش قسمت انسان تو بہت ہی تھوڑے ہوتے ہیں۔انسان کے آباؤ اجداد کی جو کھوپڑیاں ملی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ ۳۰ ہزار سال میں انسانی دماغ کی ساخت یا اس کے خلیات کی تعداد میں کوئی فرق نہیں پڑا جوں کا توں ہی رہا ہے۔

اس تجربہ کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ کھانے پینے اور مختلف کاموں کے مزے انسان کے اندر ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ باہر سے صرف تحریک (Stimulation) ہی ہوتی ہے اور مزا اور ذوق پیدا کرنے اور بڑھانے میں انسان کی اپنی سوچ کا بھی خاصہ دخل ہوتا ہے۔ جو شرابی لڑکے شراب میں مزا لیتے تھے ان کے دماغ بھی اسی طرح کے ہو گئے تھے اور شراب کا محض تصور بھی ان کے ذوق کے لئے مہمیز کا کام دیتا تھا۔ وہی کھانے جو صحت کی حالت میں مزا دیتے ہیں بیماری کی حالت میں بدمزہ اور کڑوے لگتے ہیں۔اگرچہ یہ تجربہ صرف شراب کی مختلف اقسام کا تصور پیدا کر کے کیا گیا ہے لیکن اگر یہ دوسری دنیاوی لذات پر کیا جاتا تو بھی ویسے ہی نتائج برآمد ہوتے۔ لہذا جو مزہ اور ذوق حاصل کرنا چاہتا ہے وہ پالیتا ہے اور جو توجہ نہیں کرتا وہ نہیں پاتا۔

یہ اصول صرف مادی لذات پر لاگو نہیں ہوتا روحانی امور میں بھی لذت اسی کو ملتی ہے جو شعوری طور پر محنت سے اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دعاؤں اور نمازوں کا مزہ بھی پیدا کرنا پڑتا ہے اسی

طرح جس طرح مادی کھانوں کا مزہ (Taste) پیدا کیا جاتا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ایک بار ذکر فرمایا کہ افریقہ کے دورہ کے دوران ایک لذیذ میٹھی ڈش آپ نے بنوائی اور افریقن دوستوں کو پیش کی تو وہ ایک لقمہ لے کر ہی ہٹ گئے۔ حضور کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ حضور ہم چونکہ میٹھی ڈش نہیں کھاتے اس لئے ہم کو مزہ نہیں آتا۔ اب پتہ نہیں وہ ڈش کتنی لذیذ ہوگی لیکن جس نے کبھی وہ کھائی ہی نہیں اس کو کیا مزہ آتا اسی طرح نماز کا مزہ بھی متواتر کوشش اور دعا سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں:

''یادرکھو انسان کے اندر ایک بڑا چشمہ لذت کا ہے۔ جب کوئی گناہ اس سے سرزد ہوتا ہے تو وہ چشمہ لذت مکدر ہو جاتا ہے اور پھر لذت نہیں رہتی۔ مثلاً جب ناحق گالی دیتا ہے یا ادنیٰ ادنیٰ سی بات پر بدمزاج ہو کر بدزبانی کرتا ہے تو پھر ذوق نماز جاتا رہتا ہے۔ اخلاقی قویٰ کو لذت میں بہت بڑا دخل ہے جب انسانی قویٰ میں فرق آئے گا تو اس کے ساتھ ہی لذت میں بھی فرق آجاوے گا۔ پس جب کبھی ایسی حالت ہو کہ انس اور ذوق جو نماز میں آتا تھا وہ جاتا رہا ہے تو چاہیئے کہ تھک نہ جاوے اور بے حوصلہ ہو کر ہمت نہ ہارے بلکہ بڑی مستعدی کے ساتھ اس گمشدہ متاع کو حاصل کرنے کی فکر کرے۔ اور اس کا علاج ہے توبہ استغفار۔ تضرع۔ بے ذوقی سے ترک نماز نہ کرے بلکہ نماز کی اور کثرت کرے جیسے ایک نشہ باز کو جب نشہ نہیں آتا تو وہ نشہ کو چھوڑ نہیں دیتا بلکہ جام پر جام پیتا جاتا ہے یہاں تک کہ آخر اس کو لذت اور سرور آجاتا ہے۔ پس جس کو نماز میں بے ذوقی پیدا ہو اس کو کثرت کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیئے اور تھکنا مناسب نہیں۔ آخر اسی بے ذوقی میں ایک ذوق پیدا ہو جاوے گا۔ دیکھو پانی کے لئے کس قدر زمین کو کھودنا پڑتا ہے۔ جب لوگ تھک جاتے ہیں وہ محروم رہ جاتے ہیں۔ جو تھکتے نہیں وہ آخر نکال ہی لیتے ہیں۔ اس لئے اس ذوق کو حاصل کرنے کے لئے استغفار، کثرت نماز و دعا، مستعدی اور صبر کی ضرورت ہے۔''

(ملفوظات جلد پنجم صفحہ ۴۳۱۔۴۳۲)

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا مزا ہمیں عبادات، خدمت دین اور حقوق العباد کی ادائیگی میں اس زندگی میں ملتا ہے ویسا ہی مزا ان پھلوں کا ہوگا جو ہمیں حیات اخروی میں ان اعمال کے بدلہ میں ملیں گے جب کہ ہمارے اعمال پھلوں کی صورت میں متمثل ہوں گے۔ حضرت مصلح موعودؓ تفسیر کبیر جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۱ پر سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

> ’’کیونکہ جیسی ہماری نماز اور جیسا ہمارا روزہ ہوگا اسی قسم کے مزہ کا وہ پھل ہوگا جو ہمیں جنت میں ملے گا۔ اگر ہم اپنے اعمال کو پوری دلجمعی اور شوق سے بجا نہیں لاتے تو ہم اپنی روحانی غذا کو جو ہمیں جنت میں ملنے والی ہے دوسروں سے کم لذیذ بناتے ہیں۔‘‘

(الفضل انٹرنیشنل 29.8.03)

تین کروڑ سال سے خوابیدہ جراثیم حیات نو پا گئے

ایک خبر کے مطابق تیس ملین سالوں سے خوابیدہ (Dormant) چلے آنے والے جراثیم سائنس دانوں کی کوشش سے نئی زندگی پا گئے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ میکسیکو اور ڈومی نیکن ریپبلک (Maxico and Dominican Republic) میں کھدائی کے دوران بعض چٹانوں میں عنبر (Amber) کے درخت دبے پڑے ملے ہیں ان چٹانوں کی عمر پچیس تا چالیس ملین سال خیال کی جاتی ہے۔ سائنس دانوں نے عنبر کے ٹکڑے ان چٹانوں سے چن کر باہر نکال لئے۔ ان کے نزدیک وہ ہیرے جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی تھے کیونکہ ان کے اندر کیڑے، مکوڑے، مینڈک اور دوسرا حیاتیاتی مادہ منجمد اور محفوظ حالت میں مل جاتا ہے جن کے معائنہ سے اس عرصے کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ جب وہ زمین پر رہا کرتے تھے۔ یہ جاندار گویا ''ٹائم کیپسول'' ہیں جن کے اندر وقت کا اندازہ بتانے والی گھڑیاں بند ہیں۔ بہر حال انہیں کیڑے مکوڑوں میں کچھ شہد کی مکھیاں بھی خوابیدہ اور بظاہر مردہ حالت میں ملیں۔ ان مکھیوں کے پیٹ جب کھولے گئے تو ان کے اندر کچھ جراثیم بھی منجمد اور نیم خوابیدہ حالت میں پڑے مل گئے۔ یہ حیران کن امر تھا کیونکہ نامیاتی جسموں (Living Organisms) کے لئے زندگی برقرار رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بھوک پیاس، گرمی سردی، کیمیائی اشیاء اور اینزائم (Enzymes) کے حملے دوسرے جراثیم کے حملے۔ پھر آکسیجن کے ساتھ مل کر نئے مرکبات کی تشکیل اور توڑ پھوڑ ان کے اجسام کو قائم نہیں رہنے دیتے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جراثیم میں قائم رہنے کی بعض مخفی صلاحیتیں بھی ودیعت کی ہوتی ہیں۔ یعنی یہ کہ مخالف حالات میں وہ اپنے آپ کو پروٹین کی موٹی تہوں کے نیچے چھپا لیتے ہیں اور اپنا Matabolism بند کر دیتے

ہیں۔یعنی جسم کے اندر جو کیمیاوی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں جن سے زندگی قائم رہتی ہے وہ عمل معطل کردیتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک طرح سے نباتاتی تخمک (spores) بن جاتے ہیں اوراس طرح خشکی، گرمی، سردی وغیرہ کے اثرات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں اوراس خوابیدہ (Dormant) حالت میں ایک لمبا عرصہ اپنی زندگی کا بیج برقرار رکھ سکتے ہیں۔سائنس دان پہلے بھی اس طرح کی Spores کو تری بہم پہنچا کر یعنی Rehydrate کر کے اور Culture کر کے صدیوں سے خوابیدہ جراثیم کو از سرنو زندہ کر چکے ہیں۔لیکن یہ بات کہ خوابیدہ رہنے کا عرصہ کروڑوں سالوں پر بھی محیط ہوسکتا ہے اس کا انہیں پہلے علم نہ تھا بلکہ اب بھی اکثروں کا اس میں شبہ ہے لیکن کیلی فورنیا پالی ٹیکنیک سٹیٹ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر رال کانو (Dr. Raul Cano) کا تجربہ بتاتا ہے کہ ایسا ممکن ہے اورانہوں نے چٹان میں سے عنبر کے ٹکڑے نکال کر اس میں سے منجمد شہد کی مکھی حاصل کر کے اوراس کے پیٹ میں سے خوابیدہ جراثیم نکال کر انہیں پانی، غذا مناسب ماحول کی مدد سے از سرنو زندہ کردیا ہے اور زندگی جو بیج کی صورت میں اپنی خواب گاہ میں سوئی پڑی تھی وہ حیات نو پا گئی ہے۔چونکہ اتنے پرانے جراثیم جو کروڑوں سال کے ارتقائی دور سے پہلے کے ہیں دنیا کی صحت کے لئے خطرہ بھی پیدا کر سکتے ہیں لہذا انہیں بڑی حفاظت سے لیبارٹری میں بند رکھا ہوا ہے۔اب ان نشاۃ ثانیہ پانے والے جراثیم سے نئی جراثیم کش (Antibiotic) ادویہ تیار کی جائیں گی۔ڈاکٹر کانو کا اس سلسلہ میں ایک دوائیں تیار کرنے والی کمپنی سے معاہدہ بھی ہوگیا ہے۔نئی ادویہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ پرانی اینٹی بائیوٹک ادویہ بوجہ کثرت استعمال تدریجاً غیر مؤثر ہو رہی ہیں کیونکہ جراثیم نے اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کر کے ان ادویہ کے دفاع کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے ۔ڈاکٹروں اور مریضوں کے لئے یہ امر تشویش پیدا کر رہا ہے۔

مومن کو اللہ تعالیٰ کے کاموں پر غور وفکر کرنے کا حکم ہے کہ یہ علم ومعرفت میں ترقی کا ذریعہ ہے۔قرآن نے برزخ یا قبر کو مرقد یعنی سونے کی جگہ بھی کہا ہے جیسے فرمایا ’’وہ کہیں گے ہم پر افسوس کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اٹھا دیا‘‘ (یٰسٓ:۵۳) اور مرقد سے حشر اسی رنگ میں ہوگا جس طرح نباتات کو خوابیدہ (Dormant) زندگی پانی سے حیات نو پاتی ہے۔جیسے فرمایا ’’......اور ہم اس (پانی) کے ذریعہ سے مردہ ملک کو زندہ کرتے ہیں اسی طرح مرنے کے بعد نکلنا بھی ہوگا‘‘ (الزخرف:۱۲) نیز

فرمایا ''اللہ وہ ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے جو بادل کو اٹھاتی ہیں۔ پھر ہم اس کو ایک مردہ ملک کی طرف ہانک کر لے جاتے ہیں اوراس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی ویرانی کے بعد آباد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح موت کے بعد اٹھنے کا قانون مقرر ہے'' (فاطر:۱۰)

(الفضل انٹرنیشنل)

امریکہ کی سرزمین پر ہونے والے جرائم نسلی جنگ کا رنگ اختیار کر چکے ہیں

مسٹر پال شی ہن (Mr. Paul Sheehan) امریکہ کے جرائم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امریکہ نے جو سب سے لمبی جنگ لڑی ہے اسے ''گندی جنگ'' یا Dirty War کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ جنگ ہے جو خود امریکی سرزمین پر گزشتہ تیس سال سے لڑی جارہی ہے اور ۲۵ ملین افراد کو اپنا نشانہ بنا چکی ہے۔ اس جنگ میں تقریباً اتنی جانیں ضائع ہو چکی ہیں جتنی ساری ویت نام کی جنگ میں۔ اس گھمبیر صورت حال کے باوجود امریکی میڈیا اس کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ جنگ کالوں گوروں کی ہے اور کالے گوروں سے نئی اور پرانی زیادتیوں کا انتقام لے رہے ہیں۔

امریکہ میں گزشتہ بیس سال میں پر تشدد جرائم آبادی بڑھنے کی رفتار سے چار گنا زیادہ بڑھے ہیں۔ ۱۸ سال سے کم عمر کے کالے نوجوان گزشتہ نسلوں سے زیادہ پر تشدد ہیں اور اپنی عمر کے گوروں کے مقابلہ میں بارہ گنا زیادہ امکان ہے کہ وہ قتل کے جرائم میں ماخوذ ہونگے۔ امریکہ کے محکمہ انصاف کے آخری سروے کے مطابق امریکہ میں ہر سال ۶۶ لاکھ قتل، زنا، ڈاکہ وغیرہ تشدد کے جرائم ہوتے ہیں جن میں سے بیس فیصد یا تیرہ لاکھ واقعات کا تعلق کالے گوروں کے باہمی جھگڑوں سے ہوتا ہے۔ ۹۰ فیصد تختہ مشق بننے والے گورے امریکی ہوتے ہیں۔ صرف ایک سال ۱۹۹۲ء میں ۱۰ لاکھ گورے نشانہ بنے جبکہ اس کے مقابل پر ایک لاکھ بیس ہزار جرائم کا نشانہ کالے بنے۔ گورے کالوں سے تعداد میں سات گنا ہیں لیکن کالے جن سے جرائم سرزد ہوئے وہ گوروں سے ساڑھے سات گنا زیادہ ہے۔

اس لحاظ سے فی کس (Per Capita) جرائم کے مرتکب کالے گوروں کی نسبت پچاس گنا زیادہ ہیں ایک اورادارہ کی رپورٹ کے مطابق جتنے گورے کالوں کوقتل کرتے ہیں کالے ان سے ۱۸ گنا زیادہ قتل کرتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۹۴ء تک کالوں گوروں کے باہمی جھگڑوں میں ۴۵،۰۰۰ آدمی قتل ہوئے جب کہ ویت نام کی جنگ میں ۵۸،۰۰۰ امریکی مارے گئے تھےاور جنگ کوریا میں ۳۴،۰۰۰ مارے گئے تھے۔ ویسے کالوں کا یہ کہنا ہے کہ جرائم کی اصل وجہ نسلی منافرت نہیں یا کالوں کا جذبہ انتقام نہیں بلکہ اصل وجہ اقتصادی ہے ۔گوروں کے پاس دولت ہے اورکالوں کے پاس غربت اور یہ اقتصادی ناہمواری جرائم کوجنم دے رہی ہے۔ بہرحال تجزیہ نگار جوبھی وجوہات تلاش کریں دنیا کے وہ ممالک جو اندھادھند امریکہ کی تقلید میں فخر محسوس کرتے ہیں ان کوامریکی سرزمین پر برپا ہونے والی Dirty War سے ضرور سبق حاصل کرنا چاہئے۔

(الفضل انٹرنیشنل)

تیسری دنیا کے افراد میں ذہنی صحت کا بحران

اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کو ایک رپورٹ پیش کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تیسری دنیا میں ذہنی صحت کا معیار تیزی سے گر رہا ہے جس کی وجہ عمر میں زیادتی، غربت اور تشدد وغیرہ ہیں اور یہ امر گروہی جھگڑوں اور عدم استحکام میں اضافہ کا باعث بن رہا ہے اور کئی جسمانی بیماریاں بھی اس سے جنم لے رہی ہیں۔ رپورٹ کے مصنف Dr. Kleinman نے لکھا ہے کہ چونکہ ذہنی بیماریاں ایک وجہ شمار ہوتی ہیں لہذا انہیں چھپایا جاتا ہے۔ اب وقت ہے کہ ان ملکوں کی حکومتیں اور بین الاقوامی تنظیمیں اس طرف توجہ کریں۔

رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ سری لنکا میں خودکشی کا تناسب دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے اور امریکہ سے چار گنا زیادہ ہے۔ خودکشی میں سری لنکا کے بعد ہنگری کا نمبر آتا ہے۔ ملائشیا، بنگلہ دیش اور پاکستان کے بچے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں دو تین گنا زیادہ ذہنی طور پر کمزور یعنی Mentally Retarted ہوتے ہیں۔ مرگی کی بیماری لاطینی امریکہ اور افریقہ میں یورپ اور امریکہ کے مقابلہ میں تین تا پانچ گنا زیادہ ہے۔ اس وقت دنیا میں کوئی چار کروڑ (چالیس ملین) پناہ گزین اور گھروں سے نکالے ہوئے لوگ ہیں۔ سیاسی تشدد نے ان کو کئی قسم کے ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے خطرہ سے دوچار کر رکھا ہے۔ رپورٹ میں سفارش کی گئی ہے کہ سب دنیا مل کر اس کا کچھ چارہ کریں اور ذہنی صحت کے کاموں کو افریقہ، ایشیا، لاطینی امریکہ اور شرق اوسط میں تیز کیا جائے۔ ڈاکٹر بطروس غالی نے سفارشات کو قبول کرتے ہوئے کہا کہ بین الاقوامی اداروں کو نفسیاتی وسماجی بے قاعدگیوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے جوان ملکوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہی ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل)

زار روس کی تدفین خدا کی ایک تقدیر کے ظہور کا اعلان ہے

مملکت روس کا شہنشاہ زار روس ۱۹۱۸ء میں بالشویکوں کے ہاتھوں مع اپنے خاندان کے قتل ہوا اور اس طرح انقلاب روس کی وہ پیشگوئی پوری ہوئی جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی تھی کہ

زار بھی ہوگا تو ہوگا اس گھڑی با حال زار

جن حالات میں وہ قتل ہوا وہ بہت دردناک تھے اور اس کا حال زار تاریخ کے صفحات میں رقم ہو چکا ہے۔ کمیونزم کا انقلاب مذہب اور خدا کے خلاف ایک ایسی منظّم بغاوت تھی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

اب گزشتہ ماہ اسی سال کے بعد زار روس کی ہڈیاں اکٹھی کر کے عیسائی طریق پر جنازہ پڑھ کر شاہی اعزاز کے ساتھ دفن کی گئیں ۔ یہ گویا اس کمیونسٹ نظام کے خاتمہ کا اعلان تھا جس کے ہاتھوں میں زار حال زار کو پہنچا تھا۔ وہ جو مذہب کو زمین سے اور خدا کو آسمان سے نکالنے کا عزم لے کر اٹھے تھے وہ خود ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔

چونکہ اس زمانہ میں لوگوں کو خدا اور مذہب اسلام کی طرف بلانے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کھڑے کئے گئے ہیں اس لئے آپؑ کو اور آپؑ کے خلفاء کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کمیونزم کے انقلاب کے اٹھنے اور گرنے کے بارہ میں بھی وقت سے پہلے بتادیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت مرزا

بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ اپنی کتاب Cammunism & Democracy شائع کردہ وکالت تبشیر ربوہ میں فرماتے ہیں۔(انگریزی سے ترجمہ):

''میں امریکہ کے لوگوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ کمیونزم ایک ایسی برائی ہے جس کے بارہ میں بہت پہلے سے انتباہ کیا جاچکا تھا۔ پہلے حزقیل نبی، پھر Book of Revelarions میں یحییٰ کے ذریعہ، پھر نبی کریم ﷺ کے ذریعہ اس کا ذکر قرآن کریم اور احادیث میں ہے۔ ہمارے زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس شر کے خلاف متعدد بار ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۷ء کے درمیان اپنے الہامات کی بناء پر انتباہ فرمایا۔ یہ عمل آپ کے خلیفہ اور پسر موعود یعنی میرے ذریعہ سے جاری ہے۔ ۱۹۰۴ء میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مندرجہ ذیل الہام ہوا۔ :''ایک مشرقی طاقت اور کوریا کی نازک حالت''

(تذکرہ صفحہ ۵۷۸ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۵ء)

یہ پیشگوئی گزشتہ چھیالیس سال سے بار بار اور وسیع طور پر شائع شدہ ہے یہ وضاحت سے بتاتی ہے کہ کوریا ایک نازک خطہ بننے والا ہے اور ایک مشرقی طاقت اس کے معاملات میں الجھے گی۔ یہ ایک معروف بات ہے کہ صدی کے آغاز سے ہی روس کوریا کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتا رہا ہے۔ کوریا میں حالیہ تبدیلیوں کے پیش نظر اس الہام کی اہمیت پر مزید تبصرہ غیر ضروری ہے۔

میں خود اپنی دو رؤیا کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی رویاء میں نے ۱۹۴۳ء کے آغاز میں دیکھی تھی۔ یہ ۱۴/اپریل ۱۹۴۳ء کے الفضل کے صفحہ ۴ پر شائع ہوئی تھی۔ یہ رؤیا واضح طور پر اشارہ کرتی تھی کہ روس کا اثر چین میں پھیل جائے گا۔ یہ وہ وقت تھا جب روس جرمنی کے ہاتھوں سخت دباؤ کا شکار تھا اور چین جاپان کے رحم و کرم پر تھا۔ بعد میں واقعات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ کمیونزم چین میں غالب آ گیا۔

دوسری رؤیا مجھے ۱۹۴۶ء کے وسط کے قریب دکھائی گئی تھی اور بڑی وضاحت سے روزنامہ الفضل میں ۲۳ ؍اگست ۱۹۴۶ء کو شائع ہوئی تھی۔ مختصراً یہ کہ میں نے ایک پہاڑ دیکھا جس میں تین محرابیں تھیں۔ روس درمیانی محراب میں کھڑا تھا۔ امریکہ جنوبی طرف واقع محراب میں اور انگلستان مغربی طرف کی محراب میں۔ لگتا تھا ان کے درمیان کوئی تنازعہ ہوا ہے جس کے دوران امریکہ اور انگلستان روس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔ انگلستان نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس کی مدد کروں۔ چنانچہ میں نے روس پر فائز کئے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تب روس محراب سے باہر نکلا اور دوڑ پڑا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا اور اسے جالیا۔ اس نے میری طرف رخ پھیرا اور کہا کہ تم بے شک مجھ پر فائرنگ کئے جاؤ لیکن ایک وقت مقرر ہے۔ پہلے میں تباہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے اس پر کئی بار فائر کئے اور اگرچہ چھرے اس کے جسم میں غائب ہوتے گئے لیکن اس کو کوئی زخم نہ آیا اور چلا گیا۔

اس تعلق میں میں نے اور بھی کئی رؤیا دیکھے ہیں جو گزشتہ چالیس سال کے دوران چھپتے رہے ہیں۔ وہ ظاہر کرتے ہیں کہ شروع میں روس کے خلاف کچھ بھی کارگر نہ ہوگا لیکن آخر کار میری اور میری جماعت کی دعاؤں کی وجہ سے خدا اسے تباہ کر دے گا۔

ان سب کشوف کا مطلب یہی ہے کہ کمیونزم کی تباہی خدا کے ہاتھوں مقدر ہے لیکن ایسا زمینی اسباب سے نہیں بلکہ روحانی ذرائع سے ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ امریکہ اور مغرب کے لوگ خدا کی آواز پر کان دھریں اور اپنے اندر ایک روحانی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں"۔

(Communism & Democracy by Hazrat Mirza Bashiruddin Mahmood Ahmad P: 1-3)

جب کمیونزم کا نظام گرنے کو آیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے چوتھے جانشین سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کو کشفاً بتایا کہ "Friday the 10th" یعنی

کوئی بہت اہم واقعہ دس تاریخ کو جمعہ کے روز ظہور میں آئے گا۔ چنانچہ جس روز برلن کی دیوار گری اور یورپ میں کمیونزم کا حصار ٹوٹا اس روز انگریزی مہینے کی بھی دس تاریخ تھی اور قمری مہینے کی بھی دس تاریخ تھی اور دن بھی جمعہ کا تھا اور وقت بھی رات دس بجے کا تھا۔ یہ نہایت اہم واقعہ بغیر امریکہ اور برطانیہ کے کسی حملہ کے ہوا اور خدائی تقدیر بعض روحانی ذرائع یعنی برگزیدہ بندوں کی دعاؤں کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی۔ یہ دنیا بہرحال عالم اسباب ہے اس لئے ان دعاؤں نے ایسے اندرونی اور بیرونی حالات پیدا کئے کہ کمیونزم کے بت پر کاری ضرب لگی البتہ اس کے مکمل خاتمہ کے لئے حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں ’’یہ ضروری ہے کہ امریکہ اور مغرب کے لوگ خدا کی آواز پر کان دھریں اور اپنے اندر ایک روحانی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں‘‘ پس ایک خدا کی تقدیر وہ تھی جب روسی قوم نے جس کے سر پر اس وقت کمیونزم کا بھوت سوار تھا اپنے بادشاہ اور اس کے خاندان کو سخت حالت زار میں مبتلا کر کے تہ تیغ کر دیا اور دوسری تقدیر یہ ہے کہ ۸۰ سال بعد وہی قوم اس نظام سے بیزار ہو کر سجدۂ سہو بجالاتی ہوئی بادشاہ کی بچی کھچی ہڈیاں اکٹھی کر کے شاہی اعزاز کے ساتھ دفن کر رہی ہے۔ یہ بالفعل اس نظام کی تباہی کا اعلان ہے جس کی خبر خدا نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور ان کے خلفاء کو قبل از وقت دے دی تھی۔ فالحمدللہ علی ذالک۔

(الفضل انٹرنیشنل 21.8.98)

سگریٹ نوش اور ان کے قریب بیٹھنے والے کئی قسم کے کینسر کا شکار بن سکتے ہیں

پہلے خیال تھا کہ خود سگریٹ پینے یا سگریٹ پینے والوں کے قریب اٹھنے بیٹھنے والوں کو صرف پھیپھڑوں کا کینسر ہوسکتا ہے لیکن اب ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) کے ایک شعبہ کے سائنسدانوں نے ثابت کیا ہے کہ سگریٹ کا دھواں جسم کے اندر جانے سے صرف پھیپھڑے ہی نہیں بلکہ جگر، معدہ، گردے اور لیکومیا کے کینسر ہونے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ سگریٹ نوشوں کے پاس بیٹھنے والوں (سیکنڈ ہنڈ سگریٹ نوشوں) کو کینسر ہونے کا خطرہ بیس تا تیس فیصد بڑھ جاتا ہے۔ دوسروں کے اندر سے خارج کردہ دھوأں Carcinogenic ہوتا ہے یعنی اس میں کینسر پیدا کرنے والا مادہ پایا جاتا ہے۔

سگریٹ پینے کی وجہ سے دنیا بھر میں تیس لاکھ اور اکیلے آسٹریلیا میں ۱۹،۰۰۰ لوگ ہر سال بوجہ کینسر جہان فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ سگریٹ نوش (Active Smokers) اور دوسروں کا اگلا ہوا دھوأں نگلنے والے (Passive Smokers) جو اس بلا سے ۲۰۰۰ء میں آسٹریلیا میں موت کا شکار ہوئے ان میں ۴۴۴ معدہ کے کینسر سے، ۱۹۹ جگر کے کینسر سے، ۸۸ رحم کے کینسر سے ۲۸۹ گردوں کے کینسر سے، ۴۶۵ لیکومیا (خون کے سفید ذرات کی زیادتی) اور تقریباً سترہ ہزار پھیپھڑوں کے کینسر سے جاں بحق ہوئے۔

(الفضل انٹرنیشنل 5.7.2002)

قرب وفات کے لمحات

چین میں ۱۹۷۶ میں Tangshan کے قیام پر ایک سخت زلزلہ آیا جس میں ۲۴۲۰۰۰ انسان لقمہ اجل بن گئے تھے۔ اور ہزاروں ہی شدید زخمی ہوئے تھے۔ ایسے زخمی بھی تھے جو گویا عالم نزع تک پہنچے تھے لیکن بعد میں بچ گئے۔ چینی ماہرین نفسیات اور ڈاکٹروں نے ان کے ایسے وقت کے حالات واحساسات کو بنظر عمیق دیکھا اور ان کو ایک تحقیقاتی رپورٹ کی شکل میں پیش کیا۔ انہوں نے چالیس قسم کے مختلف تجربات ریکارڈ کئے ہیں جس کو وہ مریضوں کے نفسیاتی علاج کی غرض سے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

ان کے تجربات بتاتے ہیں کہ آخری وقت میں اکثر انسان کی آنکھوں میں ایک چمک آجاتی ہے جس طرح شمع بجھ جانے سے پہلے اچانک بھڑک اٹھتی ہے ایسے وقت میں انسانی سوچ اور خیالات واضح ہوجاتے ہیں طبیعت میں سکون اور جذبات میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ بہتوں کی کیفیت ایسے تھی جیسے خواب دیکھ رہے ہوں۔ موت کو سامنے پاکر لوگوں نے مختلف ردعمل کو ظاہر کیا جس کا تعلیم پیشہ اور ازدواجی حیثیت وغیرہ سے بھی تعلق نظر آیا۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ جو لوگ ایسے وقت میں پرسکون، مطمئن اور بے خوف ہوتے ہیں ان پر موت ذرا آہستہ آتی ہے لیکن جو لوگ نفسیاتی دباؤ (Stress) کا شکار ہوتے ہیں وہ اچانک موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں اس لئے انہوں نے ڈاکٹروں اور نرسوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ایسے وقت میں مریض کو حتی الوسع پرسکون رکھنے کی کوشش کریں۔ (سڈنی ہیرلڈ یکم اگست ۹۶ء)

مذکورہ بالا رپورٹ Tianjin کے نفسیاتی امراض کے چیف ریسرچر Mr Geng Zhjying نے تیار کی ہے۔ غالباً وہ خود بھی اور ان کے زیر مشاہدہ مریض بھی کمیونسٹ اور دہریہ ہیں اس لئے انہوں نے اپنی رپورٹ میں اس امر کا جائزہ نہیں لیا کہ قریب وفات کی کیفیات پر مذہب

عقائد اور تعلق باللہ کیا اثر ڈالتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر بالطبع اپنے سب سے زیادہ پیارے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری لمحات کی طرف توجہ پھرتی ہے جن کو ان کے ایک عاشق صادق نے یوں بیان فرمایا ہے:

''جب موت قریب ہو تو اس وقت تو اکثر آدمی اپنے مشاغل کو یاد کر کے افسوس کرتے ہیں کہ اگر اور کچھ دن زندگی ہوتی تو فلاں کام بھی کر لیتے اور فلاں کام بھی کر لیتے۔ جوانی میں اس قدر حرص نہیں ہوتی جس قدر بڑھاپے میں ہو جاتی ہے اور یہی خیال دامنگیر ہو جاتا ہے کہ اب بچوں کے بچے دیکھیں اور پھر ان کی شادیاں دیکھیں اور جب موت قریب آتی ہے تو اور بھی توجہ ہو جاتی ہے۔ اور بہت سے لوگوں کا بستر مرگ دیکھا گیا ہے کہ حسرت و اندوہ کا مظہر اور رنج و غم کا مقام ہوتا ہے اور ''اگر'' اور ''کاش'' کا اعادہ اس کثرت سے کیا جاتا ہے کہ عمر بھر اس کی نظیر نہیں ملتی۔ میرا آقا جہاں اور ہزاروں باتوں میں دوسرے انسانوں سے اعلیٰ اور مختلف ہے وہاں اس بات میں بھی دوسروں سے بالا تر ہے۔ اس میرے سردار کی موت کا واقعہ کوئی معمولی سا واقعہ نہیں۔ کس گمنامی کی حالت سے ترقی پا کر اس نے اس عظیم الشان حالت کو حاصل کیا تھا اور کس طرح خدا تعالیٰ نے اسے ہر دشمن پر فتح دی تھی اور ہر میدان میں غالب کیا تھا۔ ایک بہت بڑی حکومت کا مالک اور بادشاہ تھا اور ہزاروں قسم کے انتظامات اس کے زیر نظر تھے۔ لیکن اپنی وفات کے وقت اسے ان چیزوں میں سے ایک کا بھی خیال نہیں۔ نہ وہ آئندہ کی فکر کرتا ہے نہ تدابیر ملکی کے متعلق وصیت کرتا ہے نہ اپنے رشتہ داروں کے متعلق ہدایت لکھواتا ہے بلکہ اس کی زبان پر اگر کوئی فقرہ جاری ہے تو یہی کہ اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی ۔ اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی ۔ اے میرے اللہ مجھے رفیق اعلیٰ میں جگہ دے۔ اے میرے اللہ مجھے رفیق اعلیٰ میں جگہ دے۔''

(سیرۃ النبیؐ مؤلفہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد المصلح الموعودؓ۔ مطبوعہ فضل عمر فاؤنڈیشن)

(الفضل انٹرنیشنل 11.4.97)

کیا زمین پر زندگی مریخ سے آئی تھی؟

سائنسدان عموماً یہ خیال کرتے ہیں کہ زندگی کا آغاز جن جراثیم سے ہوا وہ زمین میں ہی کہیں گرم پانی کے جوہڑوں کے کیچڑ میں پیدا ہوئے تھے کیونکہ بھوکے جراثیم کے لئے ان میں وافر خوراک موجود تھی لیکن ایک چونکا دینے والا نظریہ حال ہی میں یہ پیش کیا گیا ہے کہ گرم کیچڑ سے بھی پہلے یہ جراثیم نظام شمسی کے سیاروں جیسے زمین۔ مریخ، زہرہ (Venus) عطارد (Mercury) وغیرہ کی چٹانوں کے اندر جنم لے چکے تھے اور شہب ثاقبہ کے اندر شدید گرمی اور دباؤ میں محفوظ رہتے ہوئے بچتے بچاتے زمین کی سطح پر پانی کے جوہڑوں تک پہنچتے تھے آج سے تقریباً ۳ء۸ تا ۴ ارب سال پہلے بڑے بڑے حجم کے سیاروں کے ٹکڑے کثرت سے زمین پر گرا کرتے تھے اس وقت تک نظام شمسی کو کروں کی شکل اختیار کئے ہوئے تقریباً ایک ارب سال گزر چکے تھے یہ نظریہ ایڈلیڈ (آسٹریلیا) یونیورسٹی کے بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہر فلکیات پروفیسر پال ڈیویز نے حال ہی میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نظام شمسی کے مختلف کروں کے درمیان زندگی کا تبادلہ کثرت سے ہوتا رہا ہے اور غالباً اس وقت بھی ہو رہا ہے۔ پرانے ڈی۔ این۔ اے (DNA) جو زمین سے مٹ چکے ہیں وہ ایک دفعہ پھر یہاں پر سر اٹھا سکتے ہیں جن سے زندگی ایک دفعہ پھر نئے سرے سے شروع ہو سکتی ہے یا کئی قسم کے حیران کن اور عظیم نتائج ظہور میں آ سکتے ہیں۔ زمین کے اندر گہرائی میں ایسے سخت جان بیکٹیریا ملے ہیں جو سو درجہ سینٹی گریڈ کے پانی میں بھی خوب نشوونما پاتے ہیں ان کو Archaea کہا جاتا ہے اور یہ گرمی اور دباؤ میں خوش رہتے ہیں اور ہزاروں بلکہ کروڑوں سال تک خوابیدہ حالت (Frozen and Dormant) میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ ان جراثیم میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ

پتھروں کے اندر چھپ کر ہزاروں سال کا سفر کر کے شدید گرمی اور دباؤ کے باوجود زندہ سلامت ایک کرہ سے دوسرے کرہ تک پہنچ جائیں اور یہی بیکٹیریا غالباً ان بیکٹیریا کے آباء واجداد ہونگے جن سے زمین کے گرم جوہڑوں میں زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

(ماخوذ ہیرلڈ ۱۱ مارچ ۱۹۹۶ء ، ۲ جون تا ۴ جولائی ۱۹۹۶ء)

سوچ اور تجربہ کے نتیجہ میں مختلف نظریات وجود میں آتے رہتے ہیں اس لئے اصل حقیقت کو خدا ہی جانتا ہے۔ پروفیسر پال ڈیویز (Paul Davies) کے نظریہ کے دو حصے ہیں ایک تو یہ کہ زمین پر انسان سے پہلے ایک ایسی آنکھوں سے اوجھل مخلوق بستی تھی جو گرم ابلتے پانی میں بھی نہ صرف زندہ رہتی تھی بلکہ خوب نشوونما پاتی تھی ۔ دوسرا حصہ یہ ہے کہ زندگی کا تبادلہ ایک کرہ سے دوسرے کرہ میں کثرت سے ہوتا رہا ہے اور غالباً اب بھی ہو رہا ہے اور اس حقیقت سے عظیم نتائج ظہور میں آسکتے ہیں۔ قرآن کریم اس سلسلہ میں غور وفکر کرنے والوں کی یوں راہنمائی فرماتا ہے۔ ''اور انسان کو ہم نے آواز دینے والی مٹی سے یعنی سیاہ گارے سے جس کی ہیت تبدیل ہوگئی تھی پیدا کیا ہے اور اس سے پہلے جنوں کو ہم نے سخت گرم ہوا کی (قسم کی) آگ سے پیدا کیا تھا'' (الحجر: ۲۸،۲۷) پھر فرمایا ''اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان جانداروں کی قسم سے اس نے پھیلا دیا ہے اس کے نشانوں میں سے ہے اور جب وہ چاہے گا ان سب کے جمع کرنے پر قادر ہوگا'' (الشوریٰ: ۳۰)

(الفضل انٹرنیشنل 28.6.96)

آسٹریلیا میں ۳۰ ہزار سالہ پرانی چکی کی دریافت

آسٹریلیا میں کڈی سپرنگز (Cuddie Springs) کے مقام پر کھدائی کے دوران کوئی چار ہزار پرانی اشیاء کے ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں جو تقریباً تیس ہزار سال قبل آسٹریلیا کے باسی استعمال کیا کرتے تھے عام اندازہ ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے (Aborigines) کم ازکم چالیس ہزار سال سے آسٹریلیا میں رہ رہے ہیں۔

جو ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں ان میں ایسے پتھر بھی ملے ہیں جن پر دانے کوٹے یا پیسے جاتے تھے ان ٹکڑوں پر کنگرو اور خرگوشوں وغیرہ کے بال اور خون کے دھبے بھی ملے جن کو وہ شکار کیا کرتے تھے۔ یہ تحقیق اس لحاظ سے اہم ہے کہ اب تک اس سے زیادہ پرانے پتھر کے آلات واوزار کسی اور جگہ سے دستیاب نہیں ہوئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کا زمانہ اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا جو اب تک سمجھا جاتا تھا۔ نیز اس زمانہ میں بھی لوگ کاشتکاری کرتے تھے۔ دانے کوٹ کر روٹی پکاتے اور شکار پتھروں کے ہتھیاروں سے کیا کرتے تھے۔

اس سے قبل سب سے پرانے پتھر کے آلات مصر سے دریافت ہوئے تھے جو انیس ہزار سال پرانے تھے۔

(الفضل انٹرنیشنل 28.6.96)

مشتری کی سطح اور فضا کا احوال

مشتری جسے انگریزی میں Jupiter کہتے ہیں ہمارے نظام شمسی کا سب سے بڑا کرہ ہے تو ہم پرست لوگ ہر بڑی چیز کو خدا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یہی حال کسی زمانہ میں رومیوں کا تھا۔ چنانچہ رومی لوگ مشتری کو دیوتاؤں کا دیوتا (god of gods) یا دیوتاؤں کا بادشاہ (King of gods) کہا کرتے تھے۔ اب اس کے بارہ میں کچھ خبریں ملی ہیں جو گلیلیو خلائی جہاز نے وہاں سے روانہ کی ہیں۔

سائنس دان کو تجسس تھا کہ پتہ کریں مشتری کی فضا کیسی ہے اور اس کی سطح پر پانی ہے یا نہیں چنانچہ دو سال قبل گلیلیو نے موسم کا حال معلوم کرنے والے جو آلات مشتری پر اتارے تھے انہوں نے جو تصویریں بھیجیں ان سے سائنس دانوں نے اندازہ لگایا کہ مشتری کے ارد گرد چکر لگا رہا ہے اور مسلسل تصویریں بھیج رہا ہے۔ چنانچہ ماہرین کے مطابق (یہ تصویریں اخباروں میں چھپی ہیں) ان میں سخت گرم پانی کے بادل صاف نظر آتے ہیں۔ یہ بادل متعدد تہوں کی شکل میں ہیں۔ ہر تہہ کی موٹائی مختلف ہے۔ بادلوں کا رنگ سرخ ہے جیسے دور کہیں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں۔ کیلی فورنیا کی Jet Propulsion Laboratory کے سائنس دان کہتے ہیں کہ دو سال قبل پانی نظر نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا ننھا موسمی سٹیشن (Whether Station) مشتری کے ایسے مقام پر گرا تھا جہاں اس وقت موسم خلاف معمول صاف اور خشک تھا۔

ان تصاویر کے مطابق مشتری کے اوپر کوئی سو کلو میٹر ایمونیا (Amonia) کے بادل ہیں جن میں گھسا نہیں جا سکتا۔ امونیا کے بادلوں کے نیچے کہیں کہیں سفید پانی کے بادل ہیں جو تیزی سے

بھاگتے پھرتے ہیں گویا شدید طوفان کی زد میں ہوں۔ان طوفانوں کی موٹائی بھی ۶۵ تا ۱۰۰ اکلومیٹر تک ہے۔لیکن عجیب بات ہے کہ گو بادل تو پانی کے ہیں پر نہ گرجتے ہیں اور نہ برستے ہیں۔ان تصویروں میں نہ بارش کے آثار نظر آئے ہیں نہ بجلی کی چمک کے۔بارش نہ ہونے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ مشتری کی فضا(Atmosphere) زمین جیسی نہیں ہے بلکہ ایک ایسے برتن کی طرح ہے جس کا پیندا نہ ہو۔اس لئے زمین کی طرح بارش سمندروں پر نہیں برستی بلکہ مشتری کے اندرونہ میں جو آگ بھڑک رہی ہے اس کی وجہ سے اس کے سیدھے بخارات ہی بنتے ہیں اور پھر کثیف ہو کر پانی میں بدل جاتے ہیں گویا گرم پانی کا ایک بہت بڑا حمام ہو۔

مشتری کے اردگرد گیسوں کا اتنا بڑا گھیرا ہے کہ اس نے اپنے مدار میں درجنوں چاندوں کو گھیر رکھا ہے۔ان میں اکسیجن اور ہائیڈروجن بھی ہیں جو باہم مل کر پانی بناتی ہیں۔اور سلفر اور کاربن کی بھی کثیر مقدار رہے۔غالباً یہ عناصر وہاں دمدار ستارے (Comets) لائے ہونگے۔ہوسکتا ہے کہ زمین پر بھی یہ عناصر اس کی زندگی کی ابتداء میں اسی طرح باہر سے پہنچے ہوں۔یہ گیسیں بھی تیزی سے حرکت کرتی نظر آتی ہیں تقریباً ایسے ہی جیسے زمین کے اوپر۔لیکن مشتری کے فضائی طوفان ہماری زمین کی طرح نہیں ہیں جو آئے اور گزر گئے۔بلکہ جب چلنے پر آتے ہیں تو ہزاروں سال تک چلتے چلے جاتے ہیں۔مشتری کی فضا مختلف علاقوں میں مختلف ہوتی ہے کہیں نم اور کہیں خشک۔

(بحوالہ سڈنی مارننگ ہیرلڈ۔ ۷ر جون ۱۹۹۷ء)

پچھلے دنوں امریکہ کے Pathfinder نے مریخ کی سطح کا حال بھی سنایا کہ وہاں کی مٹی لوہے کی آمیزش کی وجہ سے سرخ ہے۔سطح پر چھوٹے بڑے پتھر لاتعداد میں بکھرے پڑے ہیں۔موسم شدید سرد اور خشک ہے۔شہب ثاقب بموں کی طرح اس کی سطح پر ہر وقت ٹکراتے رہتے ہیں۔دن کو درجہ حرارت منفی ۱۲ ڈگری ہے تو رات کو منفی ۶۷۔ہوا کا دباؤ صرف ۶ء۷۵ ملی بار ہے جبکہ زمین پر اوسط دباؤ اس سے ۱۵۰ گنا زیادہ یعنی ۱۰۱۳ء۲۵ ملی بار ہے۔اتنے کم دباؤ پر نہ تو کوئی کام ہوسکتا ہے نہ سانس لیا جاسکتا ہے کچھ ایسا ہی حال چاند کی سطح کا چاند پر جانے والوں سے بھی سن چکے ہیں۔نظام شمسی کے دوسرے کروں اور ہماری کہکشاں کے اکثر کروں کی سطح کا بھی یہی حال نظر آتا ہے۔اگر یہی حال زمین کی سطح کا بھی ہوتا تو ہمارا وجود کہاں ہوتا۔ہمارے جسم اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے

زمین کو تمام قوتیں ودیعت کردی گئی ہیں اور سطح زمین کو عین ہمارے مناسب حال بنایا گیا ہے۔ دوسرے کروں کے مقابلہ میں زمین ایسے لگتی ہے جیسے پتھروں کے پہاڑ میں کوہ نور ہیرا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانوں کے بیان میں سطح زمین کا بھی ذکر فرمایا ہے جیسے فرمایا ''وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ''(الغاشیہ:۲۱) یعنی کیا دیکھتے نہیں کہ زمین کس طرح بچھائی گئی ہے اور ہموار کی گئی ہے سطح زمین کو قابل رہائش بنانے میں اس کی فضاء، ہوا، پانی، مٹی، پہاڑ، سمندر، اس کے مدفون خزائن اور اس پر موجود عناصر اور ان کا صحیح تناسب، باہمی تعلق، سبھی اپنا مفوضہ کردار ادا کرتے ہیں ۔اب جوں جوں مریخ کی سطح کا حال معلوم ہو رہا ہے زمین کی سطح کی قدر و قیمت اتنا ہی ابھر کر سامنے آتی ہے۔اور اس موازنہ سے یہ حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ خدا نے بطور خاص سطح زمین کا ذکر بطور انعام کیوں کیا ہے ورنہ ہم تو بچپن سے یہی سنتے آئے تھے کہ جیسی ہماری زمین ہے ایسے ہی دوسرے کروں وغیرہ کی زمین ہے اور چودہ سو سال پہلے سطح زمین کی قدر و قیمت کا اندازہ کون کر سکتا تھا۔

(الفضل انٹرنیشنل 19.9.97)

کوے بہت ہوشیار ہوتے ہیں

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ کوے بہت ہوشیار ہوتے ہیں لیکن اس پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے کہ اللہ نے ان کو اتنی ذہنی صلاحیت عطا کی ہے کہ یہ اپنے مقصد اور ضرورت کے مناسب حال پتھر کے اوزار بنا سکتے ہیں۔ یہ ایسے اوزار بناتے ہیں جن سے وہ مکڑیوں کیڑے مکوڑوں اور اپنے ننھے شکاروں کو ان کی محفوظ رہائش گاہوں سے باہر کھینچ سکیں۔ کوؤں کے ہتھیاروں کا معیار انسانوں کے ان آباؤ اجداد کے برابر ہے جو بیس لاکھ سال پہلے زمین پر رہا کرتے تھے۔

رسالہ ''نیچر'' میں درج مضمون کے مطابق کوے تنکوں کو موڑ کر ان سے ہک بنا لیتے ہیں۔ اور سخت قسم کے پتوں سے کاٹنے والی آریاں بنا لیتے ہیں پھر کوؤں کو اپنے ہتھیاروں سے اتنا پیار ہوتا ہے کہ ان کو استعمال کر کے پھینک نہیں دیتے بلکہ آئندہ کے استعمال کے لئے بچا چھوڑتے ہیں اور جب غذا کی تلاش میں نکلتے ہیں تو ان کو اپنے گھر سے ساتھ لے کر چلتے ہیں اور ان کو اپنی چونچ اور پنجوں میں باری باری منتقل کرتے رہتے ہیں۔ ان کو یہ بھی پتہ ہوتا ہے کہ کون سی چٹان نرم ہے اور ہتھیار بنانے کے لئے موزوں ہے۔ (ماخوذ از ہیرلڈ ۲۰ جنوری ۱۹۹۶ء)

قرآن کریم میں بھی کوؤں کی تکنیکی صلاحیت کا ذکر ملتا ہے جہاں ایک کوے نے اپنے مردے بھائی کی لاش کو زمین میں دبا کر آدم کے ایک بیٹے کو اپنے مقتول بھائی کی لاش کو دفن کرنے کا سبق دیا تھا۔ چنانچہ فرماتا ہے:

''تب اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کریدتا تھا کہ اسے دکھائے کہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش کو چھپائے۔ کہنے لگا مجھ پر افسوس مجھ سے اتنا نہ

ہوسکا کہ اس کوے کی مانند ہوتا اوراپنے بھائی کی لاش کو چھپاتا ۔تب وہ پچھتانے والوں میں سے ہوا۔'' (المائدہ:۳۲)

علاوہ اپنے مناسب حال ہتھیاروں کے استعمال کےکوے کے بارہ میں مشہور ہے کہ وہ اپنی جنس کی لاش کو کھلا نہیں رہنے دیتا اورایک دوسرے سے اتنی ہمدردی رکھتا ہے جس کی نظیر دوسرے جانوروں میں نہیں ملتی ۔کوئی کھانے کے چیز دیکھے تو بجائے خودغرضی اورلالچ میں مبتلا ہونے کے آوازیں دے دے کراپنے سارے بھائیوں کواکٹھا کرلیتا ہے۔اس میں بھی انسانوں کے لئے عمدہ سبق ہے۔

کوؤں کی ہوشیاری کے متعلق ایک کہانی یادآئی کہ ایک قریب المرگ بوڑھا کوااپنے بچوں کو جمع کرکے نصیحت کررہاتھا کہ دیکھو جب تم کسی انسان کوجھکتے دیکھوتو سمجھ جایا کروکہ وہ تمہیں مارنے کے لئے روڑا لینے کے لئے جھکا ہے اورتم اڑ جایا کرو۔یہ سن کرایک نوجوان کوے نے کہا کہ بابا اگراس کے ہاتھ میں پہلے ہی روڑا پکڑا ہوتو کیا کریں ۔بابے نے کہا کہ بس بس تم مجھ سے زیادہ ہوشیار ہوتمہیں کوئی ڈرنہیں ۔

(الفضل انٹرنیشنل4.10.96)

اونگھنے والوں کو ہوشیار کرنے کا جدید طریقہ

ڈرائیور جب تھکاوٹ سے اونگھنے لگتے ہیں تو خود اپنے لئے اور اوروں کے لئے خطرات کا موجب بنتے ہیں۔اور یہ سڑک کے حادثات کا ایک بڑا سبب خیال کیا جاتا ہے۔ڈرائیوروں کی غفلت سے کئی قیمتی جانیں ضائع ہوجاتی ہیں۔اب امریکہ اور جاپان کے دواداروں Nissan Motor Compony اور امریکی محکمہ ٹریفک سیفٹی نے مل کر ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جو گاڑیوں میں فٹ ہوگا اور جونہی کوئی ڈرائیور ذرا غافل ہوگا قبل اس کے کہ اس پر اونگھ آئے ایک الارم بجے گا اور اگر پھر بھی ڈرائیور ہوشیار نہ ہوا تو مینتھل (Menthol) اور لیموں (Lemon) کی بوکی پھوار ڈرائیور پر پڑے گی اور اس کو ہوشیار کردے گی۔اس غرض کے لئے گاڑی میں ایک کیمرہ نصب کیا جائے گا۔ڈرائیور ایک خاص عینک پہنے گا اور اس پر انفراریڈ لیمپ سے شعاعیں پڑتی رہیں گی۔کیمرہ اور کمپیوٹر ڈرائیور کی آنکھوں کی جھپک کی رفتار نوٹ کرتے رہیں گے اور جونہی ڈرائیور کو اونگھ آنے لگے گی اور پلک جھپکنے کی رفتار کم ہوگی ایک الارم بجے گا اور اگر پھر بھی اونگھ دور نہ ہوئی تو ایک تیز قسم کی بوڈرائیور کے چہرہ پر پڑے گی اور اس کے لئے جاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔

افسوس کہ اس قسم کی ایجاد مجنوں کے زمانہ میں نہیں تھی ورنہ شاید لیلیٰ تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا۔ایک حکایت میں آتا ہے کہ جب مجنوں اپنی اونٹنی پر لیلیٰ کا تعاقب کر رہا تھا تو جونہی مجنوں تھک کر غافل ہوتا تو اونٹنی اپنا رخ گھر کی طرف کرلیتی۔مجنوں جب ہوشیار ہوتا تو اونٹنی کا رخ پھر لیلیٰ کی سمت کر دیتا۔اونٹنی بھی سمجھ دار تھی جب وہ دیکھتی کہ مجنوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے اور وہ غافل ہوگیا ہے تو پھر وہ اپنا رخ گھر کی طرف کرلیتی۔جب کئی بار ایسے ہوا تو مجنوں کو یاد آیا کہ اونٹنی کا چھوٹا بچہ گھر

میں ہے اس کو اس کی کشش ہے اور جب بھی میں حالت غفلت میں ہوتا ہوں تو اونٹنی طبعاً گھر کا رخ کر لیتی ہے۔ کہتے ہیں حکایت میں مجنوں سے مراد سالک، لیلیٰ سے مراد محبوب حقیقی (اللہ تعالیٰ) اور اونٹنی سے مراد انسان کا اپنا نفس ہے۔ انسان اپنے نفس کو قابو کر کے خدا کی طرف جاتا ہے اور جونہی ذرا غافل ہوتا ہے نفس اپنی محبوب اشیاء کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ جب تک انسان کے اندر اور باہر الارم نہ بجتے رہیں اور ہوشیار کرنے والی چیزیں چہرے پر نہ پڑتی رہیں کسی وقت بھی غفلت میں گرنے اور حادثہ سے دوچار ہونے کا خطرہ ساتھ لگا رہتا ہے۔

حضرت مصلح موعودؓ نے فرمایا تھا:

ے نفس امارہ کی باگیں تھام کر رکھیو
گرا دے گا یہ سرکش ورنہ تم کو بیخ پا ہو کر

اللہ تعالیٰ نے اونگھنے والوں کو ہوشیار رکھنے کا بھی انتظام کیا ہوا ہے۔ ہمارے لئے قرآن وحدیث، سلسلہ کے کتب ورسائل، خلیفہ وقت کے ارشادات، ایم ٹی اے کا سماوی مائدہ اور قضا وقدر کا سلسلہ ایسے ہی ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ہیں جو ہمیں ہوشیار کرنے کے لئے ہم پر پڑتے ہیں جب زندگی کی گاڑی چلاتے ہوئے ہم غافل ہو جاتے ہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 4.10.96)

مریخ کا سفر

مریخ ایک سرخ رنگ کا سیارہ ہے جو ہماری زمین کی طرح نظام شمسی کا حصہ ہے۔انسان کو چاند کے بعد سب سے زیادہ شوق مریخ پر جانے کا تھا۔چاند تک اس کے قدم پہنچ چکے ہیں۔اب مریخ کی باری ہے۔چنانچہ اپنے جانے سے پہلے اپنی گاڑی وہاں پہنچا دی ہے۔اپنا پروگرام ۲۰۱۰ء میں وہاں جانے کا ہے لیکن یہ معرکہ ناسا (National Aeronautics and Space Agency) کی کیلیفورنیا میں واقع Jet Propulsion Laboratory نے سر کیا ہے۔ان کی ذہانت اور عزم قابل داد ہیں۔لگتا ہے واقعی عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔

جو خلائی جہاز ناسا نے مریخ کی طرف بھیجا تھا اس کا نام Pathfinder Space Craft ہے۔جہاز پر چھ پہیوں والی گاڑی Sojourner بھی بھیجی گئی تھی جس پر کئی قسم کے آلات نصب تھے۔خلائی جہاز نے پیراشوٹ کے ذریعہ گاڑی مریخ پر اتار دی اور اب مریخ کے اردگرد چکر لگا رہا ہے۔

زمین سے مریخ کا فاصلہ کوئی ۴۹۵،۰۰۰،۰۰۰ کلومیٹر (یعنی ۴۹۵ ملین کلومیٹر ہے) جہاز تقریباً ایک لاکھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار کرتا ہوا کوئی چھ سات ماہ میں مریخ پر پہنچا۔جب وہ مریخ کے قریب پہنچا تو اس کی رفتار کم ہو کر ۲۶،۵۶۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کر دی گئی تھی۔پیراشوٹ گول شکل کا ایک بہت بڑا گیند تھا جو مریخ پر ایسے گرا جیسے گیند کو زمین پر مار کر اچھالا جاتا ہے۔جب وہ کھلا تو اس کے اندر سے گاڑی مع آلات کے برآمد ہوئی۔خود انسان کے لئے مریخ کا سفر اس کے صبر واستقلال اور ہمت حوصلہ کا سخت کڑا امتحان ہوگا۔زمین سے مریخ تک پہنچنے میں کوئی چھ ماہ لگیں گے۔واپسی پر پھر چھ ماہ

لگیں گے اور ۶۰۰ دن مریخ پر ٹھہر کر تجربات کرنے ہوں گے۔ اس طرح خلا بازوں کو کوئی اڑھائی تین سال اس سفر میں لگیں گے۔

مریخ کا موسم شدید سرد ہے۔ دن کو درجہ حرارت منفی ۱۲ درجے سنٹی گریڈ اور رات کو منفی ۲۷ درجے ہو جاتا ہے۔ ہوا کا دباؤ زمین کے مقابلہ میں ۱۵۰ گنا کم ہے یعنی صرف ۵ء۷ ملی بار، جبکہ زمین پر اوسط دباؤ ۲۵ء۱۰۱۳ ملی بار ہوتا ہے۔ اندازہ ہے کہ کوئی چار ارب (بلین) سال پہلے مریخ پر پانی بافراط موجود تھا۔ پھر کوئی ایک تا تین بلین سال پہلے ایک تباہ کن سیلاب آیا جس نے پتھروں کو خوب دھوڈالا اور کہیں کہیں انہیں جمع بھی کر دیا البتہ بعد میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ پانی مریخ سے ختم ہو گیا۔ اب وہاں کوئی پانی نہیں ہے۔ اور جہاں پانی نہ ہو وہاں زندگی کیسے ہو سکتی ہے۔ اب تو وہاں کے موسمی حالات اتنے سخت ہیں کہ جراثیم تک کا بھی زندہ رہنا مشکل ہے سوائے اس کے کہ کسی پناہ گاہ میں چھپ کر بیٹھے ہوں۔ مریخ پر اس کی زندگی کے ابتدائی ایام میں پتھروں کی شدید بارش ہوتی رہی ہے۔ اب بھی اس پر شہاب ثاقب گرتے رہتے ہیں۔ چٹانیں اس قسم کی ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں میں سے لاوا اگلنے پر پیدا ہوتی ہیں (Igneous)۔ زمین پر اب تک بارہ عدد شہاب ثاقب گرے ہوئے دریافت ہوئے ہیں جو مریخ سے آئے تھے۔ چونکہ مریخ پر پتھر اسی ساخت کے ہیں لہذا یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ وہ مریخ سے ہی آئے تھے۔ مریخ کی سطح پر ۲۹ تا ۴۰ کلومیٹر تک گرد چھائی رہتی ہے۔

ناسا کے مشن کے دو مقاصد تھے ایک تو اپنی ٹیکنالوجی کو ٹیسٹ کرنا اور دوسرے مریخ اور زمین وغیرہ کی تخلیق کے ابتدائی حالات کے بارہ میں معلومات حاصل کرنا۔ پہلا مقصد تو پورا ہو گیا ہے اور دوسرے کے بارہ میں صحیح فیصلہ کچھ عرصہ بعد ہو گا کیونکہ ابھی معلومات اکٹھی کی جارہی ہیں۔

جہاں تک آسٹریلیا کے سائنس دانوں کا تعلق ہے وہ حسرت اور رشک سے ناسا والوں کو دیکھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کاش ہمارے پاس بھی اتنے ذرائع ہوتے تو پھر دیکھتے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر پال ڈیویز نے کہا ہے کہ آسٹریلیا کے پاس زمین کی ابتدائی حالت کے متعلق تحقیق کے لئے بیش قیمت خزانہ موجود ہے۔ ہمارے پاس دنیا کے قدیم ترین آثار متحجرہ (Fossils) ہیں۔ سیارچوں (Asteroids) کے گرنے سے جو گڑھے (Craters) پڑے تھے وہ اپنی اصلی حالت

میں محفوظ ہیں نیز تحقیق کے لئے دنیا کا قدیم ترین Hydrothrmal نظام بھی ہے۔ اگر ان پر تحقیق کی جاتی تو مریخ کے مقابلہ میں بہت زیادہ معلومات حاصل ہوسکتی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں پروفیسر صاحب شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ناسا والے جائیں مریخ پر ہمارے لئے آسٹریلیا ہی مریخ ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 12.9.97)

ستارے بوڑھے سہی پر اتنے بھی نہیں

آسمان پر لٹکائی ہوئی دوربین ہبل ٹیلی سکوپ (Hubble Telescope) نے جو اطلاعات فراہم کی ہیں ان کے مطابق ہماری کائنات بشمول وقت، خلا، روشنی اور مادہ (Time, Space, Light, Matter) کی عمر کوئی اٹھارہ ارب سال (18, Billion Years) بنتی ہے لیکن گارڈین کی خبر کے مطابق کیلیفورنیا کی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے ماہر فلکیات ڈاکٹر رائیڈ (Dr. Neill Ried) کو اس سے اختلاف ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر ایک سیٹلائٹ (Hipparcos) کے ذریعہ اطلاعات حاصل کی ہیں ان کے مطابق ہماری کائنات کی عمر کوئی تیرہ ارب سال بنتی ہے۔ وہ کہتے ہیں دوسرے سائنس دانوں کے اندازے دس پندرہ فیصد زیادہ ہیں۔ اور ان کو حساب میں غلطی لگی ہے۔

چلو اچھا ہوا ہماری کائنات آخر اتنی بوڑھی بھی نہیں جتنی خیال کی جاتی ہے۔ ویسے یہ بات کچھ ایسی ہی ہے کہ کہتے ہیں ایک شخص جس کی بلاخوری بہت مشہور تھی ایک دفعہ اس کے کسی میزبان نے اس کے آگے اکٹھی بیس روٹیاں کھانے کے لئے رکھ دیں۔ اس شخص نے اوپر سے ایک روٹی اٹھا کر واپس کرتے ہوئے کہا یہ لے جائیں میں پیٹو ہی سہی پر اتنا بھی نہیں ہوں۔

(الفضل انٹرنیشنل 12.9.97)

ایک تبدیل شدہ وائرس کے ذریعہ چوہوں کی نسل کا خاتمہ
اسی طریق سے انسانوں کی نسل بھی ختم کی جاسکتی ہے

آسٹریلیا کے سائنس دانوں نے جینیاتی سائنس (Genetic Science) کے ذریعہ ایک وائرس کے جینز (Genes) میں ایسی تبدیلی پیدا کرلی ہے جسے اگر چوہوں میں پھیلا دیا جائے تو چوہے بچے پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جائیں گے اور اس طرح ان کی نسل ختم ہو جائے گی یہی طریق باقی نقصان رساں کیڑوں مکوڑوں (Pets) کو ختم کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اس تحقیق کا ایک پہلو بہت فکر انگیز بھی ہے چنانچہ CSIRO کی اس ریسرچ ٹیم کے ایک رکن DR. Lyn Hinds نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ اگر چہ اس تحقیق کا فوری مقصد تو نقصان رساں جانوروں جیسے خرگوشوں، لومڑوں، چوہوں اور دیگر کیڑوں مکوڑوں کو ختم کرنا ہے لیکن اس کے ذریعہ انسانوں کو بھی اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم کرنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سائنس دانوں نے جو کچھ کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے چوہوں کے ایک وائرس (Mouse Pox) میں ایک نئے جین (Gene) کا اضافہ کر دیا ہے جو چوہے کے سپرم کو چوہیا کے بیضہ کے ساتھ ملنے میں رکاوٹ ڈال دیتا ہے۔

(سڈنی ہیرلڈ ۲۵/اپریل ۱۹۹۷ء)

اگر خدانخواستہ اس طرح کا وائرس انسانوں کے حسب حال تیار کر کے کسی ملک میں پھیلا دیا جائے تو اس ملک کی ساری یا اکثر آبادی کو کچھ عرصہ میں بغیر جنگ لڑے یا بم گرائے ختم کیا جا سکتا ہے جہاں تک بیماریاں پیدا کرنے والے جراثیم کا تعلق ہے وہ تو پہلے ہی دنیا کی کئی خفیہ لیبارٹریوں میں تیار پڑے ہیں اور دنیا کے دانشور پہلے ہی حیاتیاتی جنگ (Biological Warfare) کے تصور سے لرزاں ہیں۔ اور پھر کیا ضمانت ہے کہ اس طرح کے خوفناک جراثیم یا وائرس کسی مخصوص ملک کی حدود پار کر کے باقی دنیا میں اور بالخصوص اس طرح کے جراثیم تیار کرنے والوں کے اپنے ملکوں میں تباہی نہیں پھیلائیں گے۔ جراثیموں کو بارڈر کراس کرنے کے لئے کوئی پاسپورٹ ویزا درکار نہیں ہوتا۔

اللہ ہی جانے جینیاتی سائنس (Genetic Engineering) کا غلط اور بے حجابانہ استعمال انسانوں، حیوانوں بلکہ چرند پرند تک کو کن کن مصائب میں مبتلا کرے گا۔

(الفضل انٹرنیشنل 31.10.97)

آسٹریلیا نے اپنی کالی بھیڑوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا

آسٹریلیا میں سفید بھیڑیں اٹھانوے فیصد اور کالی بھیڑیں صرف دو فیصد ہیں۔لیکن ان کا وجود بھی ناقابل برداشت ہے۔چنانچہ جینز کی تبدیلی کے ذریعہ دو فیصد کالی بھیڑوں کو بھی سفید بھیڑوں میں تبدیل کیا جارہا ہے۔وہ کہتے ہیں کالی بھیڑوں کی وجہ سے اون کی صنعت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

لیکن حقیر سمجھی جانے والی کالی بھیڑوں کے بھی ہمدرد ہوتے ہیں چنانچہ اخبار میں ایک احتجاج شائع ہوا ہے کہ کالی بھیڑوں کی نوع دنیا سے ختم ہوتی جارہی ہے۔اس لئے ان کا ختم کرنے کا پروگرام واپس لیں۔آخر کالی بھیڑوں کی اون کو سفید بھیڑوں کی اون سے علیحدہ کیوں نہیں کیا جاسکتا۔اور پھر کچھ لوگ کالا رنگ بھی تو پسند کرتے ہیں۔

(ہیرلڈ ۲۶رفروری ۱۹۹۷ء)

کالی بھیڑیں تو آخر پھر بھی بھیڑیں ٹھہریں۔دو فیصد کالے قدیم باشندوں کو گوروں نے کب برداشت کیا تھا۔وہ تو بہرحال انسان تھے اور بھیڑوں سے بہتر۔

(الفضل انٹرنیشنل 31.10.97)

سپین کے کھلنڈروں نے بے چاری گائے کو وسکی پلا پلا کر ماردیا

سپین کے بعض کھلنڈرے کھیل ہی کھیل ہی میں بے زبان جانوروں کو جان سے مار دیتے ہیں جس میں زندہ بکری کو اونچی عمارت سے زور سے نیچے پٹخ دینے کی ظالمانہ کھیل بھی شامل ہے جس کے خلاف وہاں کی حقوق حیوان کی تنظیم نے آواز بلند کی ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ شمالی سپین کے ایک گاؤں (Villarefrades) میں ایک تہوار کے روز پیش آیا۔ کچھ کھلنڈروں نے ایک گائے کو پکڑ کر زبردستی وسکی کی چار بوتلیں اس کے اندر انڈیل دیں گائے یہ زیادتی برداشت نہ کرسکی اور حرکت قلب بند ہوجانے سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

کچھ عرصہ قبل سڈنی میں شراب کی مضرت پر ایک سیمینار ہوا تھا جس میں ایک ڈاکٹر نے کہا تھا کہ سمجھنے کی بات ہے کہ الکوحل بہرحال ایک زہر ہے کیونکہ اس کی زیادہ مقدار مہلک ہے۔ جو چیز انسانوں کی جان لے سکتی ہے وہ حیوانوں کی بھی لے سکتی ہے۔ سپین کے کھلنڈروں کو اگر گائے کا یہ آخری پیغام سمجھ میں آجائے تو اس بے چاری گائے کی جان رائیگاں نہیں گئی۔ (ہیرلڈ ۹ رجون ۱۹۹۷ء)

(الفضل انٹرنیشنل)

آسٹریلیا کی خلائی تحقیقات میں پیش رفت

آسٹریلیا نے کینبرا کے نزدیک ایک رصد گاہ تعمیر کی ہے جس نے کچھ عرصہ قبل کام کرنا شروع کردیا ہے۔ یہ رصدگاہ ایک بین الاقوامی منصوبہ کا حصہ ہے جس کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا یہ کائنات جوایک بڑے دھماکہ (Big Bang) کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی اوراس وقت سے دھماکہ کی قوت کے زیراثر ہرآن پھیلتی چلی جارہی ہے کیا یہ ہمیشہ ایسے ہی پھیلتی رہے گی یا کبھی ایسا وقت بھی آئے گا جب کائنات میں بکھرے ہوئے بے پناہ مادہ کی کشش ثقل پھیلاؤ پیدا کرنے والی قوت پر غالب آجائے گی اور پھر اپنے آغاز کی طرح ایک نقطہ پر مرکوز ہوجائے گی جس طرح کہ بگ بینگ سے پہلے تھی۔اس واپسی کے عمل کوآسٹریلیا کے سائنس دانوں نے Big Bang کوالٹا کرGnab Gib کا نام دیاہے جب کہ دوسرے سائنس دان اس کوBig Squeez یاBig Crunch کا نام دیتے ہیں۔آسٹریلیا کے سائنس دان کہتے ہیں ہمارادھرا ہوانام دوسرے ناموں سے کم نہیں۔

اس غرض کے لئے سائنس دان کائنات کے آخری معلوم کنارے پرواقع دس ستاروں کا مشاہدہ ومعائنہ کررہے ہیں جن میں سے ایک کا نام انہوں نے K۱۹۹۵ء رکھا ہے اور چھ ارب سال پہلے بگ بینگ کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا۔اتفاق کی بات ہے کہ اس کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزارمیل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفرکرتی ہوئی اب زمین پر پہنچی ہے اوروہ اس طرح نظرآرہا ہے جس طرح چھ ارب سال پہلے اپنی پیدائش کے وقت تھا گویا سائنس دان ایک ستارے کی پیدائش کا نظارہ کررہے ہیں۔اس وقت وہ کیا ہے اورکیسا ہے وہ وہی دیکھ سکتا ہے جو چھ ارب سال بعد زمین پر سے مشاہدہ کرے گا بشرطیکہ تب تک ہماری زمین رہی تو جس کا امکان بہت کم ہے۔

یہی حال دوسرے ان گنت ستاروں کا ہے۔ جو کچھ آج ہم دیکھتے ہیں پتہ نہیں ان پر کتنا عرصہ گزر چکا ہوگا۔ اگر سورج پر کوئی دھما کہ ہوتو ہمیں نو منٹ بعد دکھائی دے گا۔ (غالب شاید سائنس دان بھی تھا جس نے کہا تھا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں یہ بازی گر دھوکہ کھلا

بہر حال سائنس دانوں کی ٹیم کائنات کے انتہائی دور کنارہ پر واقع Supernovae یعنی جلتے ہوئے ستاروں کا مشاہدہ کررہے ہیں تا یہ معلوم کریں کہ کہکشائیں کس رفتار سے ایک دوسرے سے پرے ہٹ رہی ہیں۔ سپرنووا K۱۹۹۵ء بھی ایک کہکشاں کا حصہ ہے یہ سورج سے بھی دس کروڑ گنا زیادہ روشن ہے لیکن بوجہ دوری کے اس کی جو روشنی ہم تک پہنچتی ہے وہ اس روشنی سے بھی چالیس لاکھ گنا کم ہے جو ہماری ننگی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ لہذا اس کو دیکھنے کے لئے طاقتور دوربینوں کی ضرورت ہے۔

جہاں تک ہمارے اپنے سورج کا تعلق ہے سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ یہ مزید پانچ ارب سال تک روشنی دے گا اور پھر اس کا تیل (یعنی اس کے اندر ہونے والا نیوکلائی عمل) ختم ہو جائے گا اور یہ چراغ بجھ جائے گا (لہذا جو کام نبٹانے ہیں ابھی روشنی ہے جلدی جلدی نپٹا لیں) لیکن سائنس دان کہتے ہیں زمین کے باسیوں کو فکر کی ضرورت نہیں۔ اس وقت تک انسان یا تو ارتقاء کے عمل کے نتیجہ میں بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ بدلتا ہوا کسی دوسری مخلوق کی صورت میں بدل چکا ہوگا یا مٹ چکا ہوگا۔ پانچ ارب سال پہلے بھی وہ آج جیسا انسان کب تھا بلکہ صرف ایبا (Amoeba) تھا یعنی ایک ہی خلیہ (Cell) والا ایسا جاندار تھا جو صرف خوردبین سے نظر آسکتا تھا۔ وہ آنکھوں سے مخفی ایک مخلوق تھی جو تازہ پانی، گیلی مٹی یا دوسرے جانداروں کے ساتھ چمٹ کے پلتا تھا۔ ایسے ہی پانچ ارب سال بعد بھی ممکن ہے وہ آنکھوں سے مخفی کسی اور طرز کی مخلوق میں بدل چکا ہو جو آکسیجن وغیرہ سے بے نیاز خلا اور وقت (Space & Time) کی وسعتوں میں اڑتا پھرتا ہو۔ کون جانے کیا ہو۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے وجود میں آنے سے قبل زمین پر ایک مخفی مخلوق

(جن) پیدا کی گئی تھی جو اس وقت کے گرم ماحول سے مناسبت رکھتی تھی (الحجر: ۲۷۔۲۸)

قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کو پیدائش کے بعد وسعت دے رہا ہے جیسے فرمایا "وَالسَّمَاءَ بَنَیۡنَاهَا بِاَیۡدٍ وَّاِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ" (الذاریات: ۴۸) اور ہم نے آسمان کو قوت کے ساتھ بنایا اور ہم ہی اسے وسعت دینے والے ہیں۔

کائنات کو اس کے پھیلاؤ کے بعد پھر سے سمیٹنے اور اس کی صف کو لپیٹنے کے بارہ میں اس قادر مطلق نے فرمایا "یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَاءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ . کَمَا بَدَاۡنَا اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہ، وَعۡدًا عَلَیۡنَا . اِنَّا کُنَّا فَاعِلِیۡنَ، ' (الانبیاء: ۱۰۵) یعنی جس دن آسمان کو ہم اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح ہم نے پیدائش کو پہلی دفعہ شروع کیا تھا اسی طرح اس کو پھر دہرائیں گے۔ یہ ہم نے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے۔ ہم ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سُبۡحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمۡدِہٖ سُبۡحَانَ اللّٰہِ الۡعَظِیۡمِ۔ سچ ہے:

تیری قدرت کا کوئی بھی انتہا پاتا نہیں
کس سے کھل سکتا ہے پیچ اس عقدہ دشوار کا

(الفضل انٹرنیشنل 31.10.97)

برے رجحانات کے جینز رکھنے پر بچہ کو پیدائش سے قبل ہی مار دینا مناسب ہے یا نہیں؟

کیا ایسے جینس (Embryos) جن میں ہم جنس پرستی کے رجحان کا جین (Gene) نظر آئے انہیں پیدائش سے پہلے ہی ختم کر دینا مناسب ہوگا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب امریکہ کے ایک نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر جیمز واٹسن یہ دیتے ہیں کہ اگر آپ کو وہ جین مل جائے جو انسان کا میلان طبع ہم جنس پرستی کی طرف متعین کرتا ہے اور اس کی ماں کہے کہ مجھے اس طرح کا بچہ نہیں چاہئے تو بہتر یہ ہے کہ اسے حمل ضائع کرنے دیں۔ (گویا Nip the evil in the Bud والی بات ہے) ڈاکٹر صاحب نے اپنے نیویارک والے گھر میں سنڈے ٹیلیگراف کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ مجھے یاد ہے ایک ماں ترستی تھی کہ اس کے بیٹے کے ہاں اولاد ہو اور وہ اپنے پوتے پوتی کو دیکھے لیکن اس کے سامنے اس کا بیٹا اس طرف نہیں آ رہا تھا۔ اس ماں کے لئے اس کے بیٹے کا ہم جنس پرست ہونا اس کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ تھا۔ ایسی صورت میں اگر ماں کو بچے کے رجحان کا پیدائش سے پہلے علم ہو جائے اور وہ اسے ختم کرنا چاہے تو میں کون ہوتا ہوں کہ اسے مجبور کروں کہ تم ضرور ایسے بچہ کی ماں بنو جو تمہیں ساری عمر دکھ میں مبتلا رکھے۔

ڈاکٹر جیمز واٹسن کے اس بیان پر کئی ڈاکٹروں نے سخت تنقید کی ہے کہ یہ امر خاصہ مابہ النزاع ہے کہ کسی بچہ کو پیدائش سے پہلے ہی اس جرم میں مار دیا جائے کہ وہ بڑا ہو کر سدومی بنے گا۔

ڈاکٹر واٹسن وہ ہیں جنہوں نے DNA دریافت کیا تھا اور ۱۹۸۹ء میں ایک ایسے بین

الاقوامی ادارہ کے امریکی شاخ کے ڈائریکٹر تھے جو اس کوشش میں تھا کہ انسان کے اندر پائے جانے والے دو لاکھ جینز (Genes) کی شناخت کی جائے۔ بعد میں وہ اس ادارے سے علیحدہ ہو گئے تھے

(دی ٹیلیگراف لندن بحوالہ سڈنی مارننگ ہیرلڈ، ۹۷-۲-۱۸)

ہر انسان کے جسم میں تقریباً دس ہزار ارب خلیات (Cells) ہوتے ہیں ہر خلیہ کے مرکز (Nucleus) میں اس کا ڈی۔ این۔ اے ہوتا ہے جس کے اندر پچاس ہزار تا ایک لاکھ جینز ہوتے ہیں۔ یہ جینز انسان کو وہ بناتے ہیں جو وہ ہے۔ انسان کا رنگ و نسل، قد، موروثی خوبیاں، خامیاں، عادات سب اس کے اندر ودیعت کی ہوئی ہوتی ہیں۔ بچے جہاں اپنے والدین بلکہ کئی کئی پشتوں کے آباؤ اجداد کی خوبیوں کے وارث بنتے ہیں وہاں ان کی خرابیوں، بیماریوں اور عادات وغیرہ کو بھی ورثہ میں پا سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر بالفرض بچہ کی پیدائش سے پہلے یہ علم ہو جائے کہ بچہ کے کسی موذی مرض میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہے تو بچہ کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دینا جائز ہوگا؟۔ جسمانی بیماریوں کے علاوہ بعض خطرناک اخلاقی بیماریاں بھی جینز میں پائی جاسکتی ہیں۔ مثلاً اگر یہ پتہ چل جائے کہ بچہ نے ورثہ میں خطرناک حد تک غصہ کے جینز پائے ہیں اور اس میں خطرناک ڈاکو بننے کا رجحان پایا جاتا ہے تو کیا اسے حالت جنین میں ہی ختم کرنا جائز ہوگا؟ یہ تو وقوعہ جرم بلکہ ارادہ جرم سے بھی پہلے سزا دینے والی بات ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ایسے جینز رکھنے والا شخص اپنی شعوری کوشش سے اصلاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کرسکتا اور اس سے جرم سرزد ہو جائے جو ایک لحاظ سے بے اختیاری والی بات ہے تو کیا وہ مستوجب سزا ہوگا یا نہیں یا کم از کم نرم سزا کا حق دار نہیں ہوگا۔ اگر ایسا تسلیم کرلیا جائے تو دنیا کے قوانین کی حد تک تو جزا سزا کا تصور ہی درہم برہم ہو جائے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اول تو فطرت انسانی ابتداءً صحیح یا نیوٹرل ہی تھی لیکن ماں باپ ماحول اور غذا وغیرہ جو پشت ہا پشت چلتے ہیں انسان کو خراب رجحانات عطا کر دیتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہر انسان کی فطرت ہی ایسے واقع ہوئی ہے کہ اس میں اچھے برے رجحانات ومیلانات پیدائشی طور پر موجود ہوتے ہیں گویا (فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا) (الشّمس:۹) کا ایک عمل پیدائش سے بھی پہلے شروع ہو جاتا ہے اور اچھے برے دونوں رجحانات اس کے اندر رکھ دیئے جاتے ہیں تا وہ کشمکش اور

جدوجہد کے نتیجہ میں ترقی کر سکے۔ اللہ تو اس سے پاک ہے کہ وہ فسق وفجور کے خیالات دل میں ڈالے یا میلانات طبیعت میں رکھے لیکن چونکہ اچھے برے نتائج اسی کے قانون کے تحت نکلتے ہیں اس لئے اچھے اور برے دونوں رجحانات کا طبیعت میں ڈالے جانا خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا عمل اس وقت ہوتا ہے جب انسان خود اپنے دل سے اچھے برے کا فیصلہ کرنے کا اہل ہو جاتا ہے اور گناہ اس کے سینے میں کھٹکنے لگ جاتا ہے۔ اس کا تیسرا عمل اس ہدایت کے ذریعہ ہوتا ہے جو انبیاء لاتے ہیں اور انسانوں پر فسق وفجور اور نیکی وتقویٰ کی راہوں کو واضح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو وہ سب کمزوریوں کی دعا واستغفار اور تدبیر ومجاہدہ کے نتیجہ میں پردہ پوشی کر دیا کرتا ہے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہوتا اور انسان اپنے پیدائشی رجحانات پر عمل کرنے پر مجبور ہوتا تو اللہ پر الزام آتا کہ جب اس نے خود ہی گناہ پر پابند کر دیا ہے تو سزا کیسی اور ایسے ہی نیک رجحان کے تحت نیکی کرنے کا ثواب کیسا؟

حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں:

”غرض بے اعتدالیوں اور بدیوں کی طرف جانا انسان کی ایک حالت ہے جو اخلاقی حالت سے پہلے اس پر طبعاً غالب ہوتی ہے اور یہ حالت اس وقت تک طبعی کہلاتی ہے جب تک انسان عقل اور معرفت کے زیر سایہ نہیں چلتا بلکہ چارپایوں کی طرح کھانے پینے، سونے جاگنے یا غصہ اور جوش دکھلانے وغیرہ امور میں طبعی جذبات کا پیرو رہتا ہے۔“

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳)

الغرض اچھے برے دونوں رجحانات انسان کی طبعی حالت اور متوازن فطرت کا خاصہ ہیں اور پیدائش سے پہلے ہی خراب رجحانات کا اندازہ کر کے بچے کا قتل مناسب نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

(الفضل انٹرنیشنل 18.7.97)

انسان ہی نہیں بلکہ دوسری انواع بھی ہمیشہ ہجرت کرتی اور نئی بستیاں آباد کرتی چلی آئی ہیں

درختوں پر رہنے والی پندرہ سبز رنگ کی چھپکلیوں نے درختوں کے گٹھہ پر بیٹھ کر ۳۲۰ رکلومیٹر دور سمندر پار کے ایک ملک میں پہنچ کر اس بات کی تصدیق کر دی ہے جو سائنسدان ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ صرف اہل نظر انسان ہی تازہ بستیاں آباد نہیں کرتے حیوان بھی ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔

۱۹۹۵ء میں جنوبی امریکہ کے علاقہ کریبین میں ایک سخت سمندری طوفان آیا تھا۔اس وقت ایک جزیرہ Guadeloupe سے کچھ درخت دوسرے جزیرہ Anguilla تک بہہ کر پہنچے۔ان پر بیٹھ کر پندرہ بڑے سائز کی چھپکلیاں بھی وہاں پہنچ گئیں اور گزشتہ اڑہائی سال میں ان کی نسل وہاں خوب پھل پھول رہی ہے۔اس قسم کی چھپکلیاں وہاں پہلے نہیں ہوا کرتی تھیں۔یوں تو درختوں وغیرہ کے ساتھ چمٹ کر مینڈک اور کیڑے مکوڑے پہلے بھی نقل مکانی کیا کرتے تھے لیکن اس قسم کی مخلوق کی یہ پہلی مثال سامنے آئی ہے۔

یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز کے پروفیسر آرچر کہتے ہیں کہ چوہوں جیسے کترنے والے جانور (Rodents) پانچ چھ ملین سال پہلے یقیناً اسی طرح آسٹریلیا پہنچے ہوں گے جس طرح چھپکلیاں پہنچی ہیں۔البتہ بڑے بڑے جانوروں کے بارہ میں اندازہ ہے کہ تیر کر آئے ہوں گے۔ہاتھی توانڈونیشیا کے جزائر سے تیر کر آسٹریلیا پہنچے تھے۔پھر شمالی آسٹریلیا سے کئی ہزار میل کا سفر طے کر کے جنوب میں نیو ساؤتھ ویلز کے علاقہ میں پہنچے جہاں ۱۹۰۰ء میں ان کے متحجر ڈھانچے (Fossils)

دستیاب ہوئے تھے۔البتہ بعد میں ان کا وجود یہاں ناپید ہو گیا۔

۱۹۷۴ء میں قطب جنوبی (Antarctic) کے پنگوئن کا ایک انڈہ صحیح حالت میں آسٹریلیا کے ساحل پر ملا تھا جو دو ہزار کلومیٹر کا سمندری سفر کر کے یہاں پہنچا تھا۔

پروفیسر آرچر اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھتے ہیں کہ ۴۵ تا ۳۵ ملین سال پہلے جب آسٹریلیا اور قطب جنوبی پھٹ کر علیحدہ ہوئے تھے اس وقت آسٹریلیا ہر طرف سے ایسے سمندر میں گھرا ہوا تھا جن میں کروڑوں قسم کی انواع بھری پڑی تھیں اور ان میں سے بہت سی نئی بستیوں کی تلاش میں آسٹریلیا آ گئی تھیں۔ہم یہ کبھی نہ جان سکیں گے کہ ان میں سے کتنی انواع اس کٹھن سفر میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور کتنی یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئیں۔

(سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۹/۱ اکتوبر ۹۸ء)

جنگلوں کے جانور اور فضاؤں کے پرندے جب چاہیں اور جہاں چاہیں خدا کی زمین میں دانا دنکا چگنے کے لئے اور نئی بستیاں آباد کرنے کے لئے جا سکتے ہیں۔ان کو موج ہے کسی ویزے کی ضرورت نہیں۔یہ مشکل انسانوں ہی کو کچھ عرصہ سے ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 9.4.99)

گھوڑے سننے اور اطاعت کرنے کی صفت کی وجہ سے تین سو تک الفاظ یاد رکھ سکتے ہیں

''ڈیون'' انگلینڈ میں گھوڑوں کی نفسیات کا ایک ادارہ قائم ہے جس کے سربراہ Dr. Marthe Kiley Worthington ہیں۔ انہوں نے پانچ سالہ تحقیق و تجربہ کے بعد بتایا ہے کہ گھوڑے اتنی استعداد رکھتے ہیں کہ تین سو تک الفاظ یاد رکھ سکتے ہیں۔ ان الفاظ میں نام، کام اور تعریفی الفاظ شامل ہیں۔ سکھانے کے بعد گھوڑوں کا امتحان بھی لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب گھوڑوں کی تعلیم و تربیت (ٹریننگ) ان کی پیدائش سے ہی شروع کر دیتے ہیں۔ ان کو فیملی گروپس میں رکھا جاتا ہے اور ہر گھوڑے کا علیحدہ معلم (Trainer) ہوتا ہے۔ سکھانے کا طریق یہ ہے کہ گھوڑے کے سامنے ایک چیز لا کر بار بار اس کا نام دہرایا جاتا ہے۔ جب گھوڑا کئی اشیاء کے نام سیکھ جاتا ہے تو محض نام ادا کرنے سے وہ چیز کو سمجھ لیتا ہے۔ ایسے ہی گھوڑے کے سامنے بعض الفاظ بول کر وہ حرکات کرائی جاتی ہیں مثلاً تیز چلو، دلکی چال چلو، آہستہ چلو وغیرہ۔ بعد میں یہ الفاظ سن کر گھوڑا وہ حرکات کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح گھوڑے سرخ، نیلے اور پیلے رنگوں کا انتخاب کر سکتے ہیں گھوڑے اپنے معلم کے احکام کو سنتے اور ان کی اطاعت کرتے ہیں اور یوں تین سو الفاظ تک سمجھنے اور یاد رکھنے کی استعداد حاصل کر لیتے ہیں۔ (ماخوذ از ٹیلیگراف لندن بحوالہ سڈنی ہیرلڈ۔ ۲۸ر جولائی ۱۹۹۸ء)

الغرض گھوڑے اپنے مالک کے احکام کو سنتے اور اس کی اطاعت کرتے ہیں اور ایسا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ ان کی ذہانت اور وفاداری ایک ضرب المثل بن چکی ہے۔ قرآن مجید میں بھی

گھوڑوں کا ذکر متعدد بار آیا ہے بلکہ ایک سورۃ کا تو نام ہی ''العادیات'' یعنی دوڑنے والے گھوڑے رکھا گیا ہے اوراس میں بالخصوص ہانپتے ہوئے دوڑنے والے گھوڑوں کوبطور گواہ پیش کیا گیا ہے اوران کا تعریفی انداز میں ذکر مومنوں کے لئے بطور ایک انعام اور سبق کے کیا گیا ہے۔اس سورۃ میں گھوڑوں کا ذکر ایسے پیارے انداز میں کیا گیا ہے کہ ان کی ذہانت اوراطاعت کی تصویر آنکھوں کے سامنے ابھر کر آجاتی ہے۔یہ گھوڑے اپنے مالکوں کے احکام کے تحت ایسے جوش وخروش اور ذوق وشوق سے دوڑتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں ہانپنا شروع کر دیتے ہیں۔رستے کی سختیوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے چنانچہ ان کے سموں سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔پھر لمبے اور مشکل سفر کے بعد نہ ہمت ہارتے ہیں اور نہ آرام کا مطالبہ کرتے ہیں بلکہ اپنے مالک کی اطاعت میں صبحدم تیزی سے غبار اڑاتے ہوئے دشمن کو غارت کرنے کے لئے اس پر پڑتے ہیں اور جان کی بازی لگاتے ہوئے دشمن کی صفوں میں جا گھستے ہیں اور تیروں کی بارش کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔خدا ان کی مثال پیش کر کے فرماتا ہے کہ ان گھوڑوں کی طرف دیکھو کہ وہ اپنے مالک کی کیسی اطاعت کرتے ہیں تمہارا بھی ایک مالک ہے اور وہ حقیقی مالک ہے۔اگر تم ان وفادار اور اطاعت شعار گھوڑوں کو غور سے دیکھو گے تو تمہارے نفوس خود گواہی دیں گے کہ تم اپنے مالک کے انعامات کی قدر نہیں کرتے بلکہ ناشکری کرتے ہو۔تم اطاعت اور وفا کا سبق اپنے گھوڑے سے ہی سیکھو۔

(الفضل انٹرنیشنل 9.4.99)

مغرب میں دعاؤں کی تاثیر پر عوام کی رائے کیا ہے؟

مغرب میں تجسس پایا جاتا ہے کہ کسی طرح پتہ چلے کہ دعاؤں میں واقعی کوئی اثر ہوتا ہے یا نہیں؟ اور کیا واقعی کوئی ایسی بالا ہستی ہے جو دعاؤں کو سنتی اور قبول کرتی ہے۔ اس غرض کے لئے حال ہی میں امریکہ اور آسٹریلیا میں متعدد سروے ہوئے ہیں جن کے نتائج اخباروں میں چھپے ہیں۔ امریکہ میں گیلپ پول (Gallup Poll) کے سروے سے پتہ چلا ہے کہ نوے فیصد امریکی دعا کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ خدا ہماری دعاؤں کو کسی نہ کسی شکل میں ضرور قبول کرتا ہے۔ ۳۰ فیصد امریکیوں نے بتایا کہ ان کی بیماری میں اپنی اور دوسروں کی دعاؤں کی وجہ سے غیر معمولی رنگ میں صحت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے بالمقابل آسٹریلیا میں دعا کرنے والوں اور اس پر یقین رکھنے والوں کی تعداد تھوڑی ہے۔ ۵۴ فیصد آسٹریلوی باشندوں نے کہا کہ وہ باقاعدہ دعا کرتے ہیں جبکہ ۲۹٫۷ فیصد نے کہا کہ انہوں نے کبھی دعا نہیں کی۔ اسی طرح کئی ہسپتال والوں نے مریضوں پر دعا کا اثر معلوم کرنے کے لئے سروے کئے ہیں۔ سان فرنسسکو کے جنرل ہسپتال میری لینڈ آسٹریلیا کے ہسپتال اور ایڈز کے مریضوں پر دعا کو مفید پایا گیا لیکن میوکلینک آسٹریلیا کے ۷۵۰ مریضوں پر دعا کا کوئی اثر نظر نہیں آیا۔ بہر حال جو نتیجہ انہوں نے نکالا ہے وہ یہ ہے کہ فرماں روائی تو عقلیت پسندی کی ہے لیکن دعائیں بھی ایک ضرورت پوری کرتی ہیں:

(Rationaliyy Reigns,But Prayers can still serve a need)

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ہستی پر قبولیت دعا سے بڑھ کر اور کوئی دلیل نہیں جو انسان کو مطمئن کر سکے۔ مذہب کی جان اور روح دعا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دعا کے موضوع پر نہایت

عارفانہ انداز میں اپنے ذاتی تجربات کی بناء پر روشنی ڈالی ہے۔آپؑ فرماتے ہیں:

''میں سچ کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری چلّا ہٹ ایسی ہی اضطراری ہوتو وہ اس کے فضل اور رحمت کو جوش دلاتی ہے اور میں اپنے تجربہ کی بناء پر کہتا ہوں کہ خدا کے فضل اور رحمت کو جو قبولیت دعا کی صورت میں آتا ہے میں نے اپنی طرف کھنچتے ہوئے محسوس کیا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ دیکھا ہے۔ ہاں آج کل کے زمانہ کے تاریک دماغ فلاسفر اس کو محسوس نہ کرسکیں یا نہ دیکھ سکیں تو یہ صداقت دنیا سے اٹھ نہیں سکتی اور خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ میں قبولیت دعا کا نمونہ دکھانے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔''

(مرزا غلام احمد قادیانی اپنی تحریرات کی رو سے صفحہ ۶۳۱)

پس دعا کا تعلق باریک روحانی امور کے ساتھ ہے۔اس کی قبولیت اور عدم قبولیت روحانی قوانین کے تابع ہے۔اسی طرح جیسے دوا کے اثر کرنے کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں۔لہذا گیلپ وغیرہ کے فلسفیانہ سروے کی بنیاد پر دعا کی تاثیر کا فیصلہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی ایسا شخص جس نے زندگی میں خود کوئی پھل نہ چکھا ہو لوگوں سے پوچھ گچھ کر کے مختلف پھلوں کے مزوں کو بیان کرنے کی کوشش کرے۔

(الفضل انٹرنیشنل 4.7.03)

چوہوں پر کئے گئے دلچسپ تجربات

حال ہی میں چوہوں پر کچھ دلچسپ تجربات کئے گئے ہیں جن کے نتائج انسانوں پر بھی منطبق کئے گئے ہیں ۔ایک تجربہ یہ کیا گیا کہ ہم عمر جوان چوہوں کے دو گروپ بنائے گئے ۔ایک گروپ کو متناسب غذا با قاعدگی سے صرف اتنی مقدار میں دی گئی جو صرف ان کی بدنی ضرورت کے لئے کافی ہو اور جس سے ان کا وزن نہ بڑھنے پائے ۔دوسرے گروپ کو وہی غذا بافراغت مہیا کی گئی کہ جب چاہیں اور جتنا کھائیں یعنی خوب عیش کریں ۔تجربہ سے پتہ چلا کہ پہلے گروپ کے چوہوں نے لمبی عمریں پائیں جب کہ دوسرے گروپ کے چوہے اپنے حصہ کا رزق جلدی جلدی وقت بے وقت کھا کر جلدی اس دنیا سے کوچ کر گئے ۔دوسرے تجربہ میں دونوں گروپوں کو ایک جیسی غذا مہیا کی گئی لیکن ایک گروپ کے چوہوں کو مختلف طریقوں سے پریشان کیا جاتا رہا جب کہ دوسرا گروپ سکون سے اپنی زندگی بسر کرتا رہا۔اس تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ پریشان رکھے جانے والوں کے بچے تعداد میں دوسرے گروپ کی نسبت بہت کم پیدا ہوئے اور ان کے بچوں کی حرکتوں سے بھی اضطراب ظاہر ہوتا تھا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ عورتوں میں بچے نہ ہونے کی ایک وجہ ان کا گھر کے اندر یا باہر کا Stress ہے لہذا پرسکون گھرانے خوش قسمت ہوتے ہیں جب کہ ایسے گھرانے جن میں ہر وقت لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اور گھر کھچاؤ اور تناؤ کا شکار ہوتا ہے وہ خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں اور اپنی پریشانیوں اور اضطراب کو اپنی آئندہ نسلوں میں بھی منتقل کر دیتے ہیں ۔

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں امور کے بارہ میں فرمایا تھا کہ مومن اس لئے کھاتا ہے تا زندہ رہے اور کافر اس لئے زندہ رہتا ہے تا کھائے ۔نیز فرمایا کہ تم میں سے سب

سے اچھا وہ ہے جو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اچھا ہے اور میں تم میں سے سب سے اچھا ہوں ۔بعض لوگ اپنے گھر کے ماحول کو خوشگوار بنانے کے بجائے اپنا سکون باہر دوستوں اور سہیلیوں میں تلاش کرتے ہیں اوران میں مقبول ہونے کے لئے کوشاں رہتے ہیں ۔ان کے لئے اس میں سبق ہے ۔قرآن کے مطابق اللہ نے میاں بیوی کے درمیان موّوت ورحمت رکھ دی ہے اوراسی میں زندگی کا سکون ہے۔خدافرماتا ہے

”اوراس کے نشانوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس میں سے تمہارے لئے جوڑے بنائے ہیں تا کہ تم ان کی طرف سے تسکین حاصل کرو اورتمہارے درمیان پیار اوررحم کا رشتہ پیدا کیا ہے ۔اس میں فکر کرنے والےلوگوں کے لئے بڑےنشان ہیں“(الروم:۲۲)

(الفضل انٹرنیشنل27.12.96)

حملہ آور بکٹیریا اور پودوں کی ایک دوسرے کے خلاف جنگی چالیں

آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی کے ریسرچ سکالرز نے عملی تجربات سے معلوم کیا ہے کہ پودے اپنے دشمن بکٹیریا کے حملہ کو ناکام بنانے کے لئے دلچسپ جنگی چالیں چلتے ہیں۔ پودے اپنے دوستوں اور دشمنوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ دشمن بکٹیریا کا طریق یہ ہے کہ حملہ کرنے کے لئے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ سپاہی جمع ہوتے رہتے ہیں اور سبھی ایک دوسرے سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ جب وہ اتنی طاقت جمع کر لیتے ہیں کہ سمجھتے ہیں کہ اب حملہ کامیاب ہوسکتا ہے تو ایک کیمیکل کی صورت میں سگنل چھوڑتے ہیں جن سے ان کا جارحیت والا جین (Gene) فعال ہوتا ہے اور وہ اکٹھے ہو کر پودے کی جڑوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ لیکن مقابل پر پودے بھی بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ ان کو دشمن کی نگرانی (Surveillance) اور دشمن کے سگنل کے بالمقابل اسی قسم کا سگنل جاری کرنے اور دشمن کا مقابلہ کرنے اور اسے فنا کرنے کا نظام عطا ہوا ہے۔ چنانچہ جب پودے دیکھتے ہیں کہ دشمن حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے تو جو سگنل ایک کیمیکل پیدا کر کے وہ دیتے ہیں اسی قسم کا سگنل پودا چھوڑ کر دشمن کے سگنل کو خلط ملط (Confuse) کر دیتا ہے اور دشمن سمجھتا ہے کہ اس کے پاس کامیاب حملہ کے لئے درکار طاقت جمع ہو گئی ہے اور وہ خام (Premature) حالت ہی میں حملہ کر بیٹھتا ہے جس کے نتیجہ میں پودے سے مار کھا جاتا ہے اور مٹ جاتا ہے۔

ملبورن کے ایک فورم Fresh Science 2003 میں ڈاکٹر Mathesius نے

بتایا کہ انہوں نے یہ تجربہ الفلفا (Alfalfa) قسم کے پودے پر کئے ہیں۔انہوں نے مصنوعی طور پر وہ کیمیکل بنائے جن کے ذریعہ دوست اوردشمن بکٹیریا سگنل دیتے ہیں۔یہ پودے ۲۵۰۰ اقسام کے پروٹین بناتے ہیں جن میں سے ۱۵۰ پران سگنلز کا اثر پایا جاتا ہے جن میں سے اکثر کا تعلق پودہ کے دفاعی نظام سے تھا۔وہ کہتے ہیں ہمیں ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ یہ پودے ایسی ذہانت اور سمجھ بوجھ کے ساتھ دشمن کے خلاف اپنا دفاع کرتے ہوں گے۔اب تک کسی کو یقینی طور پر یہ پتہ نہ تھا کہ پودوں کا جاسوسی نظام اتنا شاندار ہوگا کہ وہ دشمن کے منصوبہ کا چوری چھپے پتہ لگا لیتے ہیں اور وسیع پیمانہ پر فوری طور پر جوابی کاروائی کرتے ہیں۔

اس تحقیق کے نتیجہ میں پودوں کو بکٹیریا کے حملوں سے بچانے کے لئے نئے طریق وضع کئے جاسکیں گے اور ایسے کیمیکلز بنائے جاسکیں گے جن کو سپرے کر کے بکٹیریا کو دھوکہ دے کر حملوں سے باز رکھا جائے۔یا پھر ایسے پودے بنائے جاسکیں گے جو خود اپنے اندر ہی ایسے کیمیکلز کے سگنل چھوڑ سکیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کہتے ہیں کہ جب آپ کسی پودہ کو دیکھتے ہیں تو بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ کچھ کام وام نہیں کرتا۔لیکن اگر بغور زمین کے اندر پوشیدہ جڑوں کو دیکھیں تو تب پتہ لگتا ہے کہ کتنا پچیدہ نظام ہے جو پیچھے کام کررہا ہے۔لگتا ہے کہ پودے اندھے نہیں ہیں بلکہ دیکھتے اور سنتے اور بولتے ہیں۔ (ماخوذ از سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۱ راگست ۲۰۰۳ء)

سبحان اللہ! کون پڑھ سکتا ہے سارا دفتر ان اسرار کا۔اللہ تعالیٰ نے پودہ کی جڑ، تنا، شاخوں اور پتوں وغیرہ میں کیسا شاندار نظام جاری فرما دیا ہے جس کے بغیر کوئی چھوٹے سے چھوٹا بوٹا بھی نہ اگ سکتا ہے نہ پھل پھول سکتا ہے۔تبھی تو کھیتوں کے مالک نے فرمایا ''اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ○ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ○ (الواقعہ ۶۴۔۶۵) بھلا بتاؤ تو سہی کہ جو کچھ تم کاشت کرتے ہو کیا تم ہی ہو جو اسے اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔

کیوں نہیں اے ہمارے پیارے خالق و مالک! ہمیں تسلیم ہے کہ آپ ہی اگانے والے ہیں ہم کون اگانے والے ہوتے ہیں سچ ہے :

ؔ مالی دا کم پانی دینا بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھل پھل لاؤنا لاوے یا نہ لاوے

(الفضل انٹرنیشنل 24.10.03)

شیر دل چوہوں کی نسل

چوہے عام طور پر محتاط قسم کی مخلوق سمجھی جاتی ہے۔ لیکن سائنسدانوں نے اس کی خلقت میں تبدیلی کر کے اس کو نڈر اور بے خوف بنا دیا ہے۔ اس کے دماغ میں سے وہ جین (Gene) تلاش کر کے نکال دیا ہے جو احتیاط اور خوف کو پیدا کرتا ہے۔ تبدیلی شدہ چوہے اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح بلّیوں اور سانپوں وغیرہ سے کوئی خوف نہیں کھاتے۔ نہ وہ اب ان نظاروں اور آوازوں سے ڈرتے ہیں جن سے پہلے ڈرا کرتے تھے۔

یہ تحقیق ہارورڈ یونیورسٹی کے ہاورڈ ہیوز میڈیکل انسٹیٹیوٹ (Howard Hughes Medical Institute) اور البرٹ آئن سٹائن کالج آف میڈیسن نے مل کر کی ہے۔

اس تحقیق کا مفید پہلو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایسی دوائیں تیار کی جاسکیں گی جن کے استعمال سے فکر اور تشویش سے پیدا ہونے والی امراض کا علاج کیا جاسکے گا۔

(سڈنی ہیرلڈ ۱۹/اکتوبر ۲۰۰۵ء)

لیکن اس ریسرچ کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ اب انسان کے دماغ سے بھی ایسا جین تلاش کر کے نکالا جاسکتا ہے جس کے نتیجہ میں احتیاط، خوف، غم اور رحم وغیرہ کے جذبات سے انسان محروم ہو جائے اور کوئی ہٹلر یا چنگیز خان ایسا نکل سکتا ہے جو ڈر اور خوف سے عاری لڑاکا سپاہیوں کی فوج تیار کر لے اور دنیا کو تباہ کر ڈالے۔ اگرچہ فی الحال یہ سائنس فکشن ہی لگتا ہے لیکن اس کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ خبر میں ذکر ہے کہ چوہوں والا تجربہ انسانوں پر بھی کیا جاسکتا ہے۔

مختلف انواع میں جینز کا ہی فرق ہوتا ہے۔حیوانوں اور انسانوں کے جینز کس قدر اہمیت کے حامل ہوتے ہیں وہ اس سے ہی ظاہر ہے کہ چوہے کے دماغ میں سے صرف ایک جین نکال دینے کے بعد وہ اتنا نڈر ہو جاتا ہے کہ بلّی جسے شیر کی خالہ کہا جاتا ہے وہ اس پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چوکتا۔ بہت سے جینز انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہوتے ہیں اور تھوڑے سے جینز کے فرق کے ساتھ ایک حیوان کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ انسان اور چوہے دونوں میں تیس تیس ہزار جینز ہوتے ہیں جن میں سے ۲۹۷۰۰ مشترک ہوتے ہیں۔گویا چوہے اور انسان میں صرف تین سو جینز کا فرق ہے جو صرف ایک فیصد ہوتے ہیں۔اتنے تھوڑے فرق سے انسان اشرف المخلوقات بن گیا اور اس کو ایسے اعلیٰ جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی استعدادیں اور قویٰ عطا ہو گئے کہ چوہے کو انسان سے کوئی نسبت ہی نہ رہی۔اب اگر انسان کے جینز میں تبدیلی کر کے اس کی خلقت تبدیل کی گئی تو کون جانے اس کے کیا کیا نتائج وعواقب ظہور میں آئیں گے۔قرآن کریم کے مطابق شیطان ضرور انسان کو خدائی خلقت میں تبدیلی کے لئے اکساتا رہے گا۔چنانچہ شیطان خدا کو کہتا ہے:

”مَیں ضرور انہیں حکم دوں گا تو وہ ضرور اللہ کی تخلیق میں تغیر کر دیں گے“۔(النساء:۱۲۰)

دنیا کو درپیش خطرات

الٰہی نوشتوں کے مطابق دنیا اپنے آخری دور میں سے گزر رہی ہے جس کے بعد خاتمہ ہے یہ خاتمہ کیسے وقوع میں آئے گا۔اس کے بارہ میں سائنسدان مختلف اندازے لگاتے ہیں۔ایک اندازہ جو حال ہی میں برطانیہ کے آنریری ماہر فلکیات Martin Ress نے لگایا ہے وہ پیش خدمت ہے۔آپ کہتے ہیں کہ ایک صدی قبل دنیا کے تباہ ہونے کا امکان ایک فیصد تھا اب بڑھ کر ۵۰ فیصد ہوگیا ہے۔آج سب سے زیادہ خطرہ ایٹمی دہشت گردی (Neuclear Terrorism) سے ہے۔دوسرے نمبر پر بیماریوں کے پھیلنے سے ہے جو ایسے وائرس پیدا کریں جن میں جینیاتی تبدیلیاں مصنوعی طور پر کی گئی ہوں (Deadly Enginered Viruses) پھر فریب کار مشینیں (Rogue Machines) پھر سب سے بڑھ کر خلقت انسانی میں تبدیلیاں جن سے انسان کا کردار ہی بدل جائے اور کوئی اور ہی مخلوق زمین پر قبضہ کر کے انسان کی جگہ لے لے۔یہ خطرناک چیزیں بطور حادثہ بھی انسان کو پیش آسکتی ہیں اور عمداً بھی شرارت سے بنائی جاسکتی ہیں۔

اس بات کا امکان ہے کہ ۲۰۲۰ء تک کوئی دس لاکھ آدمی جراثیمی دہشت گردی (Bio Terrorism) سے ہلاک ہو جائیں۔ابھی ایک صدی پہلے تک ایٹمی خطرہ کے بارہ میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔وہ خطرہ ابھی تک بدستور قائم ہے اور اس کے ساتھ دوسرا خطرہ جینیاتی تبدیلیوں (Genetic Engineering) اور ان خطرناک وائرسوں کو پھیلانے والی دواؤں (Biotech Drugs) کا ہے وہ سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔اس وقت دنیا میں ہزاروں اشخاص ایسے ہیں جو اس قابل ہیں کہ خطرناک ناقابل علاج بیماریاں پھیلانے والے جراثیم بنا سکیں۔کوئی بھی

دیوانہ دنیا میں تباہی مچا سکتا ہے اگر بے شمار لوگ مرنے سے بچ بھی جائیں تو زندگی کے معمولات کو ضرور زیروزبر کر سکتے ہیں۔

ایٹمی طاقت کی ترقی کے لئے جو تجربات کئے جاتے ہیں وہ بھی دنیا کی تباہی کا باعث بن سکتے ہیں ۔مثلاً ایٹم کے ذرات کی رفتار اور طاقت بڑھانے کے لئے جو مشینیں (Particle Accelerator) استعمال کی جاتی ہیں ۔ان کے ذریعے ایسے بلیک ہول کا وجود میں آنا بھی ممکن ہوسکتا ہے جو اردگرد کی سب چیزوں کو اپنے اندر کھینچ کر تباہ کردے ۔قرآن کریم میں آیا ہے چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے اپنی عظیم کتاب (Revelation, Rationality Knowledge and Truth) کے صفحات ۶۱۳ تا ۶۵۳ میں ان کا ذکر فرمایا ہے ان میں ایٹمی جنگ کے خطرات کا بھی ذکر ہے۔جینیاتی تبدیلیوں کے ذریعے خدا کی پیدائش میں تبدیلیاں لانے کا بھی اور ایڈز اور طاعون جیسی بیماریوں کا بھی ۔اسی کتاب کے صفحہ ۴۸۷ پر خدا کی اس وعید کا بھی ذکر ہے کہ ہم انسانوں کو بدل کر زمین پر ایک اور مخلوق لانے پر بھی قادر ہیں چنانچہ خدا فرماتا ہے۔''ہم نے ہی ان انسانوں کو پیدا کیا ہے اوران کے جوڑ بند مضبوط بنائے ہیں اور جب ہم چاہیں گے ان کی صورتیں یکسر تبدیل کر دیں گے۔'' (الدھر: ۲۹) جب انسان خدا سے بغاوت کریں گے تو پھر اس انجام سے دوچار تو ہوں گے۔

(الفضل انٹرنیشنل 2.6.03)

یہودیوں کے وجود کو سب سے بڑا خطرہ کس چیز سے ہے؟

ورلڈ جیوئش کانگرس نے اپنی کتاب رپورٹ میں کہا ہے کہ یہودیوں کے وجود کو سب سے بڑا خطرہ غیروں کی طرف سے نہیں ہے بلکہ غیروں میں رشتے ناطے کر کے یہودیوں سے باہر نکلنے کا ہے انہوں نے کہا ہے کہ یہودی اپنی بقاء کے خطرہ سے دوچار ہیں (Endangered Species) اور اپنی روح اور شناخت کے اعتبار سے ایک بحران کا سامنا کر رہے ہیں۔
(A People in a Crisis of Spirit and Identity) رپورٹ کے مطابق آج دنیا میں ۱۳ ملین یہودی ہیں جبکہ ہولوکاسٹ (Holocaust) کے وقت یعنی جنگ عظیم دوم سے پہلے ان کی تعداد ۱۸ ملین تھی۔ ان میں سے ۵ء۸ ملین امریکہ میں ۴ء۶ ملین اسرائیل میں رہتے ہیں۔ آسٹریلیا میں ان کی تعداد پچھلے دس سال سے ۹۰ ہزار پر ٹھہری ہوتی ہے۔

یہودیوں کے دستور کے مطابق یہودیوں سے باہر رشتہ کرنے والے یہودیت سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق ۱۲۰۰ یہودی لیڈروں میں سے ۷۷ فیصد یہ کہتے ہیں کہ غیروں رشتہ کرنے والوں کو یہودیت کے اندر رہنے کی ترغیب دلانی چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں ہم غیر یہودیوں میں رشتہ کرنے کے خلاف ہیں لیکن جو لوگ باز نہیں آتے اگر ان کو یہودیت سے خارج کرتے گئے تو ہم ختم ہو جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں دنیا کے ہر ملک میں یہودیوں کی تعداد (سوائے اسرائیل کے) مسلسل گرتی جا رہی ہے۔ (الفضل انٹرنیشنل 31.1.91)

لعاب دہن۔ پورے وجود کا نمائندہ

ہارورڈ یونیورسٹی کے سکالرز کہتے ہیں کہ انسان کا منہ اس کے وجود کی کھڑکی کی طرح ہے جس میں جھانک کر گھر کے اندر کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے۔ لعاب دہن ایک رنگ میں پورے وجود کا نمائندہ ہے اور جسم کے تمام اعضاء کی کیفیت اور کارکردگی کا آئینہ دار ہے۔ منہ کے اندر بے شمار انواع واقسام کے اربوں بیکٹیریا، وائرس، مائیکروب، خمیری مادے اور نمکیات پائے جاتے ہیں۔ یہ ننھی مخلوق دو طرح کی ہے ایک وہ ہے جو صحت دینے والی ہے اور دوسری بیماری پیدا کرنے والی ہے لیکن یہ بھی ایک رنگ میں انسان کی خدمت کرتی ہے کیونکہ وہ اپنی ہی قسم کے مضر بیکٹیریا کو جو کھانے پینے کے ساتھ منہ میں داخل ہوتے ہیں ان کو اسی طرح مار مار کر ہلاک کرتی ہے جس طرح کسی ملک کے پرانے باسی باہر سے آنے والے حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مفید صحت بیکٹیریا ہر آن مضر صحت بیکٹیریا سے الگ برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ یہ جنگ خوراک، نمی، جگہ اور محفوظ ٹھکانوں کے لئے لڑی جاتی ہے۔ جب بیکٹیریا کا ماحول تبدیل ہوتا ہے یعنی انسان اپنی خوراک تبدیل کرتا ہے، دوائیں بالخصوص اینٹی بائیوٹک استعمال کرتا ہے تو منہ کے ان باسیوں میں بھی ردو بدل ہوتا ہے اور مخالف قوتوں کے توازن میں تبدیلی آتی ہے۔ یہ بکٹیریا منہ کے اندر بے ہنگم انداز سے نہیں رہتے بلکہ اپنی علیحدہ بستیاں بسا کر ترتیب سے رہتے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے ٹھکانے دانتوں کے مسوڑھے اور زبان کا نچلا حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے معائنہ سے جسم کے مختلف اعضاء کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً دانتوں کی بیماریاں، گردے، جگر، معدہ اور پھیپھڑوں وغیرہ کی خرابی۔ اور دوسرے اعضاء کی خرابی، چنانچہ اس انکشاف نے بیماریوں کی تشخیص اور ان کے علاج کا نیا باب کھول دیا ہے۔ کوشش ہوگی کہ صحت بخش بیکٹیریا کی مدد کی جائے اور مضر صحت بیکٹیریا کو دبایا جائے اور مضر صحت بیکٹیریا کو

دبایا جائے۔ابھی یہ تحقیق ابتدائی مراحل میں ہے لیکن پھر بھی ۶۱۵ قسم کے بیکٹیریا منہ کے اندر معلوم ہوچکے ہیں اور مزید ہورہے ہیں۔

(بحوالہ سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۷ / مارچ ۲۰۰۳ء)

اس خبر میں دو پہلو خاص دلچسپی کے حامل ہیں۔ایک تو یہ کہ رحمان خدا نے اربوں ننھے مزدور ہمارے منہ کے اندر ہماری خدمت میں لگا رکھے ہیں جن کے بغیر شاید ہم زندہ ہی نہ رہ سکتے۔دوسری بات یہ کہ لعاب دہن ایک رنگ میں انسان کے سارے اعضاء اور ان کے حالات کی نمائندگی کرتا ہے جو لوگ پورے طور پر خدا کے ہوجاتے ہیں خدا ان کا ہوجاتا ہے اور ان کے ذریعہ اپنے نشانات ظاہر فرماتا ہے۔ان کے وجود کے ہر عضو میں،ان کے چھونے میں،لباس میں اور لعاب دہن میں برکت رکھ دیتا ہے۔جس کو جب وہ چاہے اور جس کے لئے چاہے اقتداری معجزہ دکھا دیتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

”اگر تم اپنے نفس سے درحقیقت مر جاؤ گے۔تب تم خدا میں ظاہر ہو جاؤ گے اور خدا تمہارے ساتھ ہوگا اور وہ گھر بابرکت ہوگا جس میں تم رہتے ہوگے اور ان دیواروں پر خدا کی رحمت نازل ہوگی جو تمہارے گھر کی دیواریں ہیں اور وہ شہر بابرکت ہوگا جہاں ایسا آدمی رہتا ہوگا۔“

(رسالہ الوصیت صفحہ ۱۰)

انبیاء و اولیاء کی زندگیوں میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن میں ان کے محض چھونے سے، کپڑوں سے یا لعاب دہن سے لوگوں نے برکت پائی اور بیماروں نے صحت پائی حضرت مرزا بشیر احمدؓ نے اس طرح کا ایک دلچسپ واقعہ یوں بیان فرمایا ہے:

”مسماۃ امۃ اللہ بی بی سکنہ علاقہ خوست مملکت کابل نے مجھ سے بیان کیا کہ جب وہ شروع شروع میں اپنے والد اور چچا سیّد صاحب نور اور سیّد احمد نور کے ساتھ قادیان آئی تو اس کی عمر بہت چھوٹی تھی اور اس کے والدین اور چچا چچی حضرت سید عبداللطیف صاحب شہیدؓ کی شہادت کے بعد قادیان چلے آئے تھے۔ مسماۃ امۃ اللہ کو بچپن میں آشوبِ چشم کی سخت شکایت ہوجاتی تھی اور آنکھوں کی تکلیف اس قدر بڑھ جاتی تھی کہ انتہائی درد اور سرخی کی شدت کی وجہ سے وہ آنکھ

کھولنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔اس کے والدین نے اس کا بہت علاج کرایا مگر کچھ آفاقہ نہ ہوا اور تکلیف بڑھتی گئی۔ایک دن جب اس کی والدہ اسے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں دوائی ڈالنے لگی تو وہ ڈر کر یہ کہتے ہوئے بھاگ گئی کہ میں تو حضرت صاحب سے دم کراؤں گی۔ چنانچہ وہ بیان کرتی ہے کہ میں گرتی پڑتی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے گھر پہنچ گئی اور حضور کے سامنے جا کر روتے ہوئے عرض کیا کہ میری آنکھوں میں سخت تکلیف ہے اور درد اور سرخی کی شدت کی وجہ سے میں بہت بے چین رہتی ہوں اور اپنی آنکھیں تک نہیں کھول سکتی آپ میری آنکھوں پر دم کر دیں۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دیکھا تو میری آنکھیں واقعی خطرناک طور پر ابلی ہوئی تھیں اور میں درد سے بے چین ہو کر کراہ رہی تھی۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی انگلی پر اپنا تھوڑا سا لعاب دہن لگایا اور لمحہ کے لئے رک کر (جس میں شائد حضور دل میں دعا کر رہے ہوں گے) بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ اپنی یہ انگلی میری آنکھوں پر آہستہ آہستہ پھیر دی اور پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا! ’’بچی جاؤ اب خدا کے فضل سے تمہیں یہ تکلیف پھر کبھی نہیں ہوگی۔‘‘

(روایت مسماۃ امتہ اللہ بی بی مہاجرہ علاقہ خوست)

مسماۃ امتہ اللہ بیان کرتی ہے کہ اس کے بعد آج تک جب کہ میں ستر سال کی بوڑھی ہو چکی ہوں کبھی ایک دفعہ بھی میری آنکھیں دکھنے نہیں آئیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دم کی برکت سے میں اس تکلیف سے بالکل محفوظ رہی ہوں۔حالانکہ اس سے پہلے میری آنکھیں اکثر دکھتی رہتی تھیں اور میں نے بہت تکلیف اٹھائی تھی۔وہ بیان کرتی ہے کہ جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنا لعاب دہن لگا کر میری آنکھوں پر دم کرتے ہوئے اپنی انگلی پھیری تو اس وقت میری عمر صرف دس سال تھی گویا ساٹھ سال کے طویل عرصہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس روحانی تعویذ نے وہ کام کیا جو اس وقت تک کوئی دوائی نہیں کر سکتی تھی‘‘

(سیرۃ حضرت مسیح موعودؑ پر حضرت قمر الانبیاء صاحبزادہ مرزا بشیر احمدؓ کی چار تقریریں صفحہ ۳۶۸)

(الفضل انٹرنیشنل 27.6.03)

کیا ایک اور جہان Antimatter کا بھی ہے؟

ہماری کائنات مادہ یعنی Matter سے بنی ہوئی ہے جس میں سو کے قریب عناصر (Elements) ہیں جیسے کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن، لوہا، سونا وغیرہ۔ سائنس دانوں کا خیال تھا کہ ایک اور کائنات ایسی بھی ہونی چاہیئے جو اس کا الٹ ہو جس طرح شیشہ میں عکس ہوتا ہے۔ یعنی اینٹی میٹر (Antimatter) کی بنی ہوئی ہو۔ اس خیال کو سائنس فکشن کا موضوع بنایا گیا چنانچہ ایک سلسلہ وار فلم سٹار ٹریک (Star Track) میں ری ایکٹر کا ایندھن اینٹی میٹر سے بنا ہوا دکھایا گیا تھا۔ مادہ اور اس کا الٹ یعنی Matter and Antimatter جب اکٹھے ہوتے ہیں تو دونوں مٹ جاتے ہیں اور عظیم الشان طاقت Energy میں بدل جاتے ہیں۔

خبر آئی ہے کہ سائنس دان پہلی بار اینٹی ہائیڈروجن ایٹم بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہائیڈروجن ایٹم سب سے سادہ ایٹم ہے جس کے مرکز میں مثبت بجلی کا حامل اینٹی پروٹون اور باہر الگ اینٹی الیکٹرون یا (Positron) جو مثبت بجلی کا حامل ہوتا ہے۔ اگر سائنس دان ایک پروٹون ہوتا ہے اور اس کے اردگرد گھومنے والا ایک منفی بجلی کا حامل اینٹی میٹر بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس سے طاقت ور ہتھیار بنانے کا ایک اور ذریعہ ان کے ہاتھ آ جائے گا۔

اس تحقیق کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ سائنس دانوں کو یقین ہے کہ جہاں ہماری کائنات مادہ کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہے وہاں ایک اور اتنی ہی بڑی کائنات اینٹی میٹر کی بھی ہے اور اگر کبھی دونوں اکٹھے ہو جائیں تو دونوں صفحہ ہستی سے نابود ہو جائیں گے اور پیچھے ایک ایسی عظیم طاقت رہ جائے گی جس کا اندازہ لگانا کسی سائنس دان کے بس میں نہیں۔

کائنات میں ہر چیز جوڑوں کی شکل میں پیدا کی گئی خواہ اس کا تعلق عالم جمادات سے ہو، عالم نباتات سے ہو یا عالم حیوانات سے۔قرآن کریم نے چودہ سو سال قبل یہ عظیم الشان سائنسی انکشاف کر دیا تھا کہ ''وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ o''(الذاریات:۵۰) کہ ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔لہذا جہاں کائنات کی ہر چیز جوڑوں کی صورت میں بنائی گئی ہے کیا عجب ہے کہ خود کائنات کا بھی جوڑا ہو۔حقیقت تو یہ ہے کہ جوڑا ہونا مخلوقیت کی دلیل ہے۔ سورۂ اخلاص ہمیں یہی بتاتی ہے کہ وہ صرف خدا ہی ہے جو اپنی نوع اور جنس میں اکیلا ہے۔وہی ہے جو اپنی ذات کے لئے کسی سہارے کا محتاج نہیں بلکہ دوسری ہر چیز اپنے وجود میں آنے اور قائم رہنے کے لئے اس کے سہارے کی محتاج ہے۔وہی ہے جو علت العلل ہے۔اس کے سوا ہر چیز اپنے وجود میں آنے کے لئے کسی وجہ (Cause) کی محتاج ہے۔اس کی نوع یا جنس سے نہ اس سے پہلے کوئی تھا اور نہ بعد میں کوئی ہوگا اور حقیقت تو یہی ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جو حقیقی طور پر اس کی طرح کی اس جیسی یا اس کی ہم پلہ ہو۔ہر مخلوق چیز کا جہاں ایک آغاز ہے وہاں اس کا انجام بھی ہے اور وہ اجل مسمّٰی (وقت مقررہ) کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔گویا وقت اور عمر کے ساتھ بندھے ہونا بھی مخلوق ہونے کی دلیل ہے۔خالق کا اس پہلو سے بھی کوئی کفو نہیں۔وہی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔اس عظیم سورۃ میں مخلوقیت کی کھوٹ سے خدا تعالیٰ کو خالص کر کے دکھایا گیا ہے اور اس کی ایسی تنزیہی صفات کو پیش کیا گیا ہے جنہوں نے خدا کو مخلوقیت کی ہر صفت سے منزہ قرار دے کر اس کی خالص توحید کو پیش کیا ہے۔

فَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْم.

(الفضل انٹرنیشنل 24.5.96)

گرمی سردی میں سفر کرنے والے پرندوں کو خدا نے گھڑی مقناطیسی قطب نما اور رستہ کا نقشہ ودیعت کیا ہوتا ہے

''آسٹریلین جرنل آف زوآلوجی'' میں ایک دلچسپ تحقیق شائع ہوئی ہے جو آسٹریلین، جرمن اور امریکن سائنس دانوں کی مشترکہ محنت کا ثمر ہے۔ اس ٹیم کے سربراہ یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی سڈنی کے Dr.Ursula Munro تھے۔ انہوں نے یہ راز معلوم کیا کہ پرندے گرمی سردی کے لمبے سفر طے کر کے واپس اپنے ٹھکانوں پر کیسے پہنچ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ حیران کن انکشاف ہوا ہے کہ قدرت نے ان کے ننھے، دماغوں میں بالکل صحیح وقت بتانے والی گھڑی، ایک مقناطیسی قطب نما اور ایک راستے کا مفصل نقشہ ودیعت کر رکھا ہے۔

انہوں نے دیکھا کہ وہ ننھے پرندے جو تسمانیہ آسٹریلیا کے علاقہ میں پائے جاتے ہیں جو جسم میں چڑیا سے بھی چھوٹے ہیں اور جن کو وہاں Tasmanian Silvereyes کہا جاتا ہے وہ ہر سردی کے موسم میں تسمانیہ سے کوئنز لینڈ (Queensland) کے شمال میں اڑ کر پہنچ جاتے ہیں۔ تسمانیہ میں بہت سردی پڑتی ہے جب کہ شمالی کوئنز لینڈ گرم علاقہ ہے اور دونوں کے درمیان کوئی چار ہزار کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ یوں یہ چڑیاں جہاں سردی سے اپنی جان بچاتی ہیں وہاں خدا کی وسیع زمین پر اپنا مقدر رزق بھی تلاش کرتی ہیں۔ ان پرندوں کو پیدائش کے بعد بال و پر ملتے ہیں تو اس وقت انہیں ان جگہوں اور رستوں کا علم نہیں ہوتا بلکہ یہ لمبا سفر طے کرنے کے لئے ایک طرف تو اپنی جبلت (Instinct) سے کام لیتی ہیں اور دوسری طرف اپنے بڑوں کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

سائنس دانوں کو معلوم ہوا ہے کہ ان پرندوں کے سروں میں مقناطیسی ذرات (Magnetic Particles) پائے جاتے ہیں جن کا تعلق ایک طرف تو ان کی آنکھوں کے اعصاب (Nerves) ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ بطور قطب نما کے کام کرتے ہیں۔ رستہ کے نقشہ کو ذہن میں محفوظ کرنے کا تعلق بھی انہیں سے ہوتا ہے۔ یہ قطب نما اتنی حساس واقع ہوئی ہے کہ زمینی مقناطیس میں جو تبدیلی مختلف مقامات میں ہوتی ہے یہ اس کو بھی معلوم کر سکتی ہے۔ اور اسی ارضی مقناطیس کی تبدیلی سے وہ مختلف مقامات کے درمیان فاصلوں کا اندازہ بھی کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے پرندے بغیر یہ جانے ہوئے کہ کہاں جا رہے ہیں شمال کی طرف سفر شروع کر دیتے ہیں اور واپسی پر جنوب کی طرف لیکن یہ کمپاس (Compass) صرف سورج کی روشنی اور زمین کی قدرتی مقناطیس میں کام کرنے کے لئے ہی ڈیزائن کی گئی ہے۔ چنانچہ اگر پرندوں کے راستہ میں سرخ روشنی پیدا کر دی جائے یا کوئی بڑا مصنوعی مقناطیس رکھ دیا جائے تو یہ پریشان (Confuse) ہو کر راستہ بھول جاتے ہیں اور ان کا شمال جنوب کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

(بحوالہ سڈنی ہیرلڈ ۲۸ جولائی ۱۹۹۷ء)

اللہ کی کیا قدرتیں ہیں کہ ہر مخلوق کو اس کے مناسب حال قویٰ بھی دیئے ہیں اور ان کو استعمال کرنے کے لئے جبلی استعدادیں بھی عطا کی ہیں۔ یہ ننھے پرندے سردی گرمی سے اپنی جان کی حفاظت کے لئے اور خدا کی زمین میں اپنا رزق تلاش کرنے کے لئے کتنے دور دراز کے سفر اختیار کرتے ہیں۔ خدا نے قرآن کریم میں پرندوں کے پروں کو پھیلانے اور سمیٹنے اور فضا میں اڑنے کو بھی اپنا نشان قرار دیا ہے اور اس پر غور کرنے کا ارشاد فرمایا ہے۔

(الملک: ۲۰، النحل: ۸۰)

علاوہ ازیں سورہ الفیل میں گرمی سردی میں سفروں کو جاری رکھنے کی توفیق ملنے، خوف سے بچانے اور بھوک میں کھانا عطا کرنے کو بھی اپنا فضل و احسان قرار دیا ہے اور اس پر رب کعبہ کا شکر بجالانے کا حکم دیا ہے۔ پس اگر کسی کو رزق کی تلاش میں دور دراز سفر کرنے کی توفیق ملے اور کئی قسم کے خوفوں سے نجات بھی ملے تو یہ خدا کا ایسا فضل ہے جس کو یاد رکھنا اور اس پر خدا کا شکر بجالاتے رہنا اطاعت خداوندی ہے۔ پر اس کی توفیق دینا بھی تو اسی پر منحصر ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 5.12.97)

نیوساؤتھ ویلز میں انسانوں اور حیوانوں کی کلوننگ اور انسانوں کو حیوانوں کے ساتھ مخلوط کرنے پر پابندی

سکاٹ لینڈ کے سائنس دانوں نے ایک بھیڑ کی کلوننگ کر کے دنیا کو حیران و پریشان کر دیا ہے۔لوگ ڈرنے لگے ہیں کہ کل کلاں سرکاری یا پرائیویٹ طور پر کہیں انسانوں کی بھی کلوننگ نہ ہونے لگے۔ نیز یہ کہ انسانی سپرم کو حیوانوں جیسے گوریلا یا سوروں کے ساتھ مخلوط کر کے کوئی ایسی مخلوق نہ وجود میں آجائے جو حیوانوں اور انسانوں کے درمیان ہو۔ یہاں کی کئی تنظیموں نے اس طرح کے امکانات پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ نیوساؤتھ ویلز آسٹریلیا کے وزیر صحت نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا ہے کہ حکومت ایسے قوانین بنا رہی ہے جن کی رو سے نہ انسانوں اور حیوانوں کی کلوننگ ہو سکے گی اور نہ سڈنی کی تجربہ گاہوں سے کوئی ایسی مخلوق برآمد ہو سکے گی جو نیم انسان اور نیم حیوان ہو۔

(ہیرلڈ ۱۸/اپریل ۱۹۹۷ء)

اچھی بات ہے ۔قرآن بھی خدا کی خلقت میں تبدیلی کرنے کو شیطانی کام قرار دیتا ہے۔یوں بھی دنیا میں نیم انسانوں،نیم حیوانوں کی تعداد پہلے کونسی تھوڑی ہے بلکہ بہت ہیں جو اَسۡفَلَ سَافِلِیۡنَ ہونے کی وجہ سے حیوانوں سے بھی نیچے گرے ہوئے ہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 5.12.97)

سڈنی کے قریب پہاڑوں کے نیچے کچھ نئی غاریں دریافت ہوئی ہیں

سڈنی کے نزدیک Blue Mountain کے علاقہ میں پہاڑوں کے نیچے کچھ غاریں واقع ہیں۔ان کو Jenolan Caves کہتے ہیں اور سیاح دور دور سے انہیں دیکھنے کے لئے آتے ہیں ۔غاروں کے اندر سخت ٹھنڈے پانی کے نالے اور تالاب وغیرہ بھی ہیں اور پانی کے کٹاؤ نے پتھروں کو عجیب وغریب شکلیں دے دی ہیں ۔ان ٹورسٹ غاروں کے کافی نیچے جا کر غاروں کا ایک اور سلسلہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے۔ماہرین کا اندازہ ہے کہ نئی غاروں کا پرانی غاروں کے ساتھ کوئی رابطہ کہیں ہونا چاہئے اگر وہ رابطہ دریافت ہو جائے تو پرانی اور نئی غاروں کی مجموعی لمبائی کوئی ۳۱ کلومیٹر ہو جائے گی اور اتنی لمبائی کی کوئی غار آسٹریلیا میں پہلے دریافت نہیں ہوئی ۔چوبیس آدمی جو نئی غاروں کے اندر گئے ہیں بتاتے ہیں کہ وہاں کا پانی شدید سرد ہے۔درجہ حرارت کوئی دس درجے ہے۔ اور اندر ایسی گھٹن ہے کہ پتہ ہی نہیں لگتا تھا کہ ہمارا رخ اوپر کی طرف ہے یا نیچے کی طرف یا کس سمت ہے۔وہ بہر حال اپنے کام کے ماہر تھے اور اپنا پورا ساز وسامان ساتھ لے کر گئے تھے۔

سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ دریافت اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے ہمیں یہ پتہ کرنے میں رہنمائی ملتی ہے کہ اس قسم کی غاریں کس طرح وجود میں آئی تھیں ۔ان کا خیال ہے کہ ۲۰۰ ملین (۲۰ کروڑ) سال تک پانی بڑے دباؤ کے ساتھ اس جگہ بہتا رہا اور اس نے پہاڑوں کو کاٹ کر یہ غاریں بنائی ہیں۔پانی کو جدھر راستہ ملتا گیا وہ جگہ بناتا گیا اور اس طرح یہ غاریں بھول بھلیوں کی شکل

اختیار کرتی گئیں ۔ایک زمانہ میں یہ علاقہ سمندر میں ڈوبا ہوا تھا اور شدید بارشوں اور طوفانوں کی زد میں تھا۔چنانچہ پانی اپنی جولانیوں میں پہاڑوں اور زمین کے نیچے رستے بناتا رہا۔اور جب وہ پیچھے ہٹا تو اپنا ایک حصہ اور نمکیات پیچھے چھوڑ گیا۔دنیا کی اکثر غاریں اسی لئے سمندروں کے اردگرد پائی جاتی ہیں جیسے بحیرہ مردار کے کنارے وادی قمران میں ۔دریائے نیل کے کنارے ناگ حمادی میں اور بحیرہ روم (Mediterranean) کے اردگرد، روم، نیپلز، سائرین، اسکندریہ اور مالٹا وغیرہ میں ۔ہوسکتا ہے کہ کچھ غاریں انسانوں نے بھی اپنے استعمال کے لئے ٹھیک ٹھاک کی ہوں یا بنائی ہوں ۔پرانے زمانہ میں کئی لوگ انہیں چھپنے وغیرہ کے لئے استعمال کرتے تھے جیسے ڈاکو، چور اور غلام ۔نیز وہ لوگ اپنے مردوں کو غاروں کی دیواروں میں دفن کیا کرتے تھے ۔ابتدائی مؤحد عیسائی بھی جب ظلم حد سے بڑھ جاتا تو کچھ عرصہ غاروں کو چھپنے کے لئے استعمال کرتے تھے جن کا ذکر سورۃ کہف میں آیا ہے۔

ایک دفعہ خاکسار کو روم کی غاریں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔بغیر گائیڈ کی مدد کے اندر جا کر بھول بھلیوں میں رستہ تلاش کر کے باہر نکل آنا آج کے زمانہ میں بھی سخت مشکل ہے ۔Jenolan کی غاریں جن کے بارہ میں یہ خبر ہے وہاں بھی ایک بار لندن کے رشید احمد چوہدری صاحب کے ہمراہ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ہم وہاں پہنچے ضرور تھے لیکن غار کے منہ پر ہی بیٹھے رہے۔ہم خود تو اندر غار میں نہیں گئے لیکن دوسرے ساتھی گئے تھے بس ان سے ہی سارا حال احوال پوچھ لیا تھا۔

(الفضل انٹرنیشنل 6.2.98)

آسٹریلیا میں ۳۵ کروڑ سال پرانی مچھلی کا متحجر ڈھانچہ دریافت ہوا

۱۹۷۰ء کی دہائی میں ریاست وکٹوریہ آسٹریلیا کے وسط میں Mt.Howitt کے قریب Monash یونیورسٹی کے پروفیسر جم وارن کو ہزاروں مچھلیوں کے پتھرائے ہوئے ڈھانچے (Fossils) ملے تھے۔ دس سال پہلے ان میں سے ایک مچھلی پر ایک نوجوان طالبعلم جان لانگ نے تحقیق کر کے ثابت کیا تھا کہ اس نے سب سے قدیم مچھلی کو دریافت کیا ہے جو ۳۵۰ ملین سال پہلے آسٹریلیا کے سمندر میں تیرتی پھرتی تھی۔ اس وقت وہ پی ایچ ڈی کا سٹوڈنٹ تھا۔ اس نے اپنا مقالہ مؤقر رسالہ نیچر کو اشاعت کے لئے بھیجا لیکن انہوں نے شائع نہ کیا۔ نوجوان طالب علم دل برداشتہ ہو کر بیٹھ گیا اور اس دوران پرتھ کے میوزیم کا کیوریٹر لگ گیا۔

اب نیچرل ہسٹری میوزیم لندن کے Dr. per Ahlberg نے بھی اس مچھلی پر اپنی علیحدہ تحقیق کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہے جس پر ڈاکٹر جان لانگ پہنچا تھا۔ چنانچہ اب ڈاکٹر لانگ نے ایک سائنٹفک کانفرس میں اپنا مقالہ پیش کیا ہے۔

اگرچہ ۳۵ کروڑ سال پہلے تمام براعظم ساتھ ساتھ ملے ہوئے تھے اور بعد میں پھسل کر دور دور ہو گئے لیکن آسٹریلیا اس زمانہ میں بھی یورپ اور شمالی امریکہ کے دوسری طرف تھا اس وجہ سے اس علاقہ میں حیوانی زندگی کا ارتقاء بھی دوسروں سے کچھ مختلف تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر لانگ کہتے ہیں کہ اس طرح کی شہادتیں مل رہی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے آغاز میں آسٹریلیا ابتدائی ارتقاء کا مرکز رہا ہے اور یہیں سے

ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کی انواع ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر پھیلیں لہذا جو لوگ زندگی کے آغاز وارتقاء میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کو آسٹریلیا کے Fossils سے مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 6.2.98)

ملبورن آسٹریلیا کے سائنس دانوں نے کینسر کا ٹیکہ تیار کر کے آزمائشی طور پر استعمال کرنا شروع کردیا

ملبورن آسٹریلیا کے سائنس دانوں کا دعویٰ ہے کہ دنیا بھر میں پہلی بار انہوں نے چھاتی اور قولون کے کینسر کے لئے ٹیکہ (Vaccine) ایجاد کرلیا ہے اور اب آزمائشی طور پر مریضوں کو لگانا شروع کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ٹیکہ کینسر کی دوسری قسموں کے لئے بھی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

یہ ٹیکہ ایک ادارہ آسٹن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے تیار کیا ہے۔ انہوں نے کینسر سیل سے ایک چیز Mucin لے کر اس میں خمیر (Yeast) کی شوگر جسے Mannan کہا جاتا ہے باہم جوڑ کر (Synthesis) اسے بنایا ہے۔ یہ ٹیکہ جسم کے دفاعی نظام (Immune System) پر کام کرتا ہے اور ٹیومروں کو سکیڑ دیتا ہے۔ اب تک یہ ٹیکہ بطور آزمائش کے تیس مریضوں کو لگایا جاچکا ہے اور اب مزید ایسے مریضوں کو لگایا جائے گا جن کا مرض ابتدائی اسٹیج پر ہے یا زیادہ بڑھ چکا ہے۔ ٹیکہ کے ابتدائی نتائج کی رپورٹ کینبرا کی ایک کانفرس میں پیش کی گئی ہے

(سڈنی ہیرلڈ ۲۱/اگست ۱۹۹۷ء)

اللہ کرے اس موذی مرض کے لئے کوئی مؤثر دوا ڈاکٹروں کے ہاتھ لگ جائے۔

(الفضل انٹرنیشنل 6.2.98)

مینڈکی کوز کام ہو جائے تو ناک دائیں پنجہ سے صاف کرتی ہے یا بائیں سے اور پیٹ میں درد ہو تو کیا کرتی ہے؟

کیا زمانہ آ گیا ہے کہ ہر بات کی کھال اتاری جاتی ہے۔ بظاہر اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ریسرچ ہوتی ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی نئی بات سامنے آتی ہے۔

ایک ایسی ہی ریسرچ رسالہ ''آسٹریلیا نیچر'' میں شائع ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مینڈک کا معدہ خراب ہو جائے یا کوئی زہریلی چیز نگل بیٹھے تو وہ بجائے الٹی کرنے کے پورا معدہ ہی پیٹ سے باہر نکال کر اس کی خوب صفائی کرتا ہے اور پنجوں سے اچھی طرح چھان پھٹک کر کے دوبارہ اندر ڈال لیتا ہے۔ مینڈکوں کا معدہ پیٹ کے وسط میں نہیں بلکہ ایک طرف کو ہٹا ہوا ہوتا ہے جس جھلی سے یہ جسم سے جڑا ہوتا ہے وہ سائز میں دائیں طرف سے چھوٹی اور بائیں طرف سے لمبی ہوتی ہے اس لئے معدہ جب وہ باہر نکالتا ہے تو وہ دائیں طرف کو جھکا ہوتا ہے تا صفائی میں آسانی ہو۔ مینڈک کے پاس معدہ کو صاف کرنے کا اگرچہ انتظام ہے لیکن اس کو استعمال کرنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی ہے۔ بس کبھی کبھار ہی۔

اسی سلسلہ میں ایک اور تحقیق آسٹریلیا اور اٹلی کے سائنس دانوں نے مل کر کی تھی جو بین الاقوامی رسالہ ''نیچر'' میں شائع ہوئی تھی۔ تحقیق طلب معاملہ یہ تھا کہ مینڈک اپنے معدہ اور تھوتھنی (Snout) کو صاف کرنے کے لئے دایاں پنجہ استعمال کرتا ہے یا بایاں اور اس کا تعلق دماغ کی ساخت اور مینڈک کے ارتقاء سے کیا ہے۔ اب تک تو یہی سنتے آئے تھے کہ ''لو جی بی مینڈکی کو بھی

زکام ہوا‘‘ جس سے غالباً یہ مراد تھی کہ وہ جو ہر وقت پانی، نمی اور سردی میں رہے اس کو بھی زکام ہونے لگے تو عجیب بات ہے۔ اب پتہ چلا کہ مینڈک کو نہ صرف زکام ہوسکتا ہے بلکہ وہ اپنے ناک کو صاف بھی کرتا ہے۔ بہرحال ان کی تحقیق نے یہ بتایا کہ یورپ کے مینڈک معدہ اور ناک وغیرہ کی صفائی کے لئے دایاں پنجہ استعمال کرتے ہیں اور آسٹریلیا کے مینڈک دونوں کو۔ اس سے خیال پیدا ہوا کہ شائدان کے دماغوں کی ساخت مختلف ہو یا اس میں ارتقاء کے عمل کو کچھ دخل ہو۔ سائنس دانوں نے معلوم کیا ہے کہ جس طرح انسانوں کے دماغ دائیں بائیں سے بظاہر ایک ہونے کے باوجود مختلف کام سرانجام دیتے ہیں ایسا ہی سلسلہ جانوروں، بندروں، چوہوں، پرندوں وغیرہ میں بھی ہے۔ گویا کثرت میں بھی ایک وحدت ہے۔

گو بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن اللہ کے کاموں پر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح اس نے اپنی ہر مخلوق کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا بلکہ اس کی فطری اور آسمانی ہدایت کا بھی سامان کیا ہے۔ جانوروں کو اپنی بقا اور حفاظت کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ اس کی ہدایت بطور جبلت (Instinct) ان کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے الغرض ہر مخلوق کو اس کے مناسب حال ہدایت دی گئی ہے کہ ہر چیز میں ایک اعلیٰ درجہ کا منصوبہ، ارادہ اور مقصدیت (Purposiveness) نظر آتی ہے ورنہ ایک مینڈکی کے بچہ کو کس نے سکھایا کہ زہریلی یا نقصان دہ چیز کو معدہ سے کیوں اور کیسے صاف کرنا ہے اور تھوتھنی کیسے صاف کرنی ہے اور پھر دائیں پنجہ سے صاف کرنی ہے یا بائیں پنجہ سے یا دونوں سے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یہ ایک زبردست دلیل ہے کہ دیکھو کس طرح کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے مناسب حال ہدایت سے فیضیاب ہو رہا ہے خواہ وہ عالم جمادات ہو، نباتات ہو، حیوانات ہو یا اشرف المخلوقات انسان۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یہ وہ دلیل ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے پیش کی تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو دلیلیں بھی کیا خوب سمجھاتا ہے۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ ’’اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے‘‘ اور جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ **’’رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی‘‘** (طٰہٰ:۵۰) یعنی ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو (اس کی ضرورت کے مطابق) اعضاء عطا کئے ہیں اور پھر ان (اعضاء) سے کام لینے کا طریقہ سکھایا ہے۔

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ

(الفضل انٹرنیشنل 5.9.97)

آپ چائے پیئیں گے یا کافی؟

بظاہر تو اس پیشکش کا جواب بڑا سیدھا سادہ ہے دونوں میں سے کوئی بھی ہو ٹھیک ہے۔لیکن سنتے ہیں اٹھارویں صدی میں اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے سویڈن کے شاہ گستاف سوئم نے کئی سال لگا دیئے تھے بادشاہ نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ صحت کے لئے چائے اچھی ہے یا کافی دو جڑواں بھائیوں پر تجربہ کیا جن کو قتل کے جرم میں سزائے موت سنائی جا چکی تھی ۔بادشاہ نے کہا کہ دونوں کی سزائے موت اس شرط پر عمر قید میں تبدیل کی جاتی ہے کہ ان میں سے ایک چائے کا اور دوسرا کافی کا جگ دن میں تین بار روزانہ عمر بھر پیئے گا۔اتفاق سے چائے پینے والا بھائی پہلے مر گیا (اس نے ۸۳ سال عمر پائی تھی) اور کافی پینے والا زندہ رہا۔ چنانچہ بادشاہ نے تب سے کافی پینی شروع کردی اور وہ رواج پا گئی۔لیکن شاید زیادہ کافی پینے کا نتیجہ تھا کہ بادشاہ خود ۱۸۹۲ء میں صرف ۴۵ سال کی عمر میں چل بسا۔لہٰذا یہ سوال تشنہ جواب ہی رہا کہ لمبی عمر کے لئے چائے مفید ہے یا کافی۔

حال ہی میں برطانیہ کے سائنسدانوں نے کافی پینے کے نتائج پر تحقیق کی ہے اور آسٹریلیا کے سائنسدانوں نے چائے کے اثرات پر۔دونوں کے نتائج جو اخباروں میں چھپے ہیں دلچسپ ہیں۔ کافی کے بارہ میں ثابت ہوا ہے کہ یہ دل کی شریانوں کو سکیڑتی ہے۔بلڈ پریشر بڑھاتی ہے اور دل کے حملہ کا باعث بنتی ہے۔اس لئے کافی زیادہ پینے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔اس کے بالمقابل آسٹریلیا کے سائنسدان کہتے ہیں کہ سیاہ یا سبز چائے میں ایک ایسا جزو پایا جاتا ہے جسے پالی فینولز (Polyphenols) کہتے ہیں اور یہ پھلوں کے وٹامن سی، کئی غذاؤں، آٹے کے چھان بورے (وٹامن ای) اور ریڈ وائن میں پایا جاتا ہے۔یہ جزو جسم میں عمل تکسید کو روکتا ہے یعنی Anti Oxidant ہے جس سے جسم کے

توڑ پھوڑ بڑھاپے اور جھریوں وغیرہ پڑنے کا عمل سست پڑ جاتا ہے۔ چائے میں یہ جزو پھلوں کے رس سے پندرہ گنا زیادہ ہوتا ہے اور یہ دل کی بیماریوں اور کینسر کے خلاف مدافعت پیدا کرنے کے لحاظ سے مفید ہے گویا چائے کے اثرات اس لحاظ سے کافی الٹ ہیں۔

جو غذا ہم کھاتے ہیں وہ جسم کی تعمیر بھی کرتی ہے اور اس مشین کو چلانے کے لئے ایندھن کا کام بھی کرتی ہے لیکن ہر ایندھن کی طرح اس کو بھی جلنے کے لئے آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمارا سانس مہیا کرتا ہے۔ یہ ایک کیمیائی عمل ہے جو Oxidation کہلاتا ہے۔ اور یہ جسم کے ایسے مالیکیولز جو Free Radicals کہلاتے ہیں جب آکسیجن کے ساتھ ملتے ہیں تو پیدا ہوتا ہے۔ یہ عمل لوہے کو زنگ لگنے کے مشابہہ ہے اور جسم کو تحلیل کر کے بڑھاپے کی طرف دھکیل رہا ہوتا ہے۔ جسم کی ضرورت سے زائد جتنی غذا زیادہ کھائی جائے گی Free Radicals تعداد میں اتنے ہی زیادہ ہوں گے اور پھر بجائے اس کے کہ بدن غذا کو کھائے، غذا بدن کو کھانا شروع کر دیتی ہے۔ حدیث میں بھوک رکھ کر کھانے کا جو ارشاد ملتا ہے اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے۔ اس عمل کو سست کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بعض Anit Oxidant ہماری غذاؤں میں رکھ دیتے ہیں (مثلاً وٹامنز سی، ای وغیرہ)

بہرحال وہی غذا اور سانس جو ایک وقت میں جسم کی تعمیر کرتے ہیں وہی دوسرے وقت میں جسم کی تخریب کا سامان بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ شاید اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے غالب نے کہا تھا:

؎ میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

خلاصہ کلام یہ کہ ’’آپ چائے پئیں گے یا کافی؟‘‘ کی پیشکش کا مناسب جواب یہی لگتا ہے کہ چائے ہی کافی ہے۔ لہذا وہی چلے گی۔

(الفضل انٹرنیشنل)

اکیسویں صدی کا آغاز کب ہوگا؟ یکم جنوری ۲۰۰۰ءکو یا یکم جنوری ۲۰۰۱ءکو؟

یہاں ایک اخبار میں بحث چھڑی ہوئی ہے کہ موجودہ صدی یا ہزار سال کا اختتام ۳۱ ردسمبر ۱۹۹۹ءکو ہوگا یا ۳۱ ردسمبر ۲۰۰۰ءکو؟ یعنی آئندہ صدی یا ہزار سالہ دور کا آغاز کس روز سے شمار ہونا چاہیئے یکم جنوری ۲۰۰۰ءکو یا یکم جنوری ۲۰۰۱ء سے؟ یہ بھی کہا گیا کہ سن عیسوی کے آغاز میں چار سال کی غلطی ہے یعنی جس روز سے اس سن کا آغاز کیا گیا اس وقت عیسیٰؑ چار سال کے ہو چکے تھے۔ لہٰذا اگر عیسیٰؑ جسمانی طور پر آسمان پر زندہ بیٹھے ہیں تو یکم جنوری ۱۹۹۷ءکو ان کی دو ہزارویں برتھ ڈے ہونی چاہیئے۔ ان کو تو اپنی عمر کا صحیح علم ہوگا۔ وہ سن عیسوی کو جاری کرنے والوں کی غلطی کے پابند نہیں ہیں۔ لیکن اگر اس چار سالہ غلطی کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر عیسیٰؑ کی پیدائش پر دو ہزار سال کب پورے ہوتے ہیں۔ یکم جنوری ۲۰۰۰ءکو یا یکم جنوری ۲۰۰۱ءکو۔

آسٹریلیا کے نیشنل سٹینڈرڈ کمیشن نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ اکیسویں صدی یا تیسرے ہزار سالہ دور کا آغاز یکم جنوری ۲۰۰۱ءکو ہوگا۔

سن عیسوی کا آغاز چھٹی صدی عیسوی میں ایک رومی شخص نے کیا تھا جس کا نام Abbot Dionysius Exiguus تھا۔ اس نے قرار دیا تھا کہ جس سال عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے وہ پہلا عیسوی سال شمار ہوگا اور اس سے پہلا سال ایک سال قبل مسیح کہلائے گا۔ گویا کوئی سال زیرو (Zero)

شمار نہیں ہوگا۔ اس لحاظ سے پہلی صدی عیسوی ۳۱ ردسمبر ۱۰۰ء میں ختم ہوئی تھی اور موجودہ صدی کا خاتمہ ۳۱ ردسمبر ۲۰۰۰ء کو ہوگا اور یوں یکم جنوری ۲۰۰۱ء سے اگلی صدی یا ہزار سالہ دور کا آغاز ہوگا۔

(الفضل انٹرنیشنل 7.2.97)

دعائے غائبانہ

دوسروں کے لئے دعا کرانے کے دو دلچسپ اعلان اخبار میں نظر سے گزرے جن سے پتہ لگتا ہے کہ اس بارہ میں لوگوں میں کس طرح کے نظریات راہ پا چکے ہیں جن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

ایک اعلان تو سڈنی کی کسی یہودی تنظیم کی طرف سے تھا جو ایک رنگ میں ''دعائیہ ایجنسی'' کا کام سرانجام دے رہی ہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ہم نے آپ کی طرف سے اسرائیل کی دیوار گریہ کے ساتھ چمٹ کر رو کر دعا کرنے والوں کا انتظام کیا ہے۔ معاوضہ بہت مناسب ہے۔ اگر آپ خواہش مند ہوں تو اپنا نام پتہ اور مطلوبہ مقصد جس کے لئے دعا درکار ہے سے مطلع کریں۔

دوسرا اعلان سڈنی کے ایک کیتھولک سکول کے ہیڈ ماسٹر پیٹر آئر لینڈ کی طرف سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے ایسے طلباء و طالبات کے لئے جو میٹرک (HSC) کا امتحان دے رہے ہیں دعا کرنے والے اصحاب کا انتظام کیا ہے اور اس سکیم کو انہوں نے Prayer Sponsership Scheme کا نام دیا ہے۔ ایک سپانسر اپنے حصہ کے ایک طالبعلم کے لئے امتحان میں اعلیٰ کامیابی کے لئے دعا کرے گا جو طلباء دعاء سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں وہ اپنے نام پتہ پرکس پرچہ کے لئے دعا درکار ہے اور پرچہ کے انعقاد کے وقت سے مطلع کریں تا عین جب پرچہ شروع ہو تو اس وقت ان کی طرف سے دعا کی جائے۔ اعلان میں دعا کرنے والے (سپانسر) کے معاوضہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس اعلان پر اخبار کے کالم نویس نے مذاق کے رنگ میں بہت کچھ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خود اپنے لئے کوئی دعا کرے تو چلو مان لیا کچھ فائدہ ہوگا لیکن کسی اور سے دعا کرائیں تو اس سے آپ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

معاوضہ پر دوسروں سے دعا کروانے کا یہود کی طرح مسلمانوں میں بھی رواج ہے۔ اس کی

ایک مثال کسی وفات یافتہ شخص کی روح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے اجرت پر قرآن پڑھانا ہے۔ ایک دفعہ میرے ایک غیر از جماعت دوست کے والد فوت ہو گئے۔سوم کی رسم پر قرآن خوانی کا انتظام کرنے کے لئے وہ لاہور کے کسی یتیم خانہ میں گئے۔وہاں کے منتظم نے کہا کہ قرآن پڑھنے کے ہمارے دو ریٹ ہیں ایک تین روپے فی سیپارہ اور دوسرا چھ روپے سیپارہ (کوئی بیس سال پرانی بات ہے اب تو ریٹ بڑھ گئے ہونگے) وہ کہتے ہیں میں نے منتظم صاحب سے پوچھا کہ دونوں ریٹوں میں کیا فرق ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ تین روپے والے ریٹ میں قرآن جلد جلد پڑھا جاتا ہے اور چھ روپے والے ریٹ میں احتیاط سے پڑھا جاتا ہے جس پر تقریباً دو گنا وقت لگتا ہے۔پھر انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ دیکھیں جس طرح اچھی طرح قرآن پڑھنے کا ثواب آپ کے والد کو پہنچے گا ویسے ہی جلد جلد پڑھنے میں جو غلطیاں رہ جائیں گی ان کا گناہ بھی آپ کے والد صاحب کے سر ہوگا۔اب فیصلہ آپ کا ہے۔انہوں نے جواب دیا کہ میں نے والد صاحب کی روح کو ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کرانی ہے لہذا چھ روپے والا ریٹ منظور ہے۔

دوسروں سے دعا کرانے کے سلسلہ میں دو قسم کے خیالات عوام میں پائے جاتے ہیں۔ایک تو وہ ہیں جو عادتاً دوسروں سے دعا کے لئے کہتے رہتے ہیں۔نہ دعا کرانے والا سنجیدہ ہوتا ہے اور نہ کرنے والا اور نہ ان کے درمیان کوئی ایسا تعلق ہوتا ہے کہ دعا کرانے والے کا دکھ دعا کرنے والے کا دکھ بن جائے گویا وہ اپنے ہی دکھ کے دور ہونے کے لئے دعا کر رہا ہے۔ایسے لوگ جب ملیں گے تو کہیں گے بس جی آپ کی دعا سے میرا فلاں کام بن گیا ہے جب کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ نہ میں نے ان کو دعا کے لئے کہا اور نہ انہوں نے کی ،صرف بطور تکلف اور احترام کے ایسا کہہ دیتے ہیں۔اس گروہ کے مقابلہ میں دوسرے وہ ہیں جو مادہ پرست معاشرہ کے زیر اثر دعا کی اہمیت سے ہی لاعلم ہوتے ہیں۔ایسے لوگ دوسروں کو دعا کے لئے کہنا غیر ضروری تکلف سمجھتے ہیں۔بیمار ہوں تو کسی کو بتائیں گے نہیں کہ کسی نے دعا تو کرنی نہیں خواہ مخواہ پریشان کرنے کا کیا فائدہ ہے۔دعائیہ اعلانات کو محض ذاتی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں گروہ افراط و تفریط کا شکار ہیں۔

قرآن کریم خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے دعا کرنے اور کرانے کے تعلق میں فرماتا ہے:۔

”(اے رسول) تو ان سے کہہ دے کہ اگر تمہاری طرف سے دعا نہ

ہوتو میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے......'' (الفرقان:۷۸)

''(نیز بتاؤ تو) کون کسی بے کس کی دعا سنتا ہے جب وہ اس (خدا) سے دعا کرتا ہے اور (اس کی) تکلیف دور کردیتا ہے......'' (النمل:۶۳)

''اور تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو میں تمہاری دعا سنوں گا.....''

(المومن:۶۱)

''اور (اے رسول) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو (تو جواب دے کہ) میں (ان کے) پاس ہی ہوں۔ جب دعا کرنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ سو چاہئے کہ وہ (دعا کرنے والے) بھی میرے حکم کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تو وہ ہدایت پائیں''

(البقرۃ:۱۸۷)

''اور جو لوگ ان کے زمانہ کے بعد آئے وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے ہیں اور ہمارے دلوں میں مومنوں کا کینہ نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے رب تو بہت مہربان اور بے انتہا کرم کرنے والا ہے'' (الحشر:۱۱)

''اے میرے رب مجھے اور میری اولاد (میں سے ہر ایک) کو عمدگی سے نماز ادا کرنے والا بنا (اے) ہمارے رب (ہم پر فضل کر) اور میری دعا قبول فرما۔ اے ہمارے رب جس دن حساب ہونے لگے اس دن مجھے اور میرے والدین کو اور تمام مومنوں کو بخش دیجیو'' (ابراھیم:۴۲۔۴۱)

صحیح مسلم میں ہے کہ ابو درداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ جب کوئی مسلمان اپنے بھائی کے لئے غائبانہ طور پر دعا کرتا ہے تو ایک فرشتہ کہتا ہے کہ خدا کرے تیرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔ نیز آپؐ نے فرمایا کہ دعا عبادت کا مغز ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''ان باتوں کے بیان کرنے سے میرا یہ مطلب ہے کہ جب تک دعا

کرنے والے اور کرانے والے میں ایک تعلق نہ ہو متاثر نہیں ہوتی ۔غرض جب تک اضطرار کی حالت پیدا نہ ہو اور دعا کرنے والے کا قلق دعا کرانے والے کا قلق نہ ہو جائے کچھ اثر نہیں کرتی ۔بعض اوقات یہی مصیبت آتی ہے کہ لوگ دعا کرانے کے آداب سے واقف نہیں ہوتے اور دعا کا کوئی بین فائدہ محسوس نہ کر کے خدائے تعالیٰ پر بدظن ہو جاتے ہیں اور اپنی حالت کو قابل رحم بنا لیتے ہیں بالآخر میں کہتا ہوں کہ خود دعا کرو یا دعا کراؤ پاکیزگی اور طہارت پیدا کرو۔ استقامت چاہو اور توبہ کے ساتھ گر جاؤ۔ کیونکہ یہی استقامت ہے اس وقت دعا میں قبولیت، نماز میں لذت پیدا ہوگی ۔ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ''۔ (ملفوظات جلد۹ صفحہ۲۴)

(الفضل انٹرنیشنل 10.1.97)

بچیوں پر ظلم آج بھی جاری ہے

ایام جاہلیت میں لوگ بچیوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیا کرتے تھے یہ دلدوز ظلم آج بھی مختلف شکلوں میں جاری ہے۔اس سلسلہ میں جو اعداد و شمار انڈیا، چین، تائیوان سے اکٹھے کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں آج بھی بے شمار لوگ ہیں جو بچیوں کو بوجھ سمجھتے ہیں اور دوران حمل ٹمیسٹ کے ذریعہ اگر پتہ لگ جائے کہ بچی آ رہی ہے تو حمل کو ضائع کروا دیتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں صرف بیٹے ہی پیدا ہوں۔جہاں مغربی ملکوں میں بچے اور بچیوں کی تعداد تقریباً برابر ہوتی ہے وہاں مذکورہ بالا ممالک میں ۱۰۶ تا ۱۱۴ لڑکوں کے مقابلہ میں ۱۰۰ لڑکیاں ہیں۔ چونکہ ان ملکوں کی آبادی کروڑوں میں ہے وہاں پیدائش سے پہلے اور پیدائش کے بعد جو بچیاں ماردی جاتی ہیں ان کی تعداد لاکھوں میں جا پہنچتی ہے۔عورتوں کے ساتھ تعصب کا یہ حال ہے کہ انڈیا میں کثرت سے ایسے خاندان ہیں جو غذا کی کمی کا شکار ہیں ان میں جب تک مرد اور لڑکے پیٹ بھر کر کھانا نہ کھالیں عورتوں اور بچیوں کو کھانے کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی۔صرف انڈیا میں ۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۱ء کے دوران ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ بچیاں پیدائش سے پہلے ہی ختم کر دی گئیں۔اسی عرصہ میں مزید چالیس لاکھ بچیاں اپنی عمر کے پہلے چار تا چھ سال کے عرصہ میں ''غائب'' کر دی گئیں یعنی ہر ہزار میں سے ۳۶ لڑکیاں آبادی سے ''غائب'' ہوگئیں۔خیال تھا کہ چونکہ کافی بچیاں اب پیدائش سے پہلے ہی غائب کر دی جاتی ہیں لہذا پیدائش کے بعد کی اموات میں کمی واقع ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ایسی ''گم کردہ'' بچیوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوا ہے۔امریکہ کے اعداد و شمار کے ادارہ نے کہا ہے کہ چین میں ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۰ء کے دوران پندرہ لاکھ بچیوں کو پیدائش سے پہلے ہی

ہلاک کر دیا گیا۔یہی حال تائیوان کا ہے جہاں بچیوں کی جنس کا پتہ لگا کر پیدائش سے پہلے ہی ختم کر دیا جا تا ہے ۔جن عورتوں کے ہاں شروع میں بیٹے ہو جاتے ہیں وہ پھر بچیوں کی پیدائش کے خوف سے مانع حمل ادویہ استعمال کرنا شروع کر دیتی ہیں۔سروے میں کہا گیا ہے کہ تعلیم یافتہ گھرانوں میں جہاں بچیاں پڑھ لکھ کر ملازمت وغیرہ کے ذریعہ سے اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی ہیں یا اپنے جہیز کے لئے بھی، ماں باپ کا ہاتھ بٹا سکتی ہیں وہاں بچیوں کے خلاف تعصب کم ہے اگرچہ دل کی گہرائیوں سے وہ بھی بیٹے ہی چاہتے ہیں۔

مذکورہ بالا حالات حقیقتاً بہت دردناک ہیں۔کاش ان قوموں کے رہنما ان وجوہات کو تلاش کریں جن کی وجہ سے ماں باپ بچیوں کو اس قدر نا قابل برداشت بوجھ سمجھتے ہیں اور ان اسباب کو دور کر کے ان مظلوم بچیوں کی سسکیاں لیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں حتیٰ کہ ان کے ماں باپ بھی نہیں۔ سب سے بڑی لعنت تو جہیز کی ہے اگر اسی کا علاج کر لیں تو صورت حال بہتر ہو سکتی ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 17.1.97)

کان جو صرف کام کی بات سنتے ہیں، غیر پسندیدہ شور نہیں سنتے

آپ کا گھر سڑک کے کنارے واقع ہے اور ٹریفک کے مسلسل شور سے تنگ آ چکے ہیں۔ دفتر جائیں تو وہاں ائر کنڈیشنر اور دفتری مشینوں کا مسلسل شور آپ کو سننا پڑے گا۔ ہوائی جہاز میں بیٹھیں تو اس کے شور سے کان بند ہو جاتے ہیں۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ کانوں میں روئی ٹھونس لیں شور کا کچھ نہ کچھ مداوا ہو جائے گا۔ لیکن ساتھ ہی جو کام کاج کی باتیں آپ سننا چاہتے ہیں ان سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ اب سائنس نے اس مسئلہ کا حل بھی سوچ لیا ہے اور ایسا آلہ ایجاد کر لیا ہے کہ جو آپ کے اردگرد کے مسلسل شور (Low Frequency Noise) کو تو ختم کر دے گا لیکن بات چیت کی آواز بالکل صاف سنائی دے گی۔

اس کے لئے جو آلہ ایجاد کیا گیا ہے اس کا نام Quiet Zone 2000 رکھا گیا ہے۔ اس کی قیمت پانچ سو ڈالر کے قریب ہے اور بنانے والی کمپنی امریکہ کی Koss Corporation ہے۔ کمپنی کے ڈائریکٹر مائیکل کاس کا کہنا ہے کہ ہمارے آلے کے اولین گاہک ہوائی جہازوں کے بین الاقوامی کمپنیاں ہونگی۔ نیز یہ آلہ ایسے افراد کے لئے بھی کارآمد ثابت ہوگا جن کی قوت سماعت کمزور ہے اور اردگرد کے شور کی وجہ سے بات چیت نہیں سن سکتے۔

اس آلہ میں ایسے الیکٹرونک آلات نصب ہیں جو مسلسل آنے والے شور کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ کی لہروں کو الٹا دے گا۔ چونکہ آواز لہروں میں سفر کرتی ہے دونوں حصوں کی لہریں ایک دوسرے کے مخالف ہونے کی وجہ سے منسوخ (Cancel) ہو جاتی ہیں۔ لہر کا ایک حصہ جب مثبت ہوتا ہے تو دوسرا منفی ہو جاتا ہے۔ اس طرح غیر پسندیدہ لہروں میں اختلاف پیدا کر کے،

ان کو گتھم گتھا کر کے ان کی طاقت کو صفر کر دیا جاتا ہے ۔لیکن دوسری آوازیں جن کی فریکوئنسی (Frequency) وغیرہ بات چیت کے دوران کم وبیش ہوتی رہتی ہے وہ صاف صاف سنی جاتی ہیں یوں یہ آلہ آپ کو اس قابل بنادے گا کہ آپ کام کی بات چیت تو سن سکیں لیکن غیر پسندیدہ شور کے سننے سے بچ جائیں۔

کیا خوب ہو کہ کل کلاں کوئی ایسا آلہ بھی ایجاد ہو جائے کہ جس کے لگانے سے ہمارے کان نیکی اور تقویٰ کی باتوں کو تو صاف سن سکیں لیکن جب خلاف تقویٰ باتوں ،غیبت ، جھوٹ اور فساد وغیرہ کا غیر پسندیدہ شور ہو تو وہ کانوں میں داخل ہی نہ ہو سکے ۔بس آلہ کانوں کو لگایا اور گناہوں سے بچ گئے ۔لیکن درحقیقت اس کے لئے کسی خاص آلہ کی ایجاد کی ضرورت نہیں ۔انسان اگر چاہے تو وہ اپنے آپ کو اس بات کا عادی بنا سکتا ہے کہ وہ اچھی باتیں تو سنے مگر بری باتوں سے بہرہ ہو جائے ۔اس کے لئے صرف قوت ارادی کی ضرورت ہے۔جیسا کہ ایک عربی شاعر کہتا ہے:

؎ اَصُمُّ عَنِ الشَّیْءِ الَّذِیْ لَا اُرِیْدُہٗ

وَاَسْمَعُ خَلْقَ اللّٰہِ حِیْنَ اُرِیْدُ

کہ جس بات کو میں پسند نہیں کرتا اس سے میں بہرہ ہو جاتا ہوں اور جب میں چاہتا ہوں تو میں اللہ کی مخلوق کی باتیں پوری توجہ سے سنتا ہوں۔

(الفضل انٹرنیشنل)

آسٹریلیا میں بچے جلد ہی کمپیوٹر کے ذریعہ پڑھنا شروع کردیں گے

آسٹریلیا کو خطرہ ہے کہ عنقریب امریکہ کی طرف سے اس پر CD.Roms کے ذریعہ سے ایک سخت حملہ کیا جائے گا۔ بچے کمپیوٹر پر اس ذریعہ سے تاریخ خصوصاً جنگ عظیم دوم۔ آرٹ کلچر، کہانیاں وغیرہ تصویری زبان میں دیکھیں گے جس کے ساتھ آواز بھی شامل ہوگی اور امریکہ جس طرح اس کے قومی مفاد میں ہوگا یا جس طرح پیسے کمانے والے چاہیں گے اس طرح کی CDs تیار کر کے یہاں کے بچوں کے ذہنوں پر یلغار کرے گا۔ اگرچہ اس حملہ کو پورا تو نہیں روکا جاسکتا لیکن ایک حد تک کوشش ضرور کی جاسکتی ہے۔

چنانچہ مواصلات اور آرٹ کے وزیر نے ۶ء۸ ملین ڈالر اس حملہ کی پیش بندی کے لئے خرچ کرنے کا اعلان کیا ہے اس غرض کے لئے حکومت پانچ اداروں کو مدد دے رہی ہے تا کہ وہ بچوں کے لئے متبادل CDs تیار کریں۔ پہلی سٹیج میں پانچ موضوعات پر یہ مواد تیار ہو رہا ہے۔ اس میں آسٹریلیا کے کلچر، تاریخ، جغرافیہ، کہانیاں (بالخصوص جانوروں کی) سکول کا کورس تھیٹر، مقامی باشندوں کے کلچر اور جنگ عظیم دوم کے حالات پر مبنی CDs شامل ہیں۔ بچوں کو متبادل دلچسپ مواد مہیا کر کے بچوں کے ذہنوں کو امریکی بننے سے بچا کر آسٹریلوی بنانا مقصود ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل)

انسانی اعضاء کی خود اپنے خلاف گواہی

سائنس اتنی ترقی کرگئی ہے کہ اب مجرم کے جسم کا ذرہ ذرہ اس کا خون، پسینہ، آنسو، لعاب دہن اور ایک ایک بال خود اپنے خلاف گواہی دینے لگا ہے۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں مجرم کی شناخت کے لئے اس کے D.N.A کے تجزیہ کو تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ برطانیہ میں حال ہی میں پولیس کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی ملزم کا بال یا لعاب زبردستی حاصل کرسکتے ہیں۔ بال کی جڑ D.N.A کا مفید ترین گڑھ ہوتی ہے۔ البتہ خون حاصل کرنے کے لئے اگر ملزم انکاری ہو تو مجسٹریٹ سے اجازت نامہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حکومت کو امید ہے کہ ان نئے قوانین کو بروئے کار لا کر صدی کے خاتمہ تک D.N.A کی پچاس لاکھ تجزیاتی رپورٹوں کو اپنی کمپیوٹروں کی لائبریری میں جمع کرسکیں گے جس سے مجرموں کو ۹۹ فیصد سے زائد درستگی کے ساتھ شناخت کیا جاسکے گا۔ اس سے جرائم کو کنٹرول کرنے میں بہت مفید مدد ملے گی۔ اگر صحیح طریق کار اختیار کیا جائے تو D.N.A کے تجزیہ کے نتائج حیران کن حد تک درست ثابت ہوتے ہیں۔ تین کروڑ انسانوں میں سے شاید دو افراد ایسے نکل آئیں جن کی D.N.A کی تصویر ایک جیسی ہو۔ پولیس کو یقین ہے کہ اس ذریعہ سے مجرموں کو پکڑنے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔ برطانیہ اور ویلز میں پرتشدد جرائم کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے گزشتہ سال ایسے جرائم میں ۹ء۵ فیصد اضافہ ہوا جب کہ قتل کی وارداتوں میں ۵ء۸ فیصد اضافہ ہوا۔ مشکوک کردار کے حامل افراد کا D.N.A ریکارڈ کمپیوٹر پر ہوگا۔ موقع واردات پر پائی جانے والے جسم کے لعاب، بال وغیرہ کے معائنہ سے فوراً مجرم کا پتہ چل جائے گا۔ اور گویا قاتل کا خون اس کے خلاف گواہی دے گا۔

ے جو چپ رہے گی زبان خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

یہ D.N.A کیا چیز ہے اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ جسم انسانی میں تقریباً دس ہزار ارب (دس ٹریلین) خلیات (Cells) ہوتے ہیں۔جینی مواد (Genetic Material) ڈی این اے میں ہوتا ہے جو ہر سیل کے مرکز میں ہوتا ہے۔D.N.A مخفف ہے Deoxyribonucleic Acid کا۔ ہر ڈی این اے کے اندر ۲۳ کروموسوم (Chromosomes) کے جوڑے ہوتے ہیں۔یعنی کل ۴۶ کروموسوم ہوتے ہیں۔یہ سیڑھی کے دو بازوؤں کی طرح ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے اوپر لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ان باہر کے بازوؤں کو باہم پیوست رکھنے کے لئے سیڑھی کی طرح کے ڈنڈے (Rungs) ہوتے ہیں۔ان کو Bases کہتے ہیں اور یہ چار مختلف اشیاء (Adenine, Thymine,Cystosine,Guanine,A,T,C,G) سے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک ڈنڈے یعنی Base میں ان میں سے دو استعمال ہوتے ہیں جیسے اے ٹی یا سی جی یا اے جی وغیرہ۔یہ Base Pairs شوگر اور فاسفیٹ Suger and Phosphate سے مرکب ہوتے ہیں اور انسانی جسم میں ان کی تعداد تین ارب ہوتی ہے۔ان کو آپ حیاتیاتی حروف ابجد کہہ سکتے ہیں۔(Biological Alphabets) جب یہ تین حروف اکٹھے ہوں تو ایک حیاتیاتی لفظ وجود میں آتا ہے۔Biological Word۔ان کو Amino Acid بھی کہا جاتا ہے۔ان الفاظ یعنی امینو ایسڈ سے مل کر حیاتیاتی فقرہ Biological Sentence وجود میں آتا ہے۔اس کو جین (Gene) کہتے ہیں انسان میں پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک (Gene) ہوتے ہیں۔یہ جینز ہم میں سے ہر ایک کو وہ بناتی ہے جو ہم ہیں یعنی ہمارا قد، رنگ، نسل، ذہانت، خوبیاں، خامیاں، بیماریاں اور کردار وغیرہ۔ اگر انسان کو ایک کمپیوٹر سے تشبیہہ دی جائے تو یہ جینز اس پروگرام کی طرح ہیں جس کے مطابق کمپیوٹر کام کرتا ہے۔اس موضوع پر اتنی تحقیق ہورہی ہے کہ ایک لامحدود خزانے کی طرح ہے۔یہ اسرار کا اتنا بڑا دفتر ہے کہ ساری دنیا کے سائنس دان بھی مل کر اس کو پڑھنے سے قاصر ہیں۔ ہر اٹھارہ ماہ کے بعد اس موضوع پر علم کا خزانہ دگنا ہوجاتا ہے۔ان رازوں کو منکشف کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے دنیا بھر کے سائنس دانوں کی دوڑ لگی ہوئی ہے خاص طور پر ایسی دوائیں بنانے کے لئے جن کا تعلق کسی رنگ میں وراثتی بیماری سے ہو۔

ڈی این اے کے نشانات DNA Fingerprints جو برطانیہ کی پولیس اب جمع

کر رہی ہے۔اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جسم کے لعابات (خون، پسینہ، آنسو، لعاب دہن، منی وغیرہ) کے معمولی نشانات کو پہلے ہزاروں لاکھوں گنا بڑھایا جاتا ہے۔اس عمل کو Polymerase Chain Reaction کہا جاتا ہے ۔ یہ لاکھوں گنا بڑھائے ہوئے ۔ DNA کے ساتھ ایک Radioactive Tag ملا دیا جاتا ہے۔اس سے DNA کی ترتیب قائم ہو جاتی ہے۔ پھر اس میں سے بجلی گزار کے چھوٹے بڑے ٹکڑے الگ الگ کئے جاتے ہیں۔ پھر ایکس رے کے ذریعہ سے ان کا معائنہ کیا جاتا ہے۔

بہر حال یہ طریقہ اب امریکہ، آسٹریلیا وغیرہ میں بھی مجرموں کی شناخت کے لئے استعمال ہونا شروع ہو گیا ہے۔اور اس طرح خود انسان اپنے خلاف نا قابل تردید گواہی دیتا ہے۔قرآن کریم میں خود اپنے خلاف گواہی دینے کا ذکر موجود ہے۔خدا فرماتا ہے:

''اور جس دن اللہ کے دشمن (یعنی کافر) زندہ کر کے آگ کی طرف لے جائے جائیں گے پھر ان کو مختلف درجوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ دوزخ کے پاس پہنچ جائیں گے ان کے کان اور آنکھیں اور ان کے چمڑے ان کے عمل کی وجہ سے ان کے خلاف گواہی دیں گے۔اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ اور ان کے چمڑے جواب میں کہیں گے ہم سے اسی خدا نے کلام کروایا ہے جس نے ہر چیز سے کلام کروایا ہے اور اس نے تم کو پہلی دفعہ بھی پیدا کیا تھا اور پھر بھی تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

(حٰم السجدہ: ۲۰-۲۲)

(الفضل انٹرنیشنل)

روزانہ چار لیٹر سادہ پانی پینا کئی بیماریوں کے لئے مفید ہے

حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں طبی نقطہ نگاہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کثرت سے صاف، سادہ پانی پینا انسانی صحت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے اوراس کے ذریعہ سے بعض بیماریوں کا علاج بھی کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

انسان کے جسم میں تین چوتھائی پانی ہوتا ہے پانی کی کمی سے جسم کو نقصان پہنچتا ہے اور اگر یہ کمی برقرار رہے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ انسانی صحت کا راز جسم میں پانی اور نمکیات و کیمیات کے توازن کے درست رہنے میں ہے۔ ایک اوسط بالغ آدمی روزانہ تقریباً چھ پائنٹ (۳٫۴ لیٹر) پانی جسم سے خارج کرتا ہے۔ نصف لیٹر پسینہ، ایک لیٹر سانس اور کوئی دو لیٹر پیشاب کے ذریعہ خارج ہوتا ہے گویا جسم کی مشین کو چلتے رہنے کے لئے مسلسل پانی درکار ہوتا ہے۔ یہ جاننے کے لئے کسی لمبے چوڑے حساب کی ضرورت نہیں کہ جتنا پانی روزانہ جسم سے خارج ہوتا ہے اتنا داخل کرنا بہرحال ضروری ہے اور اگر یہ کمی پوری نہ کی جائے تو جسم کی مشین میں کہیں نہ کہیں کوئی خرابی ضرور پیدا ہوگی جس سے بیماری پیدا ہوگی۔ کتاب کے مصنف نے جو ریسرچ کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کم پانی پیتے رہنے سے کئی تشویشناک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جن میں دمہ، ہائی بلڈ پریشر، معدہ کا السر (Ulser) انجائنا، سردرد ، کمردرد ، جوڑوں کا درد، قولنج (Colitis) کھچاؤ تناؤ (Stress)، ذیابیطس اور موٹاپا وغیرہ شامل ہیں۔ نیز الرجی کی تکلیف کئی شکلیں اختیار کرسکتی ہیں۔ جسم کے پیاسے

خلیات (Cells) پانی کی کمی کو پورا کرنے کے لئے کئی قسم کے ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ جو بعض دفعہ اتنے شدید ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ذات میں بیماریاں بن جاتی ہیں۔ انہی کو الرجک ری ایکشن بھی کہا جاتا ہے۔

کتاب کے مصنف ڈاکٹر فریدون ایرانی نژاد امریکی ہیں۔ جب ایران میں خمینی انقلاب آیا تو ان کو سزائے موت سنائی گئی۔ وہ ایران کی ایک جیل میں اڑہائی سال قید رہے جہاں تین ہزار اور قیدی بھی تھے۔ جیل میں علاج معالجہ کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو مجبوراً قیدیوں کا علاج پانی اور نمک وغیرہ سے کرنا پڑتا تھا۔ وہ حیران ہوئے کہ پانی بطور دوا کے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ قیدیوں پر اس تھیوری کو آزمانے کے لئے تجربہ کرتے رہے اور بڑی احتیاط سے انہیں ریکارڈ کرتے رہے۔ انہوں نے دو ہزار سال پرانے ایرانی حکماء کے تجربوں کی تصدیق کی جو درد اور صدمہ کی حالت میں مریض کو پانی پلایا کرتے تھے اور اس کی زبان پر نمک رکھا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی بناء پر ان کی جان بخشی کردی گئی۔

ڈاکٹر صاحب کے پاس ایک قیدی سخت پیٹ درد کی حالت میں آیا۔ انہوں نے اسے دو گلاس پانی پلایا اور آٹھ منٹ کے بعد درد دور ہوگئی۔ وہ کہتے ہیں جسم میں بعض کیمیکلز ہوتے ہیں جو جسم کے افعال کو درست حالت میں رکھتے ہیں وہ تب ہی کام کرسکتے ہیں جب وہ پانی میں حل ہوں۔ ایک ایسا کیمیکل (Histamine) بھی ہے جو دماغ سے پیغام لاتا ہے اور جسم میں پانی کی تقسیم اور استعمال کو صحیح رکھتا ہے۔ نیز جسم کے دفاعی نظام کو کنٹرول کرتا ہے لیکن خود ہسٹامیں کا کام بھی تبھی درست رہتا ہے جب جسم میں مناسب مقدار میں پانی موجود ہو۔ جب جسم میں پانی کی کمی ہو جائے تو اس کی مقدار پانی کے تناسب سے بڑھ جاتی ہے اور اس کا عمل نارمل حالت سے زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ردعمل کے طور پر جسم کے ہوا کے راستے بند ہونے لگتے ہیں اور سانس لینے میں دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ دمہ کے مریضوں کے پھیپھڑوں (Lungs) میں Histamine نارمل مقدار سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اگر ایسی حالت میں جسم میں پانی کم ہوگا تو پھیپھڑے بلغم (Mucus) پیدا کرتے ہیں جس کو پتلا کرنے کے لئے نمک درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ دمہ کے مریضوں کو تکلیف کے وقت نمک کا استعمال بڑھا دینا چاہئے بلکہ جب دیکھیں کہ دمہ والی کیفیت ہو رہی ہے تو

نمک زبان میں رکھ لیں جس سے دماغ یہ سمجھے گا کہ جسم میں نمک پہنچ گیا ہے اور وہ بلغم کو پتلا کرنے کی ہدایات جاری کردے گا جس کے نتیجہ میں جسم کے ہوا کے سکڑے ہوئے رستے کھل جائیں گے اور دمہ کا مریض بہتر محسوس کرنے لگے گا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اگر کوئی دمہ کا مریض ان کی ہدایات کے مطابق پانی پیئے گا تو وہ دو ہفتوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔ زیادہ پانی پینا معدے کی تیزابیت اور قبض کے لئے بھی مفید ہے پانی صاف ہونا چاہیئے اور ابلا ہوا ہو تو بہتر ہے۔ سمندری نمک عام نمک سے بہتر ہے جسم میں پانی کی کمی (Dehydration) دور کرنے کے لئے نمکین پانی ہی استعمال کرتے ہیں۔ ہسپتالوں میں بھی نمکین پانی کا ڈرپ لگاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں احتیاط کی بھی ضرورت ہے۔ پانی اور نمک کا استعمال بڑھانے سے پہلے ہائی بلڈ پریشر، دمہ، ذیابطیس اور دل کے مریض جو کوئی دوا استعمال کر رہے ہوں اپنے معالج سے ضرور مشورہ کریں۔ نمک سے پریشر فوراً بڑھ جاتا ہے۔

ڈاکٹر فریدون کہتے ہیں کہ چائے اور کولا قسم کے جو مشروبات بازار میں ملتے ہیں وہ پانی کی اس چار لیٹر کی حد میں شامل نہیں جو بالغ آدمی کو روزانہ پینا چاہیئے۔ بلکہ یہ مشروبات تو اصل مقصد کے خلاف کام کرتے ہیں۔ ان میں کیفین (Caffeine) شامل ہوتی ہے جو پیشاب آور ہونے کی وجہ سے جسم سے پانی کو خارج کرتی ہے۔ اس لئے کافی کے ہر کپ کے بعد اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے اتنا ہی سادہ پانی پینا چاہیئے۔ یہی صورت پھلوں کے جوس کی ہے۔ سنگتروں کا جوس پینے سے جسم میں اتنی پوٹاشیم داخل ہو جائے گی جو جسم کے اندرونی توازن کو بگاڑ سکتی ہے لہذا صاف سادہ پانی ہی استعمال کرنا چاہیئے۔

(ماخوذ از: "Your Body's many cries for water" by Dr Fereydoon Ghelidj,Boo Books)

ہوا کے بعد پانی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ پیاس مٹانے کے لئے سادہ پانی سے بہتر کوئی مشروب نہیں۔ پانی تھوڑا پینے سے زہریلے مادے جسم میں جمع ہو جاتے ہیں جو بیماریوں کا موجب بنتے ہیں۔ آج کل بازاری مشروبات نے ہر طبقہ کے لوگوں کو مشکل سے دوچار کر رکھا ہے۔ بہت ہیں جو پانی کی بجائے مختلف کولے ہی پیتے ہیں اور اس طرح نہ صرف پانی کے فوائد سے محروم رہتے ہیں بلکہ الٹا اپنے جسم میں غیر ضروری اور نقصان دہ کیمیکلز جمع

کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو بطور تکلف کے انہیں مہمانوں کو پیش کرتے ہیں اور عدم استطاعت کے باوجود اپنی مہمان نوازی کے تقاضہ کو پورا کرتے ہیں پر کیا ہی اچھا ہو کہ مہمان بھی خود اپنے میزبان کے بھلے کے لئے سادہ پانی پینے پر اصرار کریں اور میزبانوں کو تکلف نہ کرنے دیں۔ ذوقؔ نے کیا خوب کہا تھا کہ

ے اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے ہیں وہ جو تکلف نہیں کرتے

کئی لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں آرام رہے نہ رہے پر تکلف پر حرف نہ آنے پائے۔ وہ کہتے ہیں استاد ذوقؔ اس زمانے میں ہوتے تو شاید یوں کہتے:

ے اے ذوقؔ تکلف میں ہے تہذیب سراسر
دہقانی ہیں وہ سب جو تکلف نہیں کرتے

(الفضل انٹرنیشنل 23.1.98)

بلی نے اپنے مالک کو قتل کے الزام میں پکڑ وادیا

عدالتوں میں ثبوت جرم کے لئے انسانوں کے ڈی این اے (DNA) تو اب تک استعمال ہوتے رہے ہیں لیکن کینیڈا کی عدالتی تاریخ میں پہلی بار ایک ملزم کو کسی حیوان کے ڈی این اے کی گواہی پر سزا ملی ہے۔ رسالہ ''نیچر'' واقعہ کو بیان کر کے لکھتا ہے کہ یہ ایک ایسی عدالتی نظیر ہے جس سے جرم کی تفتیش کا ایک نیا باب کھل گیا ہے۔

واقعات کے مطابق اکتوبر ۱۹۹۴ء میں ایک بتیس سالہ عورت جو کینیڈا کے پرنس ایڈورڈ آئی لینڈ کی رہنے والی تھی اچانک گھر سے غائب ہوگئی۔ پولیس نے چند روز کے بعد اس کی خون آلود کار کو برآمد کر لیا جو وقوعہ قتل کے بعد کہیں چھوڑ دی گئی تھی۔ مزید تین ہفتوں کے بعد ایک مردانہ جیکٹ بھی کہیں پڑی ہوئی مل گئی جس پر مقتولہ کے خون کے چھینٹے اور کسی بلی کے ستائیس بال گرے ہوئے تھے۔ یہ بال قاتل کی اپنی بلی کے تھے اور انہی نے اپنے مالک کے خلاف گواہ بن کر اسے پکڑ وادیا۔

پولیس نے پہلے تو جیکٹ پر گرے ہوئے بالوں کا تجزیہ کر کے ان کا ڈی این اے حاصل کیا اور پھر مشتبہ فرد کی بلی کے ڈی این اے سے مقابلہ کیا تو وہ دونوں ایک نکلے۔ پھر مزید تسلی کے لئے کینیڈا اور امریکہ کی اٹھائیس بلیوں کے ڈی این اے حاصل کر کے ان سے مقابلہ کیا لیکن وہ سب مختلف نکلے۔ چنانچہ بلی کا مالک گرفتار کر لیا اور جیوری کے سامنے بلی کی گواہی پیش کی گئی جو تسلیم کر لی گئی اور قاتل کو سزائے موت دی گئی۔ قاتل مقتولہ کا ڈی فیکٹو (بالفعل) خاوند تھا۔ اور دونوں کے تعلقات کچھ عرصہ سے کشیدہ تھے۔ قاتل بھی آہ بھر کر کہتا ہوگا میری بلی اور مجھ ہی کو میاؤں۔

انسان کا عمل بھی طائر یا پرندے کی طرح ہے جو خود تو اڑ جاتا ہے لیکن پیچھے اپنے آثار اور

نشان چھوڑ جاتا ہے۔اوراس طرح انسان کے اچھے برے اعمال کے لاتعداد نشانات اس کے اپنے وجود کے اندر اور اردگرد گواہیوں کے طور پر جمع ہوتے رہتے ہیں۔ان کا اکثر حصہ تو زندگی میں مخفی ہی رہتا ہےلیکن اس روز وہ سب ظاہر ہو جائیں گےجس کے بارہ میں خدانے فرمایا یَوْمَ تُبْلَى السَّرَّآئِر (الطارق:۱۰)یعنی جس دن پوشیدہ بھید ظاہر کردیئے جائیں گےسوائے اس کےجس پر اللہ رحم فرمادے۔اِلَّا مَنْ رَحِمَ اللّٰه (الدخان:۴۳)

(الفضل انٹرنیشنل 23.1.98)

ہنسی بہترین دوا ہے

رسالہ ''ہیلتھ اینڈ منسٹریٹر'' سڈنی کے مطابق موروپا ہسپتال (Motuya Hospital) میں (جو نیوساؤتھ ویلز کے جنوبی ساحل پر واقع ہے) مریضوں اور ہسپتال کے عملہ کے لئے ایک ہنسنے ہنسانے والا کمرہ (Laughter Room) تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کی بنیاد غالباً اس مقولہ پر ہے کہ ہنسی بہترین دوا ہے (Laughter is the Best Medicine)

اس کمرہ میں نت نئے دلچسپ کارٹون آویزاں کئے جاتے ہیں۔ نیز مزاحیہ آڈیو ویڈیو کیسٹس اور لطائف وغیرہ پر مبنی کتابیں رکھی گئی ہیں۔ تاکہ انسان جب ان کو دیکھے سنے یا پڑھے تو ان سے محظوظ ہو۔ ہسپتال والوں کا خیال ہے کہ اگر کچھ عرصہ کے لئے مریض خیالات بیماری وغیرہ سے ہٹا سکیں تو اس کے جلد صحت یاب ہونے کا امکان ہوتا ہے۔

سیانے کہتے ہیں کہ انسان کے خیالات اور سوچ کا اس کی بیماری اور صحت سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ مریض کی عیادت میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ مریض سمجھتا ہے کہ میں دنیا میں اکیلا اور بے کار نہیں ہوں بلکہ کچھ لوگ میرے لئے فکرمند ہیں اور مجھ سے پیار رکھتے ہیں اور دعائیں کرنے والے بھی ہیں۔ اس طرح اس کا حوصلہ بڑھتا ہے اور ادھر ادھر کی دلچسپ باتوں سے کچھ عرصہ کے لئے طبیعت بہل جاتی ہے اور خواہ وقتی طور پر ہی سہی مریض مایوسی و یاس سے چھٹکارا پاتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ مریض سے حوصلہ دلانے والی باتیں کرنی چاہئیں نہ کہ اس کو مزید مایوس کرنے والی۔ آنحضرت ﷺ جب کسی کی بیمار پرسی کرتے تو یوں فرماتے کوئی فکر کی بات نہیں۔ خدا چاہے تو تو اچھا ہو جاوے گا۔ (بخاری)

نیز آپؐ بیمار پرسی کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ

رسول مقبول ﷺ نے فرمایا کہ

''لوگو! بیماروں کی بیمار پرسی کرو۔ اور بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، قیدیوں کو چھڑایا کرو''

(بخاری۔ بحوالہ پیارے رسول کی پیاری باتیں۔ مصنفہ حضرت علامہ میر محمد اسحاق ؓ شائع کردہ انجمن ترقی اسلام سکندر آباد دکن، انڈیا)

(الفضل انٹرنیشنل 6.6.97)

آسٹریلیا کے قدیم باشندوں نے کیا دیا اور کیا لیا؟

آسٹریلیا میں کم از کم چالیس ہزار سال سے مقامی باشندے آباد تھے۔اپنے اپنے قبیلہ کے رسم ورواج کے پابند تھے۔جنگلوں میں جو کچھ ملتا اسے کھا کر اپنی بھوک مٹاتے۔ بیاہ شادی اور موت کی رسومات بھی ان میں تھیں ۔باوجود آزاد رہنے کے اپنے سرداروں اور بڑوں احترام کرتے تھے ۔ خوابیں جن کو ایک حدیث میں نبوت کا چالیسواں حصہ بتایا گیا ہے۔ان کے لئے رہنمائی کا ذریعہ تھیں ان کو یقین تھا کہ اس کائنات میں ایک برتر ہستی ہے۔جو ہر چیز سے پہلے موجود تھی۔جس نے دنیا کو پیدا کیا اور پھر آسمانوں پر چلی گئی اور وہ انہیں خوابوں میں آئندہ کی باتیں بتاتی ہے۔وہ ہستی سب کے پیدا کرنے والی ہے اور کوئی چیز ازلی ابدی طور پر اس کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ لوگ نہ شراب سے آشنا تھے نہ نشوں کے عادی تھے نہ کوئی ایسی جوئے کی لت انہیں تھی۔ان لوگوں کے مذہبی حالات حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشہور کتاب (Revelation, Rationality, Knowledge and Truth) کے صفحات ۲۱۷ تا ۲۳۴ میں درج کئے ہیں جو دوسروں کی تحقیق اور اپنے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہیں اور بہت دلچسپ ہیں۔

یورپین اقوام نے ان سے ان کا ملک چھینا۔ جہاں تک ہوسکا ان کو ختم کیا اور ملک کو اپنے انداز اور مفاد کے مطابق آباد کیا۔کالوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کا جو نتیجہ نکلا ہے اس کی ایک جھلک اس رپورٹ میں دیکھی جاسکتی ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے ۔لکھا ہے کہ ۲۰۰۱ءکے دوران یعنی صرف ایک سال کے عرصہ میں نیوساؤتھ ویلز آسٹریلیا میں کالوں کی کل آبادی کا پانچواں حصہ عدالتوں میں پیش کیا گیا۔اس تعداد میں ۲۰ تا ۲۴ سال کے کالے نوجوانوں کی کل آبادی کا

چالیس فیصد شامل تھا یعنی نو جوانوں کا حال تو بہت ہی خراب ہے۔ جرائم کا سبب کالوں کا منشیات اورالکحل کی لت میں مبتلا ہونا ہے۔

حکومت ان کو اتنا دیتی ہے کہ بغیر کوئی کام کیئے زندگی گزار سکتے ہیں لیکن بے کاری نے انہیں اخلاقی اور سماجی برائیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ جب خرچ پورے نہیں ہوتے تو چوریاں کرتے اور ڈاکے ڈالتے ہیں۔ ان میں وہ سب برائیاں رچ بس گئی ہیں جن میں گورے خود بھی مبتلا ہیں اور ان کے سمجھدار لوگ ان سے تنگ آ چکے ہیں لیکن کچھ نہیں کر سکتے بلکہ شخصی آزادی کے نام پر کھلی چھٹی دینے پر مجبور ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان طور طریقوں سے تنگ آنے کے باوجود ان کے خلاف کچھ سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اب ان کالوں کی اہلی زندگی برباد ہو چکی ہے۔ اکثر شادی کے بغیر رہتے ہیں نشہ آور اشیاء کھا کر بے کار پڑے رہتے ہیں یا ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 23.1.04)

شعوری طاقت سے چلنے والے ہوائی جہاز

آج کل پائیلٹ ایک ایسے انقلابی سسٹم تجربات کر رہے ہیں جو آخر کار انہیں اس قابل بنا دے گا کہ وہ محض اپنی شعوری طاقت (Mind Power) کے بل پر ہوائی جہاز چلایا کریں گے۔ کسی گئیر یا سوئچ کو ہاتھ نہیں لگانا پڑے گا۔

امریکہ کے ایک فوجی ہوائی اڈے پر اس ایجاد پر تجربات ہو رہے ہیں جس کے نتیجہ میں پائیلٹ بغیر ہاتھ ہلائے جہاز کو زمین سے بلند کر سکے گا، اڑا سکے گا اور زمین پر اتار سکے گا۔

ڈاکٹر اینڈریو جنکر (Dr. Andrew Junker) الیکٹریکل انجینئر ہونے کے ساتھ انسانی اعصاب کے ماہر (Neuro-Physiologist) بھی ہیں۔ گزشتہ پچیس سال سے ایک ایسے منصوبہ پر کام کر رہے ہیں جس کا مقصد ایسی مشینیں ایجاد کرنا ہے جو محض سوچنے کی طاقت سے کام کیا کریں گی۔ یعنی انسان کی توجہ ہی مشین کو چلانے کے لئے کافی ہوگی۔ ہاتھ پاؤں نہیں ہلانا پڑے گا۔ اس آلہ کا نام (Cyberlinks Interface) ہے۔ ایک سر کی پٹی (Head Band) انسانی سوچ کو اس آلہ میں منتقل کرے گا جو ریموٹ کنٹرول کی طرز پر مشین کی چلائے گا۔ اس کا پہلا تجربہ ورجن آئی لینڈ (Virgin Islands) کے نزدیک ایک کشتی کو چلانے کے لئے کامیابی کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔

مذکورہ بالا تجربات امریکہ میں Ohio کے ایک فوجی ہوائی اڈے پر کئے جا رہے ہیں۔ وہاں ایک مصنوعی نظام (Simulator) پر تجربات سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ جیٹ ہوائی جہاز بغیر ہاتھ پاؤں چلائے محض ذہنی قوت سے بھی چلائے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جنکر کا کہنا ہے کہ دس بیس سال

میں حقیقت کی دنیا میں بھی ہوائی جہاز خیالی وشعوری طاقت کی مدد سے چلائے جاسکیں گے۔

چونکہ اس امر کا امکان ہے کہ پائیلٹ ہر وقت اپنی توجہ جہاز پر نہیں رکھ سکے گا اور ادھر اُدھر کے خیالات بھی اس کے ذہن میں پیدا ہوں گے لہٰذا اس طرح کے آوارہ خیالات کو جہاز کی مشینوں پر منتقل ہونے سے بچانے کے لئے ایک فلٹر بھی لگا ہوگا اور اگر کہیں پائیلٹ کو اونگھ آجائے اور آلہ محسوس کرے کہ اس کو چلانے والی طاقت کمزور یا ڈھیلی پڑ گئی ہے تو ایک مددگار خودکار نظام جہاز کا کنٹرول سنبھال لے گا۔لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسافروں کو ایسے جہاز پر سفر کرنے کے لئے آمادہ کیا جاسکے گا جس کا چلانے والا اونگھ یا نیند کا شکار ہوسکتا ہو۔

جب اس طرح کا آلہ ایجاد ہو جائے گا تو وہ کاروں ،ٹرینوں،کارخانوں،گھروں اور ہسپتالوں وغیرہ میں بھی استعمال ہوسکے گا۔

سوچنے کی بات ہے کہ وہ خدا جس نے انسان کو ایسی شعوری طاقت عطا کی ہے جس سے جہاز اڑائے اور کنٹرول کئے جاسکتے ہیں کیا وہ خود اپنے ارادہ کی قوت سے محض ایک ''کن'' کہنے سے کارخانہ عالم میں تیرنے والے کھربوں کھرب ستاروں کو وجود میں لانے اور اڑائے رکھنے پر قادر نہیں ہوگا! اور پھر اس قدیر وحکیم خدا کو نہ تو اونگھ آتی ہے نہ نیند۔کیا ان مادہ پرستوں کے لئے اب بھی یہ سوچنے کا وقت نہیں آیا کہ اس عالم کون ومکاں کا ایک خالق ہے جو حی وقیوم ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 23.1.2004)

امریکی ادارہ CIA نے چھٹی حس کی حقیقت تسلیم کرلی

لیکن یہ جاسوسی کے لئے کار آمد نہیں

اللہ تعالیٰ نے انسانی روح کو کئی قسم کے خواص سے نوازا ہے۔انسان کی پانچ حسیں تو مشہور ہیں جن کو حواس خمسہ کہا جاتا ہے یعنی دیکھنا، سننا، چکھنا، چھونا اور سونگھنا۔لیکن ان کے علاوہ بھی ایک حس کبھی کبھار کام کرتی نظر آتی ہے جس کو چھٹی حس یا ماورائے ادراک حسیہ (Extra-Sensory Perception) کہا جاتا ہے اور جس کا مخفف ESP اکثر استعمال ہوتا ہے۔جس کا مطلب ہے کہ انسان بعض دفعہ حواس خمسہ کو استعمال کئے بغیر پیغام دے سکتا ہے یا وصول کرسکتا ہے۔ ESP کا مطالعہ نفسیات کی برانچ پیراسائیکالوجی کا کام ہے لیکن اس کے وجود یا عدم وجود کے بارہ میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ ESP کی تین شاخیں ہیں ایک تو ٹیلی پیتھی ہے جس کے ذریعہ ایک شخص کے خیالات و جذبات دوسرا آدمی اسی وقت دور بیٹھے لاشعوری طور پر محسوس کرلیتا ہے دور کہیں ایک عزیز کو کوئی صدمہ پہنچا تو اسی وقت اس طرح کے جذبات اس کے کسی پیارے کے دل میں بھی پیدا ہو گئے۔ دوسری شاخ کو Clairvoyance کہتے ہیں۔اس میں بعض چیزوں، واقعات یا اشخاص کی موجودگی کا بغیر حواس خمسہ کی مدد کے احساس ہوجاتا ہے تیسری شاخ Precognition کہلاتی ہے جس کا مطلب ہے کہ پہلی دو شاخوں کی مدد سے آئندہ ہونے والے واقعات کا اندازہ لگانا۔ان کے علاوہ ایک اور شاخ بھی ہے اس کو Psychokinesis کہتے ہیں۔اس میں انسان محض اپنی ذہنی قوت کے ذریعہ مادی چیزوں پر اثر ڈالتا ہے اور اپنی قوت ارادی سے دیا سلائی وغیرہ کسی چیز کو نیچے

گرادیتاہے(لیکن ان چیزوں کا نیکی وتقویٰ اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں)

جن دنوں امریکہ اور روس کی سرد جنگ جاری تھی تو سی آئی اے کو احساس ہوا کہ ہم شاید ESP کے استعمال میں روس سے پیچھے رہ گئے ہیں تو بقول پروفیسر Jessica Utis سی آئی اے نے کچھ ایسے آدمی بھرتی کئے جو اس علم کے شناسا ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ Ms Utis جو کیلیفورنیا یونیورسٹی کی پروفیسر ہیں وہ بھی اس تحقیق میں شامل تھیں اس گروپ کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ اس علم کی مدد سے روس کے ایک سو سیاسی وفوجی نشانوں کا پتہ لگائیں ان میں وہ ۵۲ امریکی یرغمالی بھی شامل تھے جو ایران میں ۱۹۷۹ء میں ۴۴۴ دن تک محصور رہے۔ اس کے علاوہ ان کو روسی اور امریکی ہوائی جہازوں اور پانی کی تہہ میں آبدوزوں سے رابطہ کا فرض بھی سونپا گیا تھا۔ پروفیسر صاحبہ نے کہا کہ انہوں نے ان سب کوششوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اور ان دستاویزات کے معائنہ کے بعد وہ کہہ سکتی ہیں کہ ایسے حتمی شواہد ملے ہیں جن سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ESP (یعنی چھٹی حس) ایک حقیقت ہے اور یہ علم ایسا ہی ہے جیسے دوسرے سائنسی علوم۔

دوسری طرف امریکی Senate Appropriations Committee نے بھی اس طرح کی تحقیق ایک دوسرے ادارہ کے سپرد کی تھی ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ انہوں نے نہایت اہم شواہد ESP کے حق میں دیکھے ہیں لیکن یہ ایسے نہیں کہ ان کے ذریعہ کوئی قابل اعتماد راز نیشنل سیکوریٹی کے مقصد کے لئے حاصل کئے جاسکیں بس لیبارٹری کی حد تک ہی یہ تجربات کچھ کامیاب کہے جاسکتے ہیں۔

(خبر ماخوذ ہیرلڈ، ABC TV پروگرام)

(الفضل انٹرنیشنل 22.3.96)

آسٹریلیا کی طرف سے دنیا کو فلو کے علاج کا تحفہ

عام زکام تو الرجی یا جراثیم وغیرہ سے لگتا ہے لیکن انفلوئنزا جسے مختصراً فلو کہا جاتا ہے ایک ایسے وائرس کی انفیکشن سے ہوتا ہے جو جلدی جلدی اپنی ہیئت بدل لیتا ہے (Mutate) جس کی وجہ سے اس پر کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی ۔ جسم کا قدرتی مدافعتی نظام ہی وائرس کا مقابلہ کرتا ہے جو اپنی عمر پوری کر کے ختم ہوتا ہے اس لئے جب دوا سے زکام کو آرام نہ آئے تو کہتے تھے فلو ہو گیا ہے ۔ ایک زمانہ میں یوں بھی زکام کو فلو کہنا فیشن ہو گیا تھا اور غریبوں کو زکام اور امیروں کو فلو ہوا کرتا تھا ۔ یہ تو خبر ایک جملہ معترضہ تھا ۔ واقعہ یوں ہے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخر میں ڈاکٹر لیور Laver نے معلوم کیا کہ فلو کے وائرس کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو متغیر نہیں ہوتا چنانچہ وائرس کا پروٹین کرسٹل کی شکل میں اکٹھا کیا گیا ۔ ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر کولمین نے اس مالیکیول کو کروڑوں گنا بڑا کیا تا کہ دوا اس جگہ پہنچائی جائے جو تبدیل نہیں ہوتی چنانچہ وہ جگہ اور دوا دریافت کر لی گئی لیکن یہ دوا وائرس کو ختم نہیں کرے گی بلکہ اس کی افزائش کو آہستہ کر دے گی اور اس طرح جسم کا مدافعتی نظام آسانی سے وائرس کو ختم کر سکے گا ۔

یہ دوا جو فلو کے خلاف ۹۵ فیصد مؤثر سمجھی جاتی ہے تین سال تک گلیکسو ویلکم کے ذریعہ مارکیٹ میں آ جائے گی ۔

(الفضل انٹرنیشنل 22.3.96)

فضائی آلودگی میں مضمر فوائد

بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ فضائی آلودگی جو زیادہ تر کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس سے پیدا ہوتی ہے اس میں بعض فوائد بھی پنہاں ہیں جب کہ اس کے نقصانات تو ظاہر و باہر ہیں جس سے دنیا کی سبھی حکومتیں پریشان ہیں۔ لیکن اس پر کسی نے نہیں سوچا تھا کہ فضائی آلودگی کا کوئی فائدہ بھی ہے یا نہیں۔ آسٹریلیا کے ایک مشہور تحقیقی ادارہ نے اب اس پر تحقیق کی ہے کہ جب فضا میں آلودگی بڑھ جائے گی تو اس کے فصلوں پر کیا اثرات مترتب ہوں گے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے ایک ایسا گرین ہاؤس تعمیر کیا گیا جس میں سن ۲۰۵۰ء میں متوقع حالات مصنوعی طور پر پیدا کئے گئے اور اس میں مختلف فصلیں اور پھلدار درخت لگائے گئے۔ فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار صنعتی انقلاب سے پہلے ۲۷۰ پی۔ پی۔ ایم (Parts Per Million) تھی جو بڑھ کر اب ۳۵۰ ہوگئی ہے اور ۲۰۵۰ء میں ۵۴۰ متوقع ہے۔

اس قدر بڑھی ہوئی کاربن ڈائی آکسائیڈ نے فصلوں اور پھلوں پر حیران کن طور پر خوشگوار اثر ڈالا۔ بتاو یہ قسم کی گندم کا جھاڑ آج کل کے مقابلہ میں دگنا ہوگیا۔ پکنے میں نصف وقت لیا۔ سٹہ اور تنا کہیں زیادہ مضبوط ہوگئے۔ چاول کی پیداوار میں ۵۸ فیصد اضافہ ہوا۔ درخت پودے اور گھاس جلد جلد بڑھے اور پیداوار کہیں زیادہ بڑھ گئی لہذا اسی زمین پر دگنی گائیں پالی جاسکیں گی۔

اللہ تعالیٰ کا بھی عجیب نظام ہے عالم حیوانات اور عالم نباتات ایک دوسرے کے لئے قیام کا موجب بنائے گئے ہیں۔ انسان حیوان آکسیجن کھا کر کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا کرتے ہیں جو نباتات کی غذا ہے جب کہ وہ آکسیجن پیدا کرتے ہیں جو انسان اور حیوان کی غذا ہے۔ جب فضا میں کاربن

ڈائی آکسائیڈ زیادہ ہوگی تو پودے اپنی کاربن کی ضرورت آسانی سے بافراغت حاصل کر کے خوب موٹے تازے ہوجائیں گے۔اس طرح جوں جوں انسان اور مشینیں زیادہ بڑھیں گی تو ان کی خوراک کے لئے اسی قدر فصلیں زیادہ مقدار میں غذا مہیا کرنے لگیں گی۔گرمی کے بڑھنے سے بارشیں بڑھیں گی اور بند (Dams) اور نہروں کے ذریعہ زیادہ علاقہ سیراب ہونے لگے گا وغیرہ وغیرہ الغرض وہ خدا جس نے پیدا کیا ہے آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ خوراک مہیا کرنے کا سامان بھی بڑھاتا چلا جائے گا جیسا کہ ماضی میں اب تک ہوتا آیا ہے۔فالحمدللہ علیٰ ذالک

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِلسَّآئِلِيْنَ o (حٰمٓ السجدہ:۱۱)

''اوراس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے ہیں اوراس میں بڑی برکت رکھی ہے اوراس میں رہنے والوں کے کھانے پینے کے لئے ہر چیز کو اندازہ کے مطابق بنادیا ہے یہ سب کچھ چار دور میں کیا ہے۔یہ بات سب پوچھنے والوں کے لئے برابر ہے۔''

اس کی تشریح میں حضرت مصلح موعودؓ تفسیر صغیر میں فرماتے ہیں:

''اس آیت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ایک زمانہ میں زمین کو پوری غذا پیدا کرنے کے قابل نہیں سمجھا جائے گا مگر اللہ تعالیٰ اس کا رد کرتا ہے اورفرماتا ہے ہم نے زمین میں ایسے سامان پیدا کردیئے جن کی وجہ سے وہ حسب ضرورت غذا دے گی خواہ زمین سے نکال کر یا نئی غذا کے ایجاد ہونے سے یا آسمانی شعاؤں کی مدد سے۔''

(الفضل انٹرنیشنل 23.3.96)

اگر سطح سمندر صرف ایک میٹر بلند ہو جائے تو کیا ہو؟

زمین سے گیسوں کے اخراج اور گرین ہاؤس اثر کے نتیجہ میں زمین روز بروز گرم ہو رہی ہے بارشوں اور سطح سمندر میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اندازہ ہے کہ سن ۲۱۰۰ء تک سطح سمندر ۲۰ تا ۹۰ سینٹی میٹر تک اونچی ہو جائے گی۔ اس اضافہ سے ملائشیا، انڈیا، بنگلہ دیش سمندروں کے ساحل پر آباد شہر اور جزیروں کے کروڑ ہا افراد اپنی زمینوں اور گھروں کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے اندازاً ایک سو ملین (دس کروڑ) افراد دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر ہر سال مجبور ہوں گے جس سے آسٹریلیا جیسے ملکوں کو ابھی سے فکر پڑ گئی ہے۔ بہت سے ملکوں کا پورا اقتصادی ڈھانچہ مفلوج ہو کر رہ جائے گا۔

رپورٹ کے مصنف نے کہا کہ ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے مستقبل دن بدن غیر یقینی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج سے ربع صدی پہلے تک تو یہ کیفیت نہ تھی۔

(الفضل انٹرنیشنل 23.2.96)

بچے کے وجود کی تعمیر میں ماں باپ دونوں کا حصہ برابر ہوتا ہے

بچہ پیدا ہوا تو گھر کی عورتوں نے اسے گھیر لیا اور اس کے ناک نقشہ پر تبصرے ہونے لگے۔ ایک نے کہا اس کی آنکھیں باپ کی ہیں۔ دوسری نے کہا اس کا ناک ماں کا ہے۔ تیسری بولی ماتھا بالکل دادی کا ہے۔ چوتھی نے کہا ٹھوڑی بالکل ماموں کی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک عورت جو ذرا ہٹ کر بیٹھی ہوئی تھی پکاری کہ اس غریب کا اپنا بھی کچھ ہے یا سب کچھ مانگا تانگا ہی ہے۔

یہ لطیفہ عام سوچ کے مطابق ہے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ بچہ جینز (Genes) کا ایک سیٹ باپ سے لیتا ہے اور ایک سیٹ ماں سے اور پھر وہ دونوں آپس میں یوں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں کہ محض اتفاق سے وہ بعض کیریکٹر یا بناوٹ باپ کی طرف سے لیتا ہے اور بعض ماں کی طرف سے مثلاً جیسے یہ کہا جائے کہ بچہ نے حس مزاح ماں سے لی ہے اور پیشہ کا رجحان باپ ہے۔

لیکن نئی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ یہ محض اتفاق نہیں کہ بعض کیریکٹر باپ سے آتے ہیں اور بعض ماں کی طرف سے بلکہ انسانی وجود کے مخصوص اور معلوم حصے ہیں جو باپ یا ماں کی طرف سے بچہ کو ورثہ میں ملتے ہیں۔ مثلاً دماغ کا وہ حصہ جو ہمارے جذبات کو کنٹرول کرتا ہے وہ باپ کے جینز سے بنتا ہے اور دماغ کا وہ حصہ جس کا تعلق قوت فیصلہ اور ذہانت سے ہے وہ ماں کی طرف سے آتا ہے۔

کوئی دس سال تک جینز کے ماہرین کا خیال تھا کہ جینز بس جینز ہی ہوتے ہیں ان میں نر و مادہ کی تخصیص نہیں ہوتی لہذا وہ خواہ باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لیکن یہ تصور اب باقی نہیں رہا۔ جینز میں بھی نر و مادہ کی تخصیص ہوتی ہے۔ اور ہر ایک کا جسم کی تخلیق میں ایک طے شدہ حصہ ہوتا ہے۔ یہ بات پہلے کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر عظیم سورانی نے دریافت کی تھی۔ اور پھر دوسرے سائنس دانوں نے اس کی توثیق کی۔

ڈاکٹر عظیم سورانی نے اپنے تجربات دودھ پلانے والے جانوروں (Mammals) پر کیئے۔ انہوں نے ایک انڈہ (Egg) مادہ کا لیا اور اس میں سے DNA حاصل کر کے اس میں سپرم سیلز (Sperm Cells) کے دو DNA ملائے لیکن باوجود یکہ جینز کا باہمی تناسب معمول کے مطابق تھا کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے دو انڈوں کے DNA ایک ایسے انڈے میں داخل کیئے جس کا اپنا DNA نکالا ہوا تھا۔ لیکن تب بھی بچہ نہ بنا۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ ہر چیز کا باہمی تناسب اور تعداد وغیرہ درست ہونا ہی کافی نہیں بلکہ ان کا نصف نر سے اور نصف مادہ سے آنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ بچہ کی نشوونما کے دوران ایسے مراحل آتے ہیں کہ ان کا آغاز کرنے کے لئے کبھی باپ کے جینز کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی ماں کے جینز کی۔ سائنس دان سمجھتے ہیں کہ اس تحقیق نے عورتوں کا پلہ مردوں سے بھاری کر دیا ہے اور آج وہ فخر سے یہ کہہ سکتی ہیں کہ بچہ کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں اور استعدادوں میں ماں کے جینز کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا باپ کا۔ چنانچہ بچہ ایک ایسے نطفہ سے پیدا ہوتا ہے جو ماں باپ کے پانی کے امتزاج سے بنتا ہے گویا وہ ایک ایسا بیج ہے جو دو بیجوں کے ملنے جلنے سے وجود میں آتا ہے اور ماں کا زائد کام یہ ہوتا ہے کہ وہ بطور اس زمین یا کھیتی کے بھی کام کرتی ہے جس میں وہ ملا جلا بیج اگتا ہے۔

ریسرچر کہتے ہیں کہ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بچہ جس نالی کے ذریعہ اپنی ماں سے غذائیت اور آکسیجن حاصل کرتا ہے (Placenta) وہ باپ کے جینز سے نشوونما پاتی ہے۔ نر سے آنے والے جینز جارح (Aggressive) ہوتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ چھینا جھپٹی کر کے بچہ کے لئے جتنی غذا حاصل کرنی ممکن ہے وہ حاصل کر لی جائے۔ اس کے بالمقابل مادہ کے جینز میں صبر اور برداشت کا مادہ ہوتا ہے اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ نر جینز کی حرص کو حد اعتدال میں رکھیں تا ماں کا شوگر لیول حد سے نیچے نہ گر جائے۔

یہ تجربات فی الحال چوہوں پر کیئے گئے ہیں اس لئے ماہرین انہیں انسانوں پر منطبق کرنے

میں احتیاط سے کام لے رہے ہیں۔

(ماخوذ از رپورٹ Jerome Burne دی گارڈین۔ بحوالہ سڈنی ہیرلڈ ۶ جون ۱۹۹۷ء)

اگر مزید تحقیق کے نتیجہ میں یہ باتیں انسانوں پر بھی صادق آ جائیں تو اس سے وقت کے ساتھ ساتھ انسانی سوچ اور سماجی مسائل میں کئی دوررس تبدیلیاں پیدا ہونگی۔ یہ خیال کہ بچہ کے لئے تخم صرف نر مہیا کرتا ہے اور مادہ صرف بطور زمین یا کھیتی کے ہوتی ہے غلط ثابت ہو جائے گا کیونکہ تخم یا بیج نر و مادہ دونوں کے پانی کے خلط ملط سے پیدا ہوتا ہے اور مادہ کا یہ کردار کہ وہ بطور قطعہ زمین کے پودے کو بڑھنے کے لئے قوت فراہم کرتی ہے ایک ضروری مگر زائد فعل کے طور پر ہے۔ قرآن کریم نے انسانی تخلیق میں عورت کے ان دونوں کرداروں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ''نِسَآئُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ'' (البقرہ:۲۲۴) یعنی تمہاری بیویاں تمہارے لئے (ایک قسم کی) کھیتی ہیں۔ اور دوسری جگہ فرمایا ''اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ '' (الدھر:۳) یعنی ہم نے انسان کو ایسے نطفہ سے پیدا کیا ہے جو ملا جلا ہے۔ اس میں ایک ایسے نطفہ کا ذکر ہے جو نر و مادہ دونوں کے پانیوں کے اختلاط سے وجود میں آتا ہے صرف مرد کا نطفہ مراد نہیں۔ مشج عربی میں دو چیزوں یا رنگوں کے باہم ملنے کو کہتے ہیں۔ اور امشاج اس کی جمع ہے۔ اس لحاظ سے یہ تحقیق کہ ماں باپ دونوں ہونے والے بچہ کو تئیس تئیس کروموسوم مہیا کرتے ہیں اور دونوں کے جینز مل کر بچہ کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں نہ صرف قرآن کے مطابق ہے بلکہ قرآن کریم کا ایک علمی اعجاز ہے۔

اس تحقیق سے ذات برادری کے مسئلہ پر بھی دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ اور اس سے ایک نئی سوچ ابھرتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر بچہ میں ماں باپ دونوں کی طرف سے برابر کروموسوم اور جینز آتے ہیں اور اس میں باپ کا پلڑہ ماں سے بھاری نہیں تو ذات برادری صرف باپ کی طرف سے کیوں چلے، ماں کی طرف سے کیوں نہیں۔ ویسے اس طرح کی سوچ مغربی آسٹریلیا میں پہلے ہی پیدا ہو چکی ہے۔ میں نے جب بھی کسی سے پوچھا کہ آپ کے آباؤ اجداد کس ملک سے آ کر آسٹریلیا میں آباد ہوئے تھے تو اگرچہ میرے ذہن میں صرف باپ دادے کا اصل وطن پوچھنا ہی مقصود ہوتا تھا مگر مجھے ہمیشہ اس طرح کا جواب ملا ہے کہ میرا باپ سکاٹ لینڈ سے تھا اور ماں اٹلی سے۔ بلکہ اپنی دادی نانی کا بھی بتانا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ فلاں فلاں ملک سے تھے۔ اس لحاظ سے تو تمام انسان ایک ایسے سمندر کی

حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جس میں سب دنیا کے پانی خلط ملط ہو چکے ہوں۔اب ذرا اس میں کوئی مختلف براعظموں، ملکوں اور جزائر کے پانیوں کو الگ الگ کر کے دکھائے تو جانیں۔گویا ذات پات قبیلے محض شناخت کے لئے رہ جاتے ہیں۔اور ان کی یہی غرض قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے۔

وحدت انسانی کے سلسلہ میں ایک اہم ریسرچ کا ذکر بھی یہاں مناسب ہوگا۔سائنس دانوں نے ۱۹۸۷ء میں ایک تحقیق شائع کی تھی جس سے ثابت ہوا تھا کہ دنیا بھر میں جو مختلف رنگ ونسل کے لوگ پھیلے ہوئے ہیں ان میں ایک ایسا جین (Gene) مشترک ہے جو صرف ماں ہی بچے کو منتقل کر سکتی ہے۔(یعنی Mitochondria) گویا تحقیق سے یہ تصور درست معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔سائنس دانوں نے بھی اس ماں کا نام Eve یعنی حوا رکھا ہے۔اس تحقیق کے آٹھ سال بعد ۱۹۹۵ء میں دنیا کی تین معروف یونیورسٹیوں (Yale, Harward, Chicago) نے (Y-chromosome) وائی کروموسوم کا تجزیہ کیا جوان ۳۸ مردوں سے لئے گئے تھے جن کا تعلق مختلف قوموں اور نسلوں سے تھا۔ وائی کروموسوم وہ ہوتے ہیں جو جنین (Embryo) کو لڑکا بناتے ہیں۔تینوں یونیورسٹیوں کی تحقیق نے ثابت کیا کہ اپنی ولدیت میں بھی سب انسان مشترک ہیں۔لیکن اس بار اس جدامجد کا نام انہوں نے آدم نہیں رکھا۔ بلکہ یہ خیال ظاہر کیا کہ دنیا کے سب انسان شاید چند ہزار پر مشتمل ایک گروپ کی شاخیں درشاخیں ہیں جن میں باپ کی طرف سے ایک قدر مشترک تھی۔پچھلی تحقیق کو موجودہ سے ملا کر اگر دیکھا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے انسان خواہ وہ کسی ذات پات یا ملک وقوم کے ہوں ان میں ماں باپ دونوں کی طرف سے ایک قدر مشترک ضرور موجود ہے۔چنانچہ اخبار نے اس رپورٹ پر جو عنوان جمایا وہ تھا (We are all Related") یعنی ہم سب انسان باہم رشتہ دار ہیں۔

(ماخوذ از واشنگٹن پوسٹ۔لاس اینجلیز ٹائم بحوالہ سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۷ مئی ۱۹۹۵ء)

معلوم ہوتا ہے یہ قدر مشترک وہی ہے جس کا ذکر خدا نے یوں فرمایا ہے ’’اے لوگو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک ہی جان (نفس واحدہ) سے پیدا کیا.....‘‘(النساء:۲)

یہ جدید تحقیقات کئی پرانے تصورات پر کاری ضرب لگاتی ہیں۔مثلاً یہ تصور کہ نسل صرف بیٹوں سے چلتی ہے بیٹیوں سے نہیں۔اگر ماں باپ دونوں کی طرف سے جینز یکساں طور پر منتقل ہوتے

ہیں تو ان کی نسبت بھی یکساں ہوئی ۔یوں مرد وعورت کی نسل لڑکے اورلڑکی اوران کی اولادوں میں یکساں طور پر چلتی چلی جاتی ہیں۔اورنسلی تعلق کے لحاظ سے بیٹے بیٹی اور پوتے نواسے میں کوئی فرق نہ رہا۔لیکن ایشیائی اورافریقی مما لک میں کتنے لوگ ایسا سمجھتے ہیں !؟ ماں باپ دونوں کی طرف سے یکساں جین اولادمیں منتقل ہونے کی تھیوری نے رحمی تعلقات کی اہمیت بھی خوب اجاگر کی ہے۔رشتہ دار باپ کی طرف سے ہوں یاماں کی طرف سے دونوں کے ساتھ آپ کے جین یکساں طور پر مشترک ہوتے ہیں اوران میں سے کسی کواپنی زبان یاہاتھ سے دکھ پہنچانا ایسے ہی ہے جیسے خوداپنے وجود کے ایک حصہ کوخارش کرتے کرتے زخمی کردینا۔

الغرض صدیوں سے جوتصورات چلے آتے ہیں ان کا اگر جدید سائنسی انکشافات کی روشنی میں جائزہ لیاجائے تو کافی دلچسپ باتیں سامنے آسکتی ہیں۔

ع صلائے عام ہے یاران نکتہ دان کے لئے

(الفضل انٹرنیشنل 2.1.98)

پندرہ کروڑ سال سوئے رہنے کے بعد

نئی زندگی پانے والا درخت

یہ بھی خدا کی قدرت کا ایک نمونہ ہے کہ ایک درخت کا ذرہ جو پندرہ کروڑ سال تک ایک پرندے کے پیٹ میں پڑا رہا۔ اب نئی زندگی پا کر ہزاروں ناظرین کے لئے حیرت واستعجاب کا موجب بنا ہوا ہے۔ اس کی خوابیدہ حالت اچانک حیات نو میں بدل چکی ہے۔

آج سے دس سال قبل سڈنی کے وُولمی نیشنل پارک سے ایک سیاہ رنگ کا پتھر ملا۔ معائنہ سے پتہ چلا کہ وہ پندرہ کروڑ سال پرانے ایک پرندے کا متحجر ڈھانچہ تھا۔ اس کے پیٹ میں سے ایک چیڑ (Pine) کے درخت کا ایک ذرہ دستیاب ہوا جو کبھی اس نے کھایا ہوگا۔ پارک کے نام کی مناسبت سے اسے (Wollemi Pine) کا نام دیا گیا۔ اس ذرہ سے اس درخت کا DNA حاصل کیا گیا جو کروڑوں سال پہلے سڈنی کے شمال مغربی علاقہ میں ہوا کرتے تھے۔ مگر جن کی نوع کسی طبعی حادثہ کے نتیجہ میں ناپید ہو چکی ہے۔

یہ خبر دنیا بھر کے ماہرین نے بہت دلچسپی سے سنی اور وہ اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں اس ناپید پودہ کو دوبارہ اگانے کا تجربہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ پودہ کی افزائش کے لئے خاص ماحول تیار کیا گیا تھا۔ تجربہ کامیاب رہا اور اب یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا یہ پودہ دنیا کے آج کل کے ماحول میں زندہ رہتا ہے یا نہیں اس کو ٹرک پر لاد کر ادھر ادھر گھمایا پھرایا گیا۔ کبھی روشنی اور کبھی تاریکی میں بھی رکھا گیا۔ اب تک تو وہ پودہ دیکھنے کے لئے کثرت سے لوگ آتے ہیں۔ اب اسے امریکہ میں مسّوری

نیویارک اور واشنگٹن بھیجا جا رہا ہے اس سے پتہ لگے گا کہ وہ امریکہ کی آب وہوا میں کیسا پرورش پاتا ہے۔ بہت لوگوں کو اس عجوبہ کو اپنے گھروں میں اگانے کا شوق ہے۔ چنانچہ اس کے فی الحال ۵۰۰ پودے تیار کئے جا رہے ہیں جو اکتوبر ۲۰۰۵ء میں فروخت کئے جائیں گے۔

(ماخوذ از سڈنی مارننگ ہیرلڈ ے ستمبر ۲۰۰۴ء)

(الفضل انٹرنیشنل 19.11.04)

ہندوستان میں معصوم بچیوں کا قتل اور اس کی وجوہات

اخبار انڈی پنڈنٹ میں خبر شائع ہوئی ہے کہ ہندوستان میں ننھی بچیوں کے قتل کے واقعات آج کل بھی کثرت سے ہو رہے ہیں۔ بعض بچیوں کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ بعض کو زہر دے دیا جاتا ہے یا کبھی ایسے واقعات ہوتے ہیں جیسے گجرات میں ہوا کہ ایک بچی کو اس کی ماں کے بازوؤں سے چھین کر ایک خالی گھر میں پھینک دیا گیا جہاں اس کی دردناک چیخیں کسی کا دل نہ ہلا سکیں اور بالآخر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں۔ بچیوں کے قتل کا ایک اور طریق یہ ہے کہ پیدائش سے قبل بچے کی صنف مختلف ٹیسٹوں (جیسے Amniocentesis, Ultrasound) کے ذریعہ معلوم کر لی جاتی ہے اور اگر بچی ہو تو حمل گرا کر مار دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جب کہ باقی دنیا میں ہر سو مردوں کے مقابلہ میں ۱۰۵ عورتیں ہیں، ہندوستان میں ان کی تعداد صرف ۹۳ ہے بلکہ بعض علاقوں میں تو ۱۰۰ مردوں کے مقابلہ میں صرف ۸۵ عورتیں ہیں۔ اس پر اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسف (Unicef) نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے زیادہ شرمناک بات اور کوئی نہ ہوگی کہ ہندوستان کی آبادی سے چار تا پانچ کروڑ بچیاں اور عورتیں غائب ہیں چنانچہ یکم جنوری ۱۹۹۲ء سے ہندوستان میں پیدائش سے پہلے بچہ کی جنس معلوم کرنا جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس حکم پر عمل بھی کرایا جا سکے گا یا نہیں۔

قرآن کریم میں پیش گوئی تھی کہ ایک وقت آئے گا کہ بچیوں کے قتل پر مؤاخذہ ہوگا۔ جیسے فرمایا ”اور جب زندہ گاڑی جانے والی (لڑکی) کے بارہ میں سوال کیا جائے گا (کہ آخر) کس گناہ کے بدلہ میں اس کو قتل کیا گیا تھا۔“ (التکویر:۹،۱۰) چنانچہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہاں

بچیوں کے قتل کو ممنوع قرار دینے کے لئے ۱۸۷۰ء میں حکومت انگریزی نے قانون بنایا تھا جو اب تک وہاں جاری ہے لیکن افسوس کہ اس کی خلاف ورزی بدستور جاری ہے۔ حکومت ہندوستان کا نیا قانون بھی ایک لحاظ سے اسی کی ذیل میں آتا ہے۔

آگے چل کر اخبار مذکور بچیوں کے قتل کا ذمہ دار جہیز کی منحوس رسم کو ٹھہراتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بچی کو اس لئے بوجھ تصور کیا جاتا ہے کہ اس کو پالنے پوسنے کا فائدہ تو کوئی ہے نہیں الٹا اس کے جہیز پر کثیر رقم خرچ کرنا پڑے گی۔ وہاں اکثر یہ کہاوت بیان کی جاتی ہے کہ لڑکی کی پرورش کرنا تو ہمسائے کے باغ کو پانی دینے کے مترادف ہے۔ غریب والدین کو اپنی بچی کو جہیز میں بائیسکل، ٹی وی، ریشمی ساڑھی اور سونے کے زیورات لازماً دینے پڑتے ہیں جس کا قرضہ وہ ساری عمر نہیں اتار سکتے ۔ یہ رقم لڑکے کی تعلیم اور ملازمت وغیرہ کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے اور آئی سی ایس افسر کو داماد بنانے کے لئے کم از کم ساٹھ ہزار ڈالر کی رقم جہیز کے لئے درکار ہوگی۔ اخباروں میں اشتہار آتے ہیں کہ پیدائش سے پہلے پانچ سو روپیہ خرچ کر کے بچے کی جنس کا پتہ کروالیں اور بعد کے ہزاروں روپے بچائیں ۔ بعض بچیاں جو اپنے غریب والدین سے سسرال کی خواہش کے مطابق جہیز نہیں لاسکتیں اور بعد میں بھی ان کے مطالبات پورے نہیں کر سکتیں ان کی ساری زندگی جہنم بنادی جاتی ہے۔ بلکہ ایک خاصی تعداد کو مٹی کا تیل پھینک کر آگ میں جلادیا جاتا ہے اور بہانہ یہ بنایا جاتا ہے کہ تیل کا چولہا پھٹ گیا تھا۔ بے شمار بچیاں ساری عمر شادی کے انتظار میں بوڑھی ہوجاتی ہیں۔

بدقسمتی سے جہیز کے مطالبہ کی لعنت ہندوؤں کے زیر اثر پاکستان میں بھی آچکی ہے ۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ان رسوم کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تھا۔ مبارک ہیں وہ جو خلیفہ وقت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس جہاد میں شامل ہوتے ہیں اور کمزور بچیوں اور ان کے والدین کو ان کے دکھوں سے آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ نے تحریک فرمائی تھی کہ امیر لوگ جتنا خرچ اپنی بچیوں کی شادی پر کرتے ہیں وہ اس کا دسواں حصہ غریب بچیوں کی شادی پر بھی خرچ کریں ۔ یہ بڑی مبارک اور خدا کا رحم جذب کرنے والی تحریک ہے۔ خدا ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

(الفضل انٹرنیشنل 19.7.96)

شادی سے پہلے ''شادی کورس'' پاس کرنا لازمی قرار دیا جائے

کیتھولک چرچ کا حکومت آسٹریلیا سے مطالبہ

آسٹریلیا میں چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے بھی سرٹیفکیٹ لینا ضروری ہے لیکن اگر نہیں ہے تو شادی کرنے کے لئے نہیں ہے۔ چنانچہ اس طرف توجہ دلاتے ہوئے کیتھولک چرچ کے وکیل نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ طلاقوں کی تباہ کن بھرمار کو روکنے کے لئے شادی کا ارادہ کرنے والے خواتین وحضرات کو شادی کی اہمیت، میاں بیوی کے فرائض وحقوق اور گھر گرہستی کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے ضروری علم حاصل کرنا لازمی قرار دیا جائے۔ بہت سے لوگ شادی کو گڈی گڈے کا کھیل سمجھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ شادی عمر بھر اکٹھے رہنے کے عہد کا نام ہے۔

فادر کرِس (Cris) نے کہا کہ تمہیں کار چلانے کے لئے Licence کے لئے دو امتحان پاس کرنے پڑتے ہیں اس کے لئے پیسے خرچ کر کے سبق لینے پڑتے ہیں لیکن شادی کے لئے آپ کو صرف اٹھارہ سال کا ہونا چاہئے۔ ایک ماہ اور ایک دن کا نوٹس چاہئے اور ایک ایسا فرد جو آپ سے شادی کرنے پر راضی ہو اور بس۔ حالانکہ اگر ایک شادی ٹوٹ جاتی ہے تو اس سے جو مسائل، پریشانی اور دکھ پیدا ہوتے ہیں وہ اس سے بہت زیادہ ہیں کہ ڈرائیونگ اچھی نہ آتی ہو اور کار کا حادثہ ہو جائے شادی ٹوٹنے کا حادثہ کار ٹوٹنے کے حادثہ سے زیادہ گھمبیر ہوتا ہے۔ اگرچہ حکومت ''ماقبل شادی کورس'' (Pre-marriage Course) پہلے ہی جاری کر چکی ہے اور اگلے تین سالوں میں ۶۵ کورسز چھ ملین ڈالر کے خرچہ سے چلائے گی لیکن وہ ضرورت کے لئے کافی نہیں اور پھر ان کورسوں میں

شمولیت خود اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ فادر کرس کا مطالبہ ہے کہ کورس بڑھائے جائیں اوران میں شمولیت لازمی قرار دی جائے۔

پرانے زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں میں ایک اس طرح کی کتاب ہوتی تھی ۔ عجیب سا نام تھااس کا، کچی روٹی، پکی روٹی۔اس کتاب میں نماز، دینی مسائل، میاں بیوی کے حقوق وفرائض، سسرال اورعزیزوں سے تعلقات، چھوٹے بچوں کی تکالیف اوران کا علاج وغیرہ درج ہوتے تھے۔اکثر لوگ بچی کے جہیز میں ساتھ یہ کتاب بھی دیا کرتے تھے۔اگراس ضرورت کے مدنظر کوئی جدید طرز کی کتاب لکھی جائے جس میں تربیتی نقطہ نظر سے شادی بیاہ کے مسائل اورشادی شدہ جوڑوں کے لئے قرآن وحدیث کی روشنی میں ہدایات درج ہوں تو امید ہے وہ مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام اورآپ کے مقدس خلفاء کے خطبات وتحریرات میں اسلامی تعلیم کی روشنی میں ازدواجی زندگی کوخوشگوار بنانے اورمعاشرہ کوحسین بنانے کے سلسلہ میں بہت رہنمائی موجود ہے۔حضرت مصلح موعودؓ کے فرمودہ خطبات نکاح فضل عمر فاؤنڈیشن کی طرف سے شائع شدہ ہیں۔تمام بالغ لڑکوں اورلڑکیوں کے لئے اسی طرح شادی شدہ جوڑوں کے لئے ان کا مطالعہ کرنا ازحد مفید ہے۔سیدنا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ کے کئی ایک خطبات کی آڈیواورویڈیو کیسٹس بھی دستیاب ہیں جنہیں غور سے سننےاوران میں بیان فرمودہ نصائح پر عمل کرنے کے نتیجہ میں بہت سی معاشرتی خرابیوں اورنقصانات سے بچا جا سکتا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 9.8.96)

حضرت مریمؑ کے زمانہ کی کھجوریں دوبارہ اگانے کی کوشش

اسرائیل کے ڈاکٹرز اور سائنسدان کھجور کی ایک ایسی گٹھلی سے پودہ اگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو دو ہزار سال پہلے بیت اللحم (فلسطین) میں بکثرت ہوتی تھی لیکن اب ناپید ہو چکی ہے۔ اس گٹھلی کا نام میتھوصلاح (Methuselah) رکھا گیا ہے۔ بہت اللحم کا قصبہ (Bethlehem) وہی ہے جہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی جو یروشلم کے مضافات میں اور حضرت مریم کے شہر ناصرہ (Nazareth) سے قریباً سو میل جنوب میں واقع ہے۔ بحیرہ مردار (Dead Sea) بھی اس سے کوئی چند میل ہی دور تھا۔ اس علاقہ میں واقع ایک ٹیلے کی کھدائی کے دوران تین گٹھلیاں ملی تھیں۔ اس جگہ کا نام Masada ہے۔

محققین پتہ لگانا چاہتے ہیں کہ یہودا علاقہ (Judea) کی اصل کھجور میں وہ کیا خصوصیات پائی جاتی تھیں جنکی بناء پر بائبل اور قرآن میں اس کے سایہ۔ غذائیت۔ خوبصورتی اور طبی فوائد کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ صلیبی جنگجوؤں نے کھجوروں کے سبھی درختوں کو کاٹ کر اس کی نسل کو مٹا دیا تھا۔ ریڈیو کاربن ٹیسٹ سے اس گٹھلی کی عمر ۳۵ قبل مسیح تا ۶۵ عیسوی معلوم ہوئی ہے۔ اتنے پرانے بیج سے پودا اگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر اُگ بھی جائے تو جلدی ہی مرجھا کر مر جاتا ہے۔ اس لئے اس گٹھلی کی اگنے کی قوت بحال کرنے کے لئے بہت جتن کئے گئے ہیں۔ کئی قسم کے محلولات میں رکھ کر قرنطینہ (Quarantine) میں اسے اگایا گیا ہے۔ پھر بھی سب سے پہلے اس کے جو پتے نکلے وہ عجیب شکل کے بالکل چپٹے اور زرد سے تھے۔ البتہ بعد

میں جو پتے نکلے وہ بالکل نارمل عام کھجور کے پتوں جیسے تھے۔ یہ پوداا ب ایک فٹ اونچا ہوگیا ہے۔ لیکن ابھی یہ پتہ نہیں کہ بڑا ہوکر یہ نر نکلتا ہے یا مادہ۔ اگر نر نکلا تو اس سے کھجوریں حاصل کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے گا۔ لیکن کھجور کا یہ پودا اگر مادہ بھی ہوا تو ۳۰ برس کے بعد اس کو کھجوریں لگیں گی کیونکہ جو طبعاً دیر سے جوان ہوتا ہے اس کی عمر بھی اسی حساب سے لمبی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کی کھجور کی عمر دو سو سال ہوتی ہے۔

(ماخوذ سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۱۳؍جون ۲۰۰۵ء)

انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش گرمیوں کے موسم میں ہوئی تھی۔ جب گڈریئے اپنے ریوڑ کو کھلے آسمان تلے کھیتوں میں رکھتے تھے اور رات بھر ان کی نگرانی کرتے تھے (لوقا: ۸۔۷) قرآن کریم کے مطابق بھی وہ کھجوروں کے پکنے کا موسم تھا۔ یعنی گرمیوں کا۔ اگر وہ ۲۵ دسمبر کا دن ہوتا تو اتنی شدید سردی میں کھلے آسمان تلے کھیتوں میں ریوڑ کی نگرانی کے لئے پاس رہنے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ بہت اللحم کا شہر ۲۳۵۰ فٹ بلند چٹان پر واقعہ تھا۔ جس کے اردگرد چشموں والی سرسبز وادیاں تھیں۔ ڈھلوان پر کھجوریں اگی ہوئی تھیں جن کا پھل چٹان پر کھڑے ہوکر توڑا جاسکتا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم فرماتا ہے:

> ”پس اسے اس کا حمل ہوگیا اور وہ اسے لئے ہوئے ایک دور کی جگہ کی طرف ہٹ گئی۔ پھر دردِ زہ اسے کھجور کے تنے کی طرف لے گیا۔ اس نے کہا اے کاش! میں اس سے پہلے مرجاتی اور بھولی بسری ہوچکی ہوتی تب (ایک پکارنے والے نے) اسے اس کی زیریں طرف سے پکارا کہ کوئی غم نہ کر تیرے رب نے تیرے نشیب میں ایک چشمہ جاری کردیا ہے اور کھجور کی ساق کو تو اپنی سمت جنبش دے وہ تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گرائے گی۔ پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر اور اگر تو کسی شخص کو دیکھے تو کہہ دے کہ یقیناً میں نے رحمان کے لئے روزے کی منت مانی ہوئی ہے پس آج میں کسی انسان سے گفتگو نہیں کروں گی“ (مریم: ۲۳۔۲۷)

ایک عفیفہ صدیقہ خاتون کے حالات جو قرآن کریم نے بیان کئے ہیں کیسے ایمان افروز اور رقت آمیز ہیں۔ پڑھ کر اس پاک بی بی پر جہاں ترس آتا ہے وہاں ان کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ لیکن افسوس کہ انجیل میں ان واقعات کا کوئی تذکرہ اس طرح کا نہیں ملتا۔

(الفضل انٹرنیشل)

زبان اپنی اپنی مزا اپنا اپنا

خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا ملکہ بھی خدا کی نعمت ہے۔ جتنا جتنا کوئی زبان قال وحال سے خدا کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے اتنا اتنا ہی وہ ترقی کرتی ہیں۔ اور جتنا جتنا کوئی ناشکری وناقدری سے انہیں بے کار چھوڑ دیتا ہے۔ اتنا اتنا ہی وہ ضائع ہوتی چلی جاتی ہے جیسے فرمایا:

''اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب تمہارے رب نے (انبیاء کے ذریعہ) اعلان کیا تھا کہ (اے لوگو!) اگر تم شکر گزار بنے تو میں تمہیں اور بھی زیادہ دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو (یاد رکھو) میرا عذاب یقیناً سخت (ہوا کرتا) ہے۔'' (ابراہیم:۸)

لہٰذا چکھنے کی قوت بھی اللہ کی نعمت ہے۔ ایک ہی غذا کئی لوگ کھا رہے ہوتے ہیں لیکن مزہ اپنا اپنا ہوتا ہے۔

لیکن اب سائنس دانوں نے تجربات سے معلوم کیا ہے کہ ہر زبان میں چکھنے کی استعداد بھی مختلف ہوتی ہے۔ Yale یونیورسٹی سکول آف میڈیسن کی پروفیسر لنڈا کہتی ہیں کہ زبانوں کی موٹی موٹی تین قسمیں ہیں۔ ایک Non Taster نہ چکھنے والی دوسری اوسط چکھنے والی اور تیسری اعلیٰ چکھنے والی۔ یہ تقسیم انہوں نے اس بناء پر کی ہے کہ ہر زبان پر چکھنے والے شگوفوں کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔ جنہیں وہ Taste Buds کہتی ہیں۔ انہوں نے یہ تجربات دو کیمیائی مرکبات کو زبانوں پر رکھ کر کئے۔ جن کی زبانوں پر چکھنے والے شگوفے تھوڑے تھے ان کا مزا ان کے مقابلہ میں بہت کم تھا جن کی زبانوں پر Buds زیادہ تعداد میں تھے۔ ڈاکٹر صاحبہ حیران رہ گئیں کہ زبانوں کے

Buds کی تعداد اوران کے چکھنے کی استعداد میں بہت زیادہ فرق تھا۔مثلاً ایک نوجوان کی زبان پر ایک مربع سنٹی میٹر پر صرف ۱۱ چکھنے والے شگوفے تھے جبکہ ایک اور آدمی کی زبان پر اس کے بالمقابل اتنی جگہ پر ہی ۱۱۰۰ یعنی اس سے سوگنا تھے۔ان تجربات سے یہ بھی پتہ چلا کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کے چکھنے کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے۔(شاید صدیوں سے باورچی خانہ میں کھانا چکھتے چکھتے ان کی استعداد ترقی کرگئی ہے) بہرحال ان کے تجربات تو یہی کہتے ہیں کہ زبان اپنی اپنی مزا اپنا اپنا۔

(الفضل انٹرنیشنل)

بنی اسرائیل کے گم شدہ قبائل کی تلاش

اسرائیل کے ایک ربائی (Rabbi Eliyahu Avichail) نے ایک تحریک شروع کی ہے جس کا نام Amishav ہے (یعنی میرے لوگ واپس لوٹتے ہیں) اور مقصد یہ ہے کہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے دس یہودی قبائل کا کھوج لگایا جائے۔ اس سلسلہ میں وہ دنیا بھر کا دورہ کر رہے ہیں اور آج کل آسٹریلیا آئے ہوئے ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں باوجود ذاتی خطرہ کے پاکستان اور افغانستان بھی جا چکے ہیں۔ ان کے نزدیک اسرائیلی قبائل کے کھوئے رہنا ان کے اپنے وجود کے کھو جانے سے زیادہ خطرات کا حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

> Lost tribes and the marranos (groups who renounced Judaism during the Spanish Inquisition)are believed to be scattered through North Africa, Kashmir, The Caucasus, Spain, Portugal,South America, The Indian Subcontinent and Palestine."
>
> (S.M.Herald, 4.9.95)

یعنی گمشدہ قبائل کے متعلق یقین کیا جاتا ہے کہ وہ شمالی افریقہ، کشمیر، کا کیشیا (یعنی صاف رنگ کی نسلیں جو یورپ، شمالی افریقہ، جنوب مغربی ایشیا اور برصغیر ہند میں آباد ہیں) سپین، پرتگال، جنوبی امریکہ، برصغیر ہندو پاک اور فلسطین میں بکھرے پڑے ہیں۔ ربائی صاحب اس وقت کے لئے

چشم براہ ہیں جب یہودی روایات کے مطابق حضرت مسیح آئیں گے اور اسرائیلی گھرانہ کے ۳۰ ملین (۳ کروڑ) افراد کو اسرائیل میں جمع کریں گے۔ اسرائیلی حکومت کے ایک متنازعہ قانون کے تحت یہودی مذہب پر قائم اسرائیلی بلکہ ان کے پوتے بھی اسرائیل میں پورے شہری حقوق کے ساتھ آباد ہو سکتے ہیں۔ لیکن اسرائیل کی اپنی آبادی صرف پانچ ملین ہے اور وہ مزید یہودیوں کو وہاں بسانے میں لیت ولعل کرتی ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال ۷۵ آبادکار شمال مشرقی ہندوستان سے اسرائیل پہنچے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ''بنی مناش'' (Beni Menasche) ہیں جو بائبل کے گم شدہ قبیلہ (Manasseh) کی نسل میں سے ہیں۔ اسرائیلی کہتے ہیں اگر ہم نے یہ دروازہ کھول دیا تو تیسری دنیا کے سینکڑوں ملین افراد غربت سے بچنے کے لئے یہاں بھاگے آئیں گے اور انسانوں کی یلغار اسرائیل کو لے ڈوبے گی۔

(الفضل انٹرنیشنل)

حکومتوں کی ایک دوسرے کے خلاف جاسوسی کاروائیاں

یوں تو حکومتیں ایک دوسرے کے خلاف جاسوسی کیا ہی کرتی ہیں لیکن کچھ عرصہ قبل ایک دو بہت دلچسپ واقعات اخباروں میں آئے ہیں۔ ذرا آپ بھی سن لیجئے۔

جاکرتہ انڈونیشیا میں جاپان اور آسٹریلیا کے سفارت خانے ایک دوسرے سے ۶۰۰ میٹر کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ بظاہر تو یہ ناممکن سی بات لگتی ہے کہ آسٹریلیا کے سفارت خانے کے اندر کمرے کی کھڑکیاں بند کر کے دو آدمی باتیں کر رہے ہیں تو ۶۰۰ میٹر دور جاپان کے سفارت خانے میں وہ باتیں صاف سنائی دیں لیکن ایسا ہوا اور پتہ نہیں کتنی بار ہوا۔ جو طریق اس غرض کے لئے اپنایا گیا وہ یہ تھا کہ جاپانی سفارت خانے سے بعض شعائیں Infra Red Beam آسٹریلیا کے سفارت خانے کے ایک شیشہ کی بند کھڑکی پر پھینکی گئیں۔ اس کمرہ میں دو آدمی باتیں کر رہے تھے جس سے شیشہ میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ انفرا ریڈ شعائیں اس ارتعاش کو لے کر واپس جاپانی سفارت خانہ پہنچیں وہاں ان کو مختلف آلات Processors and Filters میں سے جب گزارا گیا تو باتیں صاف سنی گئیں۔ آسٹریلیا والے جب جاسوسی سے متعلقہ عام معائنہ کر رہے تھے تو انہیں ان شعاؤں کا شک گزرا۔ چنانچہ انہوں نے کھڑکیوں پر ایسے خاص شیشے (Lens) لگا دیئے جو انفرا ریڈ شعاؤں کو محسوس کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کو پتہ لگ گیا کہ جاپانی سفارت خانے کے مختلف کمروں سے آسٹریلیں سفارت خانے کے ایک خاص کمرے پر باقاعدہ شعائیں پھینکی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کا تدارک کر لیا گیا۔ حکومت آسٹریلیا کو شکایت ہے کہ ماسکو، بیجنگ، وارسا، بلغراد، انقرہ، ہنوئی، رنگون، جاکرتہ اور براسیلیہ میں ان کے سفارت خانوں کے خلاف جاسوسی کاروائیاں کی گئیں۔ دو مقامات پر

ایسے سیف نصب کئے گئے تھے جو آسانی سے کھولے جاسکیں۔

اس کے بالمقابل کینبرا آسٹریلیا میں چین کے سفارت خانے کے خلاف امریکہ نے جاسوسی کے آلات آسٹریلیا کی ملی بھگت سے نصب کئے تھے۔چین نے ۱۸ملین ڈالرخرچ کر کے کینبرا میں اپنے سفارت خانہ کی عمارت بنائی ۔امریکہ نے پانچ ملین ڈالر لگا کر اس کے ہر کمرے میں Fiber Optical Listening Devices یعنی فائبر آپٹک کے سننے والے آلات نصب کروادیئے۔وہاں کی ہر بات ایک باہر کے مقام پر پہنچتی تھی اور وہاں سے براہ راست امریکہ پہنچتی تھی۔امریکہ اپنے کام کی باتیں رکھ لیتا اور دوسری آسٹریلیا کو بھی بتا دیتا۔اس سودے میں آسٹریلیا کو گھاٹا رہا۔ کہتے ہیں آسٹریلیا نے چین کو سستے داموں گندم بیچنے کی بات چیت کی ۔امریکہ کو اس جاسوسی نظام کے ذریعہ علم ہو گیا اور اس نے مزید سستی کر کے (Subsidy دے کر) چین کو بیچ دی۔ پھر امریکہ اور آسٹریلیا میں اس معاملہ میں شکر رنجی بھی ہوئی۔

بہرحال حیرانی ہوتی ہے کہ ان قوموں کے کان کتنے لمبے ہیں۔ایک بند کمرہ میں آسٹریلیا میں ایک بات ہوتی ہے اور وہ اس وقت ہزاروں میل دور امریکہ پہنچ جاتی ہے۔خیال سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو خدا نے کیا کیا طاقتیں دی ہیں۔ایک سائنس دان جب کان کی بناوٹ پر غور کر رہا تھا تو اچانک پکار اٹھا کہ وہ خدا جس نے یہ کان بنایا ہے اور اس کو قوت سماعت بخشی ہے کیا وہ خود نہیں سنتا ہوگا؟ وہ ضرور سنتا ہے وہ سمیع و بصیر ہے جو کچھ انسان کو ملا ہے اس کی ہلکی سی جھلک ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل)

سڈنی میں عیسائیوں کے ٹی وی کا اجراء

کیتھولک چرچ کی ایک شاخ Jesuits سڈنی میں Pay Tv کی کمپنی Foxtel سے دو چینل (پانچ صد گھنٹے فی ہفتہ) خریدنے کے لئے بات چیت کر رہی ہے۔اس فرقہ کو Society of Jesus بھی کہا جاتا ہےاور اس کی بنیاد ۱۵۳۳ء میں Jgnatius Loyola نے رکھی تھی۔ یہ فرقہ اپنے مشنری کاموں میں بہت فعال رہا ہےاور سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں چین، شمالی وجنوبی امریکہ اور ہندوستان میں عیسائیت پھیلانے میں بہت سرگرم رہا ہے۔ٹی وی کی کمپنی اکتوبر اور دسمبر ۱۹۹۵ء کے دوران کیبلوں کے ذریعہ ۲۰۰ چینل جاری کر رہا ہے۔

یہ پہلا موقعہ ہے کہ آسٹریلیا میں عیسائیوں کی طرف سے ٹی وی جاری کیا جائے گا۔ان کو امید ہے کہ ۱۴۵۰ Catholic Parishes اور ۷۵۰ ا پرائیویٹ سکول ان کے چینل سے استفادہ کریں گے۔اوران کو فیس میں دس فیصد رعایت دی جائے گی اپنے ٹی وی کا نام انہوں نے Life Vision Net work رکھا ہے جس کے ڈائریکٹر نے کہا ہے کہ ان کا پروگرام سیکس اور تشدد (Sex and Violence) سے مبرا ہوگا۔اس میں تعلیمی وتربیتی اور تفریحی پروگراموں پر مبنی دستاویزی فلمیں، عام فلمیں، خبریں اور فیملی پروگرام دکھائے جائیں گے۔انہوں نے کہا کہ ہمارا ٹی وی امریکہ کے بعض Hot Gospel Network کی طرح نہیں ہوگا۔اس میں ایسے پروگرام پیش کئے جائیں گے جو آپ اپنے بچوں کو دکھا سکیں۔

(الفضل انٹرنیشنل)

آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی مسروقہ نسل کے لیڈر برنم برنم انتقال کرگئے

مسٹر برنم برنم جو اپنی بھاری بھرکم سفید داڑھی کی وجہ سے ہر جگہ نمایاں نظر آیا کرتے تھے اور آسٹریلیا کے اصل باشندوں ایبورجنیز (Aborigines) کے لیڈر، مصنف، تاجر اور ایکٹر تھے اگست ۱۹۹۷ء میں عارضہ قلب سے انتقال کرگئے۔ ۱۹۸۹ء میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز آسٹریلیا کے دورہ پر تشریف لائے تھے۔ تو یہ صاحب بھی مع اپنے ایک گروپ کے حضور سے ملاقات کیلئے آئے تھے وہ ایبوجنیز کی اس نسل کے نمائندہ تھے جنہیں ''مسروقہ نسل'' (Stolen Generation) کہا جاتا ہے۔ وہ ان ہزاروں بچوں میں سے ایک تھے جن کو حکومت نے ان کے والدین سے زبردستی چھین کر مختلف اداروں اور چرچوں کی کفالت میں دے دیا تھا، ان کا ماضی ان سے چھین لیا گیا۔ انہیں عیسائی مذہب اور کلچر سکھایا گیا۔ ان کے والدین اور قبیلوں سے ان کا تعلق منقطع کر دیا گیا اور ان پر طرح طرح کے ظلم روا رکھے گئے۔ برنم برنم ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی پانچ ماہ کے تھے کہ گوروں نے زبردستی ان کی والدہ کی گود سے انہیں چھین لیا۔ پہلے تو دس سال کی عمر تک انہیں United Aboriginal Mission Home جو بوماڈیری (Bomaderry) کے مقام پر تھا رکھا گیا اور پھر مزید چھ سال تک کمسی (Kemsey) کے Kemchila Boy Home میں رکھا گیا۔ دوسرے ادارہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ہمیں وہاں انسان نہیں بلکہ حیوان سمجھا جاتا تھا۔ رات کے وقت ان کے سامنے بے حیائی کے کام کئے

جاتے۔''ایک بار اتفاقاً مجھ سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تو سزا کے طور پر ننگا کر کے میری پیٹھ پر دس کوڑے برسائے گئے جس کے نتیجہ میں تین ماہ تک بیٹھ نہ سکا۔ یہ ایسا تجربہ تھا جو میری روح پر نہ مٹنے والے حروف میں لکھا جا چکا ہے۔''بعد میں برنم برنم ساری عمر ایبوجنیز کے حقوق کے لئے آواز بلند کرتے رہے۔انہوں نے بڑی عمر میں جا کر ایک گوری عورت سے شادی کی جوان سے عمر میں بہت چھوٹی تھی اس بیوی سے ایک بیٹا ۱۹۸۹ء میں پیدا ہوا۔

ایبوجنیز کی مسروقہ نسل جس کا اوپر ذکر ہوا ہے اس کے بارہ میں آسٹریلیا کے Human Rights and Equal Opportunity Commission نے حال ہی میں ایک رپورٹ مرتب کی ہے۔ یہ رپورٹ جب تک پارلیمنٹ میں پیش نہ ہو عوام کے لئے شائع نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے بعض حصے اخبارات میں اشاعت کے لئے دے دیئے گئے ہیں۔رپورٹ کا نام Bringing them Home ہے۔سڈنی مارننگ ہیرلڈ کی ۲۴ رمئی ۱۹۹۷ء کی اشاعت کی Ms Debra jopson جو مضمون اس رپورٹ کے بارہ میں شائع ہوا ہے اس کے بعض حصے قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:

''جب یورپین لوگوں نے آسٹریلیا پر قبضہ کیا تو اس کے ابتدائی ایام ہی سے ایبورجنی بچوں کو ان کے خاندانوں اور قبیلوں سے زبردستی جدا کیا جاتا رہا ہے۔عموماً تو بچوں کو ان کے ماں باپ کی عدم موجودگی میں اٹھا کر لے جاتے تھے۔لیکن یوں بھی ہوتا تھا کہ بچوں کو زبردستی ان کی ماؤں کی گود سے چھین لیا جاتا.....جن اداروں میں لے جا کر انہیں رکھتے انہیں ''ٹریننگ انسٹی ٹیوشن'' کا نام دیا ہوا تھا۔ جیسے کُوٹا منڈرا (cootamundra) والا۔ وہاں لڑکیوں کو گھر کا کام کاج سکھایا جاتا تھا۔ دراصل ان کو سستے داموں گھریلو نوکرانیوں کا حصول مقصود تھا۔ ان سے شدید تھکا دینے والا کام لیا جاتا تھا۔ گورے قدیمی باشندوں کے متعلق کہا کرتے تھے کہ وہ آزادنہ مخلوط جنسی تعلقات رکھتے ہیں اور ان کا خیال تھا کہ جب یہ کالی بچیاں کام سے تھک کر چور ہو جائیں تو اس وقت وہ اس کام (Promiscuity) سے بچیں گی۔ان

عورتوں سے کمیشن نے جو گواہیاں حاصل کیں ان کے مطابق ہر پانچ بچیوں میں سے ایک کو سخت زدوکوب کیا گیا اور دس میں سے ایک کو جنسی زیادتیوں کا شکار بنایا گیا۔ ایسے ادارے اور گھر جس میں یہ چوری کردہ بچے رکھے جاتے تھے ان سے ان کا ایبورجنی ہونا چھپایا جاتا تھا۔ یا کبھی اس کا انکار کردیا جاتا تھا اور یا پھر ایبورجنی ہونے کی بنا پر ان کو ذلیل کیا جاتا تھا۔ ان کی محنت کا استحصال ہوتا تھا۔ ان کو عام حالات سے بہت بدتر حالت میں رکھا جاتا تھا۔ ان کو تعلیم بھی بڑی معمولی اور نامکمل دی جاتی تھی۔ وہ وحشیانہ مظالم اور جنسی زیادتیوں کا نشانہ بنتے تھے اور کئی بدقسمت تو ایسی تھیں کہ وہ متواتر جنسی ہوس کا نشانہ بنتیں۔

کینچلا (Kinchela) کا ادارہ تو بالکل قید خانہ کی طرح تھا۔ اور وہاں انہیں حیوان سمجھا جاتا تھا.... جان جب ابھی شیر خوار بچہ تھا کہ اسے اٹھا کر Bomaderry children Home میں لے گئے۔ جب وہ دس سال کا ہوا تو کنچلا کے ادارہ میں منتقل کردیا گیا۔ وہاں کا حال بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اگر ہم وہاں کسی ملازم کے آگے بول پڑتے تو ہمیں ''لائن'' میں بھیج دیا جاتا۔ وہاں اس زمانہ میں ۷۹ لڑکے تھے انہیں حکم دیا جاتا کہ ملزم کو باری باری مارو۔ چنانچہ وہ مکے مار مار کے تمہارا بھرکس نکال دیتے۔ مکے مارنے والوں میں تمہارا بھائی اور کزن بھی شامل ہوتا لیکن وہ مارنے پر مجبور تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کو بھی ''لائن'' میں بھیج دیا جاتا۔ اگر کسی لڑکے کو مار کھا کھا کر پسلیاں یا ناک ٹوٹ جاتا تو بھی جب تک سارے ۷۹ لڑکے اس کو مار نہ لیتے ان کی جان نہیں چھوٹتی تھی۔ اور یہ روز کا معمول تھا۔

کہیں ۱۹۳۵ء میں جا کر (Aborigines Protection Board نے فیصلہ کیا کہ کنچلا کے ادارہ کے سربراہ کو کہا جائے کہ لڑکوں کو جنگلے (Fence) یا درختوں کے ساتھ نہ باندھا کریں۔ نہ ان کو ہوز پائپ یا کوڑوں کے ساتھ مارا جائے۔ لیکن اب ان پر دوسری نوعیت کے ظلم ہوتے تھے۔ مثلاً ان

اداروں کو اتنے کم فنڈ دیئے جاتے کہ وہ ہمیشہ بھوکے ہی رہتے ۔ان کی بنیادی ضرورتیں پوری نہ کی جاتیں۔ ان کو علاج کی سہولت سے بھی محروم رکھا جاتا چنانچہ بہت تھے جو وقت سے پہلے مر جاتے۔''

ایک اور شخص نے جو کنچلا کے ادارہ میں رہ چکا تھا اور ۱۹۵۰ء میں نو سال کا تھا، کمیشن کے روبرو بیان دیتے ہوئے کہا:

''آپ کو پتہ ہے ہمیں وہاں کھانے کو کیا ملتا تھا۔گھاس پھونس اور بند (Straw and Buns) بس وہ ہماری چائے تھی۔ اب تنکے تو نگلے نہیں جاسکتے تھے جب انہیں چن کر باہر پھینکنے لگتے تو ہمیں چھڑیوں سے پیٹا جاتا اور وہ تنکے مجبوراً ہمیں کھانے پڑتے۔''

ایک اور عورت جس کا نام Lola Mcnaughton تھا وہ بھی ان اداروں میں بچپن گزار چکی تھیں بعد میں وہ ایک تنظیم Link Up کی طرف سے ایبورجنیز کی مسروقہ نسل پر ریسرچ کا کام بھی کرتی رہیں وہ کہتی ہیں:

''مجھے کوٹامنڈرا ہوم (Cootamundra Home) کے وہ بدنام زمانہ صندوق نما کمرے (Box Room) خوب یاد ہیں ۔ان میں نہ روشنی کا گزر ہوسکتا تھا نہ ہوا کا۔رات کے وقت لڑکیوں کو ان کمروں میں بطور سزا کے بند کر دیا جاتا تھا۔ مجھے عملہ کا وہ رکن بھی یاد ہے جو خاص طور پر بڑا ظلم کیا کرتا تھا بالخصوص ہفتہ کی صبح وہ فرش صاف کروایا کرتا تھا۔ ہم ایک جھاڑو (Mop) لے کر اس وقت تک فرش صاف کرتے رہتے جب تک ہم اپنا بچپن کا چھوٹا سا کالا منہ نہ دیکھ سکتے۔ اگر اتنا ابھی صاف نہ ہوتا تو وہ شخص پانی کا ایک ڈول وہاں پھینک دیتا اور کہتا کہ دوبارہ صاف کرو۔ میرے والدین دور کا سفر کر کے اپنے گاؤں Tingha سے چل کر مجھے ملنے کے لئے آئے لیکن کوٹامنڈرا کی نمائش گراؤنڈ سے دو میل دور ہی روک دئے گئے وہ بقیہ دو میل کا سفر کبھی طے نہ کر سکے۔ پتہ نہیں کیوں؟ وہاں اس ادارہ میں لڑکیاں ایک

دوسرے کا سہارا بنتیں۔ وہاں ایک لڑکی Alice میرا اتنا خیال رکھتی کہ میں اسے اپنی رضاعی والدہ سمجھتی تھی۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر کی وہاں سے چلی گئی۔ میری عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ اس کے جانے پر میرا برا حال ہو گیا۔ مجھے لگتا تھا جیسے کسی نے مجھ سے میری ماں چھین لی ہے۔ لیکن بعد میں میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔''

رپورٹ کے مطابق:

''قدیم باشندوں کو اپنے اندر سمو لینے Assimilation کی پالیسی پر عمل کے دوران ایبورجنل والدین از روئے قانون اپنے ایسے بچوں سے رابطہ قائم نہیں کر سکتے تھے جن کو مختلف اداروں میں رکھا ہوا ہو۔ ایسے کسی بچہ کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا جو ان اداروں میں مقیم ہو یا ایسے کسی ادارہ میں داخل ہونا قانونی طور پر جرم تھا۔''

کمیشن کے سامنے کئی دردناک داستانیں بیان کی گئیں۔ اخبار میں ایک فوٹو چھپا ہے جس میں ایک گورے نے ہاتھ سے ہل پکڑا ہوا ہے اور چھوٹے پانچ سات سال کی عمر کے کالے بچے جانوروں کی طرح ہل کو آگے سے کھینچ رہے ہیں۔

ایک گواہ نے کمیشن کو بتایا کہ

''میں نے لڑکیوں کو بالکل ننگی حالت میں کرسیوں کے ساتھ بندھے دیکھا ہے جن پر کوڑے برسائے جا رہے تھے۔ ہم میں سے سبھی کمروں میں بند کئے جانے کی اذیت برداشت کر چکی ہیں۔ ہمیں اندھیرے کمروں میں بند کر دیا جاتا تھا۔''

مذکورہ بالا رپورٹ کے جو چند اقتباسات اخباروں میں شائع ہوئے ہیں ان سے بہت گوروں کو یہ احساس ہوا ہے کہ ہم اور ہمارے آباؤ اجداد کالے قدیم باشندوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے وزیر اعظم جان ہاورڈ سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ایبورجنیز سے معافی مانگیں۔ چنانچہ وزیر اعظم نے اپنی ذاتی حیثیت میں جو کچھ ماضی میں ہوتا رہا اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے لیکن

وزیراعظم کی حیثیت سے یعنی حکومت کی طرف سے معافی نہیں مانگی کیونکہ انہیں خدشہ ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں ظلم سہنے والے معاوضہ کا مطالبہ شروع کر دیں گے جیسا کہ کمیشن نے بھی اپنی رپورٹ میں زیادتیوں کا نشانہ بننے والوں کو معاوضہ ادا کرنے کی سفارش کی ہے۔

ایسے لوگ جو استعماریت کی ذہنیت کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے مذکورہ بالا رپورٹ کا مطالعہ دلچسپی کا حامل ہوگا۔

(الفضل انٹرنیشنل)

آسٹریلیا کے قدیم باشندے

آسٹریلیا کا تعارف یہاں کے قدیمی باشندوں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ یہ لوگ جنہیں ایبورجنی (Aborigines) کہا جاتا ہے۔کم از کم چالیس ہزار سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔ان کا قصہ جہاں کئی علوم کے ماہرین کے لئے دلچسپی کا حامل ہے وہاں خدااوراسکے رسولوں کے ماننے والے بھی اس سے کئی دلچسپ نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی اس معاملہ میں بہت دلچسپی تھی چنانچہ آپ نے اپنی کتاب Revelation, Rationality, Knowledg And Truth کے صفحات ۲۱۷ تا ۲۳۴ میں ان قدیمی باشندوں کے مذہب اور خدا کے تصور پر خود اپنی اور دوسروں کی تحقیق درج فرمائی ہے۔سوال و جواب پروگرام منعقدہ ۱۸رنومبر ۱۹۹۴ء کو آپ نے ایک سوال کے جواب میں آدم کی حقیقت ،اس کے ارتقائی مراحل اور آسٹریلیا کے قدیم لوگوں کے سماجی اور مذہبی حالات پر خوب روشنی ڈالی تھی۔

(روزنامہ الفضل ۳۰ جنوری ۲۰۰۳ء)

موجودہ انسان کوئی ڈیڑھ دولاکھ سال قبل افریقہ سے اچانک ابھرا۔''اچانک''اس لئے کہ آدمی سے مشابہ کھڑا ہونے اور چلنے والے جس جاندار سے یہ علیحدہ ہوا اس کے اعضاء اور قویٰ اس کے مقابلہ میں بہت کم درجہ کے تھے اور یہ ان سے غیر معمولی طور پر افضل تھا مثلاً آدم کا دماغ اس کے دماغ سے بہت بڑا تھا۔اور عجیب بات یہ ہے کہ درمیانی منازل غائب تھیں۔ان کا کہیں نشان نہ ملا جبکہ یہ زبردست تبدیلیاں نہ پہلے کا جاندار آگے منتقل کرسکتا تھا۔اور نہ وہ از خود پیدا ہوسکتی تھیں۔بہرحا

ل انسان بہتر غذا اور ٹھکانوں کی تلاش میں افریقہ سے باہر نکلا۔سائنسدانوں کا خیال تھا کہ وہ پہلے مصر میں آیا اور پھر وہاں سے دنیا میں پھیلا لیکن حال ہی کی تحقیق جو اپنے اپنے طور پر کیمرج یونیورسٹی اور نیشنل یونیورسٹی آسٹریلیا نے کی ہے کے مطابق انسان افریقہ سے نکل کر سب سے پہلے مصر کی بجائے عرب میں آیا تھا اور وہاں سے ۶۵ ہزار سال قبل بحیرہ ہند کے ساحل کے ساتھ چلتے چلتے انڈونیشیا سے ہوتے ہوئے آسٹریلیا پہنچا اور بعد میں دوسرا گروپ (اب سے تیس چالیس ہزار سال قبل) یورپ کی طرف پھیل گیا۔اب آگے مذہب کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ آج سے قریباً ۶۱۵۵ قمری سال پہلے (آنحضرت ﷺ کی پیدائش سے ۴۷۳۹ قمری سال قبل) وہ آدم پیدا ہوئے تھے جو ہمارے نبی کریم ﷺ کے جد امجد تھے۔معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس گروپ کے لئے مبعوث ہوئے تھے جو مکہ کے ارد گرد عرب ہی میں ٹھہرا رہا تھا۔اسی کو خدا نے عربی زبان سکھائی تھی۔ابتدائی شریعت دی۔انہیں کے لئے مکہ میں خدا کا پہلا گھر تعمیر ہوا اور چونکہ ان کی زبان عربی تھی اس لئے دنیا کی سب زبانیں اسی سے نکلیں اور جہاں سے وہ دنیا میں پھیلے تھے وہی بستی ام القریٰ یعنی بستیوں کی ماں کہلائی۔

یہ ابتدائی انسان دنیا کے کئی حصوں میں آباد ہوا، چلّی میں ایسے انسان کے قدموں کے نشان ملے ہیں جو ساڑھے بارہ ہزار سال پہلے وہاں رہتا تھا۔اور ایک جدید تحقیق یہ بھی کہتی ہے کہ چودہ ہزار سال قبل امریکہ اور برازیل میں آسٹریلیا کے Aborigines نسل کے لوگ آباد تھے جس پر آسٹریلیا کے اخباروں نے بڑے فخر سے یہ لکھا تھا کہ امریکہ کے قدیم ترین باسی تو ہم آسٹریلین تھے۔

آسٹریلیا کے ذکر میں ایک انگریز آسٹریلوی پروفیسر کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا جس کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔اور ان کی موت اسلام پر ہوئی۔ان کا ذکر حضرت مفتی محمد صادق رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب ''ذکر حبیب'' کے صفحات ۴۰۹ تا ۴۲۲ میں کیا ہے ان کا اسم گرامی پروفیسر کلیمنٹ ریگ (Prof. Clemnet Wraig) تھا۔آپ ایک مشہور سیاح، ہیئت دان اور لیکچرر تھے۔آپ کا اصلی وطن انگلستان تھا لیکن آسٹریلیا میں بہت مدت تک گورنمنٹ سروس کرتے رہے۔بہت غیر متعصب اور انصاف پسند انسان تھے۔کئی کتابوں کے مصنف تھے۔بعد میں نیوزی لینڈ چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

جن دنوں حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے وصال سے قبل لاہور میں قیام فرما تھے

پروفیسر صاحب بھی لاہور آئے ہوئے تھے۔حضرت مفتی صاحب جن کو تبلیغ کی ایک قسم کی لواور دھت لگی ہوئی تھی انہوں نے موقع غنیمت جانا اور اس کو مل کر تبلیغ کی۔اس نے حضور سے ملنے کا شوق ظاہر کیا مفتی صاحب نے حضرت مسیحِ موعودؑ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے ہنستے ہوئے فرمایا کہ مفتی صاحب تو انگریزوں کو ہی شکار کرتے رہتے ہیں۔چنانچہ آپ نے اس کی اجازت دے دی کہ وہ آکر ملاقات کرے۔چنانچہ وہ اور اس کی بیوی دو دفعہ حضور کی ملاقات کے لئے احمدیہ بلڈنگ آئے اور بہت سے دلچسپ علمی سوالات کئے جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔دوسری ملاقات میں ان کا چھوٹا لڑکا بھی ساتھ تھا۔پروفیسر صاحب حضور کی ملاقات سے بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ کا مذہب سائنس کے مطابق ہے۔جس پر حضور نے فرمایا کہ اسی لئے تو خدا نے ہمیں بھیجا تا ہم دنیا پر ظاہر کریں کہ مذہب کی کوئی بات سچی اور ثابت شدہ سائنس کے خلاف نہیں۔حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''پروفیسر بعد میں احمدی مسلمان ہو گیا تھا اور مرتے دم تک اس عقیدہ پر قائم رہا۔اور اس کے خطوط میرے پاس آتے رہے۔''(ذکر حبیب:۴۲۲)

جس طرح آج کل کے عیسائیوں کو بہت بے چینی ہے کہ بائبل تو آدم سے انسانیت کا آغاز بتاتی ہے جس کو صرف چھ ہزار سال کا ہی عرصہ گزرا ہے جبکہ سائنسی شواہد اس کے خلاف ہیں کیونکہ انسان اس عرصہ بہت پہلے کا زمین پر آباد ہے تو پھر کس بات کو سچا سمجھا جائے؟ معلوم ہوتا ہے یہی سوال پروفیسر ریگ کو بھی پریشان کرتا ہوگا کیونکہ وہ تو آسٹریلیا میں رہائش پذیر تھا اور جانتا تھا کہ وہاں کے قدیم باشندے ہمارے آدم سے بہت پہلے کے وہاں رہ رہے ہیں۔چنانچہ پروفیسر صاحب نے ۱۸ مئی ۱۹۰۸ء کو جو حضرت مسیحِ موعودؑ سے سوالات پوچھے ان میں امریکہ اور آسٹریلیا کے اصل باشندوں کی بابت بھی پوچھا کہ ''کیا یہ لوگ جو دنیا کے مختلف حصوں امریکہ،آسٹریلیا وغیرہ میں پائے جاتے ہیں یہ اس آدم کی اولاد میں سے ہیں؟

حضرت مسیحِ موعودؑ نے فرمایا:

''ہم اس بات کے قائل نہیں اور نہ ہی اس مسئلہ میں ہم توریت کی پیروی کرتے ہیں کہ چھ سات ہزار سال سے ہی جب سے یہ آدم پیدا ہوا تھا

اس دنیا کا آغاز ہوا ہے اور اس سے پہلے کچھ نہ تھا اور خدا گویا معطل تھا اور نہ ہی ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ یہ تمام نسل انسانی جو اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہیں یہ اسی آخری آدم کی نسل ہے ہم تو اس آدم سے پہلے بھی نسلِ انسانی کے قائل ہیں جیسا کہ قرآنِ شریف کے الفاظ سے پتہ لگتا ہے۔ خدا نے یہ فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرة:۳۱)

خلیفہ کہتے ہیں جانشین کو۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آدم سے پہلے بھی مخلوق موجود تھی۔ پس امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ کے لوگوں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس آخری آدم کی اولاد میں سے ہیں یا کسی دوسرے آدم کی اولاد میں سے ہیں۔'' (ملفوظات جلد دہم صفحہ ۴۳۲)

۱۹۸۹ء میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ آسٹریلیا کے دورہ پر تشریف لائے تھے تو آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کے لیڈر برنم برنم بھی ایک گروپ کے ساتھ حضور کو ملنے آئے تھے۔ وہ ایبورجینز کی اس نسل کے نمائندہ تھے جنہیں مسروقہ نسل (Stolen Gnenration) کہا جاتا ہے۔ وہ ان ہزاروں بچوں میں سے ایک تھے جن کو حکومت نے ان کے والدین سے زبردستی چھین کر مختلف اداروں اور چرچوں کی کفالت میں دے دیا تھا۔ ان کا ماضی ان سے چھین لیا گیا تھا۔ انہیں عیسائی مذہب اور کلچر سکھایا گیا تھا۔ ان کے والدین اور قبیلوں سے ان کا تعلق منقطع کر دیا گیا اور ان پر طرح طرح کے ظلم کئے گئے۔ برنم برنم ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے ابھی پانچ ماہ کے تھے کہ گوروں نے زبردستی ان کی والدہ کی گود سے انہیں چھین لیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں وہاں انسان نہیں بلکہ حیوان سمجھا جاتا تھا۔ رات کے وقت ان کے سامنے بے حیائی کے کام کئے جاتے تھے۔ ان بچوں سے ان کی طاقت سے بڑھ کر سخت کام لئے جاتے بھوکا رکھا جاتا علاج کی سہولت سے بھی محروم رکھا جاتا۔ چنانچہ بہت تھے جو وقت سے پہلے مر جاتے۔ (سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۴ مئی ۱۹۹۷ء)

برنم برنم ۱۹۹۷ء میں وفات پا گئے تھے۔

گوروں کی آمد سے کم از کم چالیس ہزار سال پہلے سے ایبورجینز آسٹریلیا میں رہتے تھے ان کے مذہب کی بنیاد خوابوں پر ہے جن کے بارہ میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ سچی مبشر رؤیا

نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔یعنی خدا کی طرف سے ملنے والی ہدایت کا آغاز خوابوں کے ذریعہ ہوتا ہے جو ترقی کرتے کرتے شریعت اور ماموریت کے الہام تک پہنچتا ہے۔ ایبور جینز مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ چھ سو سے زائد زبانیں بولی جاتی تھیں۔نہ ان کا آپس میں کوئی رابطہ تھا نہ کوئی مشترک زبان تھی لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کے باوجود وہ سبھی یہ مانتے تھے کہ کائنات کی ایک طاقت ہے جو رؤیا کے ذریعہ ہم سے رابطہ رکھتی ہے۔ان کی خوابوں کا ایک نظام ہے خوابوں کی تاویل کرنے والے ان میں بزرگ موجود ہیں۔اور یہ کہتے ہیں کہ خوابوں میں جو پیغام ملتے ہیں وہ مستقبل میں اسی طرح پورے ہوتے ہیں یہ گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا نے کسی بھی قوم اور نسل کو بغیر ہدایت کے نہیں چھوڑا (تفصیل کے لئے دیکھیں حضورؒ کی کتاب اور روزنامہ الفضل ۳۰/جنوری ۲۰۰۳ء) ان کو یقین تھا کہ اس کائنات میں ایک برتر ہستی ہے جو ہر چیز سے پہلے موجود تھی جس نے دنیا کو پیدا کیا اور پھر آسمانوں پر چلی گئی (جس طرح قرآن کہتا ہے کہ خدا نے مخلوقات کو پیدا کیا اور عرش پر قرار فرما ہو گیا یعنی مخلوق سے منزہ جو تنزیہی صفات ہیں ان کے پردہ میں مستور ہو کر اور تشبیہی صفات کو ظاہر کر کے تدبیر امور کائنات فرمانے لگا)۔

یورپین اقوام نے ان سے ملک چھینا۔ جہاں تک ہو سکا ان کو ختم کیا۔ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے رسم و رواج کے پابند تھے۔جنگلوں میں جو کچھ ملتا اسے کھا کر اپنی بھوک مٹاتے بیاہ۔شادی اور موت کی رسومات بھی ان میں تھیں۔ باوجود نیم برہنہ رہنے کے ان میں عفّت کا ایک معیار تھا۔شادی سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو چھوتے تو ان کو سزا دی جاتی۔ یہ لوگ نہ تو شراب سے آشنا تھے نہ نشوں کے عادی تھے نہ کوئی جوئے کی لت انہیں تھی۔اور اب ان کا مذہب عیسائیت تھا۔ چرچ سختی سے نگرانی کرتے ہیں کہ کوئی دوسرا مذہب ان میں نفوذ کرنے نہ پائے۔منشیات کے عادی ہو چکے ہیں کچھ نہ ملے تو پٹرول کو ہی سونگھ کر نشہ کی عادت پوری کرتے ہیں۔ جو وظیفہ حکومت سے ملتا ہے اور ان کو دوسروں کے مقابلہ میں بہت فراخ دلی سے ملتا ہے وہ اکثر جوئے اور نشہ کی نذر ہو جاتا ہے اور جب خرچ پورے نہیں ہوتے تو چوریاں کرتے اور ڈاکے ڈالتے ہیں۔حکومت چونکہ ان کو اتنا دیتی ہے کہ بغیر کوئی کام کئے زندگی گزار سکتے ہیں۔ اسلئے اکثر بیکار رہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اخلاقی اور سماجی برائیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ان میں وہ سب برائیاں رچ بس گئی ہیں جن میں گورے خود بھی مبتلا

ہیں۔بغیر شادی کے اکھٹے رہنا بھی عام ہے۔اسی حالت میں بچے بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا اکثر کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ان میں سمجھدار لوگ بھی ہیں۔بعض تو خاصے پڑھے لکھے اور ذہین بھی ہیں۔وہ ان برائیوں سے تنگ آ چکے ہیں۔لیکن کچھ نہیں کر سکتے بلکہ شخصی آزادی کے نام پر کھلی چھٹی دینے پر مجبور ہیں۔حد تو یہ ہے کہ ان طور طریقوں سے تنگ آنے کے باوجود کچھ سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔دوسروں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے برباد کر رہے ہیں۔نشہ آور اشیاء کھا کر بیکار پڑے رہتے ہیں۔یا ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔

مجھے ایک احمدی دوست نے بتایا کہ ایک ایبورجینی مسلمان ہو گیا ہے۔کچھ عرصہ بعد اس کے دوستوں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں مسلمان ہو کر کیا ملا؟ کہنے لگا میں اب صاف ستھرا رہتا ہوں کیونکہ نماز پڑھنی ہوتی ہے۔باقاعدہ شادی کر کے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔نہ مَیں شراب پیتا ہوں نہ کوئی اور نشہ کرتا ہوں۔جوا بھی نہیں کھیلتا ہوں۔کام کر کے کھاتا ہوں میرے پاس پیسے بچتے ہیں اس لئے مَیں نے اپنا مکان بھی قسطوں پر خرید لیا ہے۔جبکہ تم سب اپنے پیسے ادھر ادھر ضائع کر دیتے ہو۔اور کرایہ کے مکانوں میں رہتے ہو۔اب بتاؤ کہ میں اچھا ہوں کہ تم؟

جو کچھ اس نے کہا اگر وہ سچ ہے تو اس نے مسلمان ہونے کا دنیا ہی میں فائدہ اٹھا لیا اور آخرت کا فائدہ الگ ہے یہی ایبورجینز کے لئے پیغام ہے۔اگر سوچیں تو اسلام کے قلعہ کے اندر آجائیں تو سب دکھوں اور پریشانیوں سے بچ جائیں گے۔

مشہور آدمیوں کے بال چوری ہونے کا خطرہ

جب سے یہ امکان پیدا ہوا ہے کہ کسی شخص کے بالوں سے اس کا ڈی این اے حاصل کر کے بطریق کلوننگ ہو بہو اس شخص کی شکل وصورت کا انسان پیدا کیا جاسکتا ہے (اگرچہ اس کی روح اور اس سے متعلقہ اخلاقی وروحانی استعدادیں مختلف ہوں گی) بڑے بڑے آدمیوں کے بالوں کی خرید وفروخت کا کاروبار شروع ہوگیا ہے۔

آرمسٹرانگ (Armstrong) چاند پر قدم رکھنے والا پہلا شخص تھا وہ امریکہ میں ایک دوکان سے ہر ماہ حجامت بنوایا کرتا تھا۔اس کے باربر کے پاس ایک ایسا شخص آیا جس کا دھندا دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کے بال جمع کرنا ہے اور اب تک کئی مشہور شخصیات کے بال اکٹھے کر چکا ہے جن میں آئن سٹائن، ابراہام لنکن، جان کینیڈی، نپولین اور کنگ چارلس وغیرہ شامل ہیں اس نے باربر سے آرمسٹرانگ کے بال خریدنے کی پیشکش کی لیکن باربر نے انکار کر دیا۔لیکن جب اس نے بہت اصرار کیا تو وہ تین ہزار ڈالر کے عوض بال بیچنے پر رضامند ہوگیا۔ باربر نے قیمت وصول کی اور اپنے بل ادا کر دیئے جب آرمسٹرانگ کو اس کا علم ہوا تو اس نے اپنے بال واپس طلب کئے ۔جب باربر نے معذوری ظاہر کی تو اس نے اپنے وکیل کے ذریعہ اس کو دھمکی دے دی آخر معاملہ اس پر ختم ہوا کہ باربر وہ رقم آرمسٹرانگ کی مرضی کے مطابق خیرات کر دے۔

یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں ہے ۔اس طرح کے کئی واقعات ہو چکے ہیں ۔ایک گلوکار

(ایلویز پرلسیلے) کے بال اس کے باربر نے ۱۲۰، ۱۱۵(ایک لاکھ پندرہ ہزار یکصد بیس) ڈالر میں فروخت کئے تھے اور اس سلسلہ میں ریکارڈ قائم کیا تھا۔

(ماخوذ سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۳/جون ۲۰۰۵ء)

(الفضل انٹرنیشنل)

مردہ عضو کی تجدید کی کوشش

انسان کے جسم میں اوسطاً دس ہزار ارب (Ten Trillion) سیلز ہوتے ہیں۔ ہر سیل (Cell) کے مرکزہ (DNA) میں تین ارب جنیاتی حروف (Genetic Letters) ہوتے جن سے وہ ہدایات یا پروگرام مرتب ہوتا ہے جن کے مطابق جسم کا کوئی خاص حصہ بنتا اور کام کرتا ہے۔ یہ ہدایات جو Genes کہلاتی ہیں اور تعداد میں تیس تا چالیس ہزار ہوتی ہیں ہر سیل کے اندر مالک نے رکھی ہوتی ہیں۔ لیکن ہر عضو یا ٹشو میں کچھ ہدایات فعال (Active) ہوتی ہیں اور کچھ خوابیدہ (Dormant)۔ ایسا ہونا ضروری ہے ورنہ جسم کا کوئی حصہ بھی نہ بن سکے۔ اگر ان ہدایات کو اپنی مرضی کے مطابق فعال یا خوابیدہ بنایا جاسکے اور یہ پتہ چل جائے کہ جسم کے کونسے حصہ میں وہ کونسی ہدایات ہیں جو فعال یا خوابیدہ ہوتی ہیں اور ایسی تبدیلی کر کے اس کو جسم کے اس حصہ میں پہنچا دیا جائے تو وہ خود ہی وہاں افزائش پا کر مردہ حصہ جسم کا کام سنبھال لے گا۔ اس کو Reprogramming of Genes کہا جاتا ہے۔ یہ تجربات اب چوہوں پر ہو رہے ہیں۔ چوہے کی جلد سے سیل لے کر اس کی پروگرامنگ تبدیل کر کے اس کے مردہ عضو کی مرمت بطور تجربہ کی جارہی ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے ریسرچرز کو امید ہے کہ یہ طریق انسانوں میں بھی کام کرے گا اور یوں ایک وقت آئے گا کہ کینسر، ذیابیطس، الزائمر اور جسم کے دوسرے بیمار یا مردہ اعضا کی تجدید یا مرمت ممکن ہو سکے گی۔ اور اس طریق کے لئے جنین (Embryo) تیار کرنے اور اس کو ضائع کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی جس کی اخلاقیات (Morality) کی بنیاد پر مخالفت کی جارہی ہے کیونکہ آج کل یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابتدائی سیل (Stem Cell) جس کو پروگرام دے کر کوئی بھی حصہ جسم کا

بنایا جاسکتا ہے وہ صرف جنین کی ابتدائی حالت سے ہی حاصل ہوسکتا ہے جب تک کہ وہ خام ہواور اس کی ابھی پروگرامنگ نہ ہوئی ہو (یعنی ابھی سیل بالغ (Mature) نہ ہوا ہو۔ جس کو اپنا کام سرانجام دینے کی ہدایات مل چکی ہوں)

سائنسدانوں کا اندازہ ہے کہ اگر جسم کے سارے ڈی این اے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر رکھے جائیں تو یہ اتنی لمبی زنجیر بنے گی کہ سورج جو نو کروڑ میل دور ہے وہاں تک پہنچ کر چھ سو بار واپس زمین تک آسکے گی اور ان پر جو انفرمیشن یا ہدایات درج ہیں ان کو لکھنے کے لئے ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ۲۰۰ ٹیلی فون ڈائریکٹری کے برابر رجسٹر درکار ہیں۔

(ماخوذ سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۸/جون ۲۰۰۵ء)

کیا یہ اتفاقی حادثہ ہے یا ایک کامل حکیم ہستی کا عظیم الشان ڈیزائن؟

(الفضل انٹرنیشنل)

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

اگر کسی حادثہ میں کان ٹوٹ کر گر جائے (یا کوئی ماسٹر مروڑتے مروڑتے جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکے) تو بازار سے نیا کان آرڈر پر بنوایا جاسکتا ہے جو اصلی کان ہی کی طرح انسان کے اپنے جسم کا حصہ ہوگا۔ سائنس کی اس نئی شاخ کا نام ''ٹشو انجینئرنگ'' ہے اس میں لیبارٹری میں انسان کی اپنی جلد اور مرمری ہڈی کو جسم کے ایک ذرہ سے اگا کر بڑھایا جاسکتا ہے۔ فی الحال اس لیبارٹری میں کان اور ناک بنائے جاسکے ہیں۔ بعض لوگوں کے کان لڑائی بھڑائی میں اتنے کچلے جاتے ہیں کہ انہیں کو دوبارہ نہیں لگایا جاسکتا ایسی صورتوں میں یہ سائنس کام آئے گی۔ لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہوگئی بلکہ اب جگر، جلد، کان مرمری ہڈی، دل کے والو، وہ سخت قسم کے ریشے جو پٹھوں کو ہڈی سے جوڑتے ہیں (Tendons) آنتیں۔ خون کی شریانیں اور چھاتی کے اعصاب تک کامیابی سے بنانے کا امکان پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ بہت دلچسپ تھا۔ مختلف شکل کے اعضاء تیار کرنے کے لئے ایک خاص قسم کا مصالحہ (Porous, Biodegradable Polyester) تیار کیا گیا۔ اس سے کان کی شکل کا فرما (Scaffolding) بنایا گیا اس کے اوپر انسانی مرمری ہڈی کے ذرات بکھیرے گئے ان کو اب ترقی دینے کے لئے پہلے سے تیار شدہ ایک چوہے کے جسم پر لگادیا گیا۔ یہ چوہا بغیر بالوں کے تھا اور DNA انجینئرنگ کے ذریعہ اس کو ایسا بنایا گیا تھا کہ اس میں دفاعی نظام (Immune System) بہت ہی کم ہوتا کہ وہ انسانی جسم کی پیوندکاری کو بڑھانے سے انکار نہ کردے یعنی Reject نہ کردے۔ امریکہ میں ٹشو انجینئرنگ کی شاخ پر کافی تحقیقی کام ہو رہا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل)

''نیلی بیگم'' کی ملکیت پر جھگڑا

پرنس آغا خان کا شمار دنیا کے امیر ترین افراد میں ہوتا ہے۔انہوں نے پچیس سال قبل ایک برطانوی نژاد ماڈل گرل سارہ کروکر پول (Sarah Crocker Poole) سے شادی کی تھی اوران کا اسلامی نام سلیمہ رکھا گیا تھا۔آغا خان اسماعیلیوں کے امام ہیں ۔ان کے اس شادی سے تین بچے بھی ہیں۔آپ برطانوی شہری ہیں اگرچہ رہائش بالعموم سوئٹزرلینڈ میں رہتی ہے۔

اب میاں بیوی کی علیحدگی ہوگئی ہے اور جنیوا کی عدالت میں ۱۹ ملین ڈالر کے ہیروں کی ملکیت کے مسئلہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔ان ہیروں میں سب سے قیمتی ہیرا دل کی شکل کا ایک گہرے نیلے رنگ والا ہے جس کا نام ''نیلی بیگم'' (Blue Begum) ہے اور اکیلا ہی تقریباً نوے لاکھ ڈالر کا ہے۔ پرنس سلیمہ اسے فروخت کرنا چاہتی ہیں لیکن آغا خان نے جنیوا کی عدالت سے اس فروخت کو روکنے کا حکم نامہ حاصل کرلیا ہے۔طلاق کی شرائط کے مطابق تمام ہیرے شہزادی سلیمہ کی ملکیت ہیں لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو یہ خاندان ہی میں رہیں گے۔ دیکھیں ''نیلی بیگم'' بالآخر کون لے جاتا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل)

گلیوں اور پارکوں کی صفائی کے لئے پچیس ہزار مکھیوں کی بھرتی

ایک خبر کے مطابق Warringah کی کونسل آسٹریلیا یا شاید دنیا بھر میں پہلا ادارہ ہے جس نے گلیوں اور پارکوں میں سے کتوں کے پاخانہ کو ختم کرنے کے لئے فرانس، سپین اور شمالی افریقہ سے ۲۵ ہزار مکھیاں درآمد کی ہیں۔ یہ پہلا حیاتیاتی ہتھیار ہے جو کتوں کے پھیلائے ہوئے گند کے خلاف استعمال کیا گیا ہے۔اس کونسل کے علاقہ میں کتوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے جو سات لاکھ بیان کی جاتی ہے اور سڑکوں اور پارکوں وغیرہ میں ۱۰۰ ٹن گند ہر روز پھیلاتے ہیں جس کی وجہ سے بارش کا پانی جو اس علاقہ سے بہہ کر آتا ہے اس میں فاسفیٹ کی مقدار بہت بڑھ گئی ہے نیز اس کے ذریعہ سے پانی میں ایسے جراثیم داخل ہو جاتے ہیں جس سے کان کی بیماری پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ مکھیاں اس گند کو چٹ کر جاتی ہیں اور خوب پھولتی پھلتی ہیں لیکن یہ ۷ ملی میٹر سے زیادہ لمبی نہیں ہو سکتیں اور جونہی ان کی غذا ختم ہوتی ہے وہ اپنا کام ختم کرتے ہی مر جاتی ہیں۔لہٰذا فضا میں آلودگی نہیں پیدا کرتیں۔

مکھیوں کو خریدنے سے پہلے ان کے بارہ میں پوری معلومات حاصل کی گئیں ان کی صفات وعادات کا معائنہ کیا گیا اور غالباً یہ بھی سوچا گیا ہوگا کہ تین مختلف علاقوں کی مکھیوں کا باہمی ربط وضبط کیسا ہوگا اور آیا شمالی افریقہ کی مکھیاں فرانس والوں کو اور فرانس والی سپین والوں کو برداشت کر سکیں گی یا نہیں اور پھر کسی نے کہا ہوگا کہ مکھیاں بہرحال مکھیاں ہیں کوئی انسان تو نہیں کہ باہم فساد کریں گی

اور ایک دوسرے کا خون بہائیں گی۔ اور یوں بغیر کسی کھٹکہ کے بھرتی کر لی گئیں اور بغیر تنخواہ کے مزدور میسر آ گئے۔

(الفضل انٹرنیشنل)

مکڑی کی مامتا

آسٹریلیا کے یوکلپٹس کے جنگلوں میں مکڑی کی ایک خاص قسم پائی جاتی ہے جس کا نام (Crab Spider) ہے۔ دنیا بھر میں مکڑیوں کی پینتیس ہزار انواع پائی جاتی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔ اس پر ملبورن یونیورسٹی نے تحقیق کی ہے جو جولائی ۱۹۹۵ء کے رسالہ Nature میں شائع ہوئی ہے۔

یہ مکڑی دوسری انواع کے برخلاف گرمیوں میں انڈوں پر بیٹھتی ہے۔ اور اس کے بچے ابھی اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ خود غذا تلاش نہیں کر سکتے کہ سردیاں آجاتی ہیں۔ چنانچہ ماں موسم خزاں میں اپنے آپ کو موٹا کرتی رہتی ہے۔ پھر اپنے خون (Hyemolymph) کو غذائیت سے بھرپور ''دودھ'' میں تبدیل کرتی ہے۔ پھر اپنا آپ ان کے آگے ڈال دیتی ہے۔ وہ ابھی زندہ ہی ہوتی ہے لیکن بچے اس کا خاص طور پر تیار شدہ خون چوستے ہیں۔ پھر اس کے انڈے، ذوق وشوق سے کھاتے ہیں۔ پھر ماں کی ٹانگیں ان کی بھوک کا مداوا کرتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ باقی جسم بھی ان کی نذر ہو جاتا ہے۔ تب تک موسم سرما بہار میں تبدیل ہونے لگتا ہے اور بچے بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ماں خود اپنی قربانی پیش کر کے اپنی زندگی اپنے بچوں کو منتقل کر دیتی ہے۔

محقق ایک ننھی منی مکڑی کی مامتا کے جذبہ پر حیران ہیں جس کا سارا جسم ۹ ملی میٹر اور طبعی عمر ایک سال ہوتی ہے۔ سائنس دانوں نے پتہ کیا کہ جب ماں یہ قربانی پیش کر رہی ہوتی ہے تو بچوں کا باپ کہاں ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ وہ غریب مادہ مکڑی سے ملاپ (Mating) کرنے کے فوراً بعد ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ گویا ماں باپ دونوں کی بے مثال قربانی کی بدولت ہی ان کی نسل زندہ

ہے۔ وہ دونوں ہی تعریف کے قابل ہیں لیکن اصل تعریف تو اس خدا کی ہے جس نے ان کے اندر ایسا جذبہ بطور جبلت پیدا کر دیا۔ جو وہ نسلاً بعد نسل اپنی اولاد کو ورثہ میں منتقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ کروڑوں ہی موسم سرما ان پر گزر چکے ہوں گے لیکن ان کے وجود کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

(الفضل انٹرنیشنل)

اڑن طشتریوں کی حقیقت

اخبار گارڈین لکھتا ہے کہ اڑن طشتریوں کی حقیقت معلوم کرنے کا بخار جتنا مغربی دنیا کو آج کل چڑھا ہوا ہے۔ اتنا پہلے کبھی نہ تھا۔ ایک پندرہ روزہ رسالہ Fortean Times تو صرف ایسی باتوں کے لئے وقف ہو گیا ہے جن کی سائنسی توجیح ممکن نہیں۔ لوگوں کے ذوق شوق کا یہ عالم ہے کہ تین سال قبل اس کی اشاعت جو صرف تین ہزار تھی اب بڑھ کر چالیس ہزار ہو چکی ہے۔

انٹرنیٹ (Internet) اڑن طشتریوں (U.F.O) یعنی Unidentified Flying Objects پر بحثوں سے اٹا پڑا ہے۔ اس پر یونیورسٹیوں کے پروفیسر تک کتابیں لکھ رہے ہیں جو ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہیں۔ الغرض اڑن طشتریوں پر گفتگو اب ایک دلچسپ مشغلہ بن چکا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مغربی دنیا روحانی رموز و اسرار پر آ گاہی حاصل کرنے کے لئے بہت متجسس ہے لیکن وہ مذہب کا رخ اس لئے نہیں کرتے کہ اس کے احکام و قوانین پر عمل کرنا انہیں دوبھر لگتا ہے۔ اس لئے ادھر ادھر سے اسرار روحانی کا علم حاصل کرنے کے لئے کان لگائے بیٹھے ہیں۔

لوگوں کے بڑھتے ہوئے تجسس کو دیکھتے ہوئے اب اڑن طشتریوں پر ایک فلم بھی بن گئی ہے جو اگست میں دکھائی جائے گی۔ کہتے ہیں فلم میں وہ مبینہ منظر بھی شامل ہو گا جس میں دو ایسے مردہ اجسام پر اپریشن کیا گیا تھا جن کی اڑن طشتری نیو میکسیکو کے Roswell Air Force Base نزدیک ۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو دن کے ساڑھے گیارہ بجے زمین پر گر کر تباہ ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر جن کا آپریشن کرتے دیکھائے گئے ہیں ان کی بارہ بارہ انگلیاں تھیں، بارہ ہی ٹخنے، پیاز کی شکل کے جسم اور لمبے سر تھے۔ جو لوگ اڑن طشتریوں کے وجود کو مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ امریکہ کی ائیر فورس نے اس واقعہ پر

پردہ ڈالا ہوا ہے۔لیکن دوسری طرف ائرفورس والوں کا کہنا ہے کہ اس فلم میں جو کچھ وہ دکھانے کا کہتے ہیں وہ ایک دھوکہ پر مبنی مذاق کے سوا کچھ نہیں۔

اڑن طشتریوں کی حقیقت کے بارہ میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ زمین کے علاوہ آسمانی کروں میں بھی چلنے پھرنے والی زندہ مخلوق خدا نے پیدا کی ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

> ''اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے جانداروں کی قسم سے اس نے پھیلایا ہے۔اس کے نشانوں میں سے ہے اور جب چاہے گا ان سب کو جمع کرنے پر قادر ہوگا (الشوری:۳۰)

خدا ہی جانتا ہے کہ اس مخلوق کی نوعیت کیا ہے اور یہ اجتماع کب، کیسے اور کہاں ہوگا۔اس کائنات میں کہیں ہوگا یا قیامت کے روز۔

(الفضل انٹرنیشنل)

کیا سترہ لاکھ انواع کے جوڑے کشتی نوح میں سوار کئے گئے تھے؟

یو این او کے ایک ادارہ نے دنیا میں موجود انواع (Species) کی پہلی بار گنتی کی ہے (First Global Biodiversity Assessment) جس کے مطابق دنیا میں حیوانوں، درختوں، پودوں، کیڑے مکوڑوں اور بکٹیریا وغیرہ کی تیرہ تا چودہ ملین انواع پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے تیس ہزار انواع صرف ایک نوع (یعنی انسان) کے ہاتھوں مٹنے کے قریب ہیں۔ ان انواع میں سے صرف پونے دو ملین ایسی ہیں جن کو دستاویزی شکل میں ریکارڈ پر اب تک لایا جا چکا ہے۔ کیڑوں میں سے سات ملین انواع ایسی ہیں جن کو ابھی شمار نہیں کیا جا سکا۔ یہی حال دوسری انواع کا ہے۔ ایک اخباری کالم نگار ان اعداد و شمار کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ واہ نوحؑ کے بھی کیا کہنے ہیں چودہ ملین انواع کے جوڑوں کو ایسی کشتی میں بھر دینا جو صرف ۱۵۰ میٹر لمبی ۲۵ میٹر چوڑی اور ۱۵ میٹر اونچی تھی جگہ کے صحیح استعمال کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو صرف انہی کا حصہ تھی۔ لیکن سب سے بڑا کارنامہ ہے جو صرف انہی کا حصہ تھی۔ لیکن سب سے بڑا کارنامہ تو عظیم الجثہ ڈائنا سورز (Dinosaurs) کو کشتی میں سوار کرنا تھا لیکن افسوس کہ حضرت نوح کی کوشش کے باوجود یہ نوع زیادہ دیر تک نہ بچ سکی۔

کالم نگار نے جس واقعہ کی طرف طنزیہ اشارہ کیا ہے وہ بائبل میں پیدائش (Genesis) کے باب سات اور آٹھ میں بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق طوفان نوح ساری زمین پر محیط تھا اور ہر زندہ چیز جو زمین پر اس وقت موجود تھی انسان، جانور، پرندے وغیرہ سب مٹ گئے تھے اور صرف وہی

بچے تھے جو نوح کے ساتھ کشتی پر سوار تھے۔ یہ بیان موجودہ بائبل کے ان مقامات میں سے ہے جنہوں نے لوگوں کو دہریہ بنا کر مذہب سے دور کر دیا ہے اور قرآن کریم نے بائبل کی اصلاح کی ہے۔

قرآن کے مطابق نوحؑ تمام دنیا کی طرف نبی نہ تھے بلکہ ایک قومی نبی تھے۔ قرآن بار بار ''اس کی قوم''، ''میری قوم'' کے الفاظ میں ان کی امت کا ذکر کرتا ہے۔ شرعی عذاب نبی کے انذار کے بعد ہی نازل ہوتا ہے۔ حضرت نوحؑ نہ ساری دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور نہ ساری دنیا پر طوفان کا عذاب آیا تھا۔ یہ بھی قرآن میں نہیں لکھا کہ حضرت نوحؑ کو تمام ذی حیات انواع اور ان کی خوراک کو کشتی پر سوار کرنے کا حکم ملا تھا۔ ان کو صرف ضروری جانور ساتھ رکھنے کا حکم ہوا تھا۔ ایسے ہی تمام دنیا کے انسان نوحؑ کے تین بیٹوں کی اولاد نہیں بلکہ جہاں نوح علیہ السلام کے ساتھ جو چند مومن تھے ان کی نسل چلی ہوگی وہاں ان انسانوں کی بھی جو زندگی کے آغاز ہی سے دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل چکے تھے۔ پس جہاں قرآن کریم صحیح واقعات کو بیان کرتا ہے وہاں اس امر میں بائبل کا بیان وحی والہام سلسلہ نبوت اور خدا کی ہستی کے بارہ میں مطمئن نہیں کرتا بلکہ شکوک وشبہات میں مبتلا کرتا ہے جیسا کہ کالم نگار کے مذکورہ بالا فقرات سے ظاہر ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 2.2.96)

فطرت انسانی کی آواز

آسٹریلیا میں کئی چرچوں کے تعاون سے ایک سروے حال ہی میں کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ پتہ لگانا تھا کہ چرچوں کی حاضری جو دن بدن گر رہی ہے تو کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ لوگوں کو خدا کی ذات پر سے ہی ایمان اٹھ گیا ہے یا ان کو چرچ میں جانے کی کوئی افادیت نظر نہیں آتی۔ سروے کے نتائج دلچسپ ہیں پہلی بات تو یہ کہ ۷۵ فیصد لوگوں نے کہا کہ خدا یا کوئی طاقت بالا ضرور موجود ہے اور ۱۰ فیصد نے کہا کہ کوئی بالا طاقت ہونی چاہئے اور یہ ۸۵ فیصد وہ لوگ تھے جن کی اکثریت چرچ نہیں جاتی۔ صرف ۸ فیصد ایسے تھے جنہوں نے کہا کہ انہیں خدا پر یقین نہیں ہے اور باقی نے یہ کہا کہ انہیں خدا کے وجود میں شک ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بے خدا معاشرہ کے صرف ۲۰ فیصد افراد نے کہا کہ خدا کے احکامات خداوندی پر عمل کرنا چاہئے۔ ریسرچ کے نتیجہ کے طور پر اس کے مصنف کہتے ہیں

> ’’کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے عقیدہ اور عمل کا درمیانی رابطہ ٹوٹ چکا ہے کچھ لوگ جن کو مذہب سے زیادہ لگاؤ ہے وہ خدا اور بندے کے درمیان ایک فعال تعلق کے قائل ہیں لیکن بہت دوسرے ایسے ہیں جو ایسا خیال نہیں کرتے۔‘‘

(الفضل انٹرنیشنل 2.2.96)

آسٹریلیا کے کوڑا کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کے لئے بھوکے جراثیم کی خدمات حاصل کی جائیں گے

گھروں کا کوڑا کرکٹ دو قسم کا ہوتا ہے ایک نامیاتی (Organic) یعنی جو ایسی اشیاء کا بچا کھچا حصہ یا فضلہ ہوتا ہے جو زمین اگاتی ہے اور دوسرا غیر نامیاتی (Inorganic) جیسے پلاسٹک کاغذ، گتہ، کپڑا وغیرہ پہلی قسم جو نامیاتی ہے اس کے کوڑا کرکٹ کی مقدار آسٹریلیا کے بڑے آٹھ شہروں میں ۲۲ ملین ٹن تک سالانہ ہوتی ہے۔ اتنی بڑی مقدار کو ٹھکانے لگانا ایک خاصہ مشکل مسئلہ ہے حکومت نے ۲۰۰۰ء تک اس مقدار کو ۴۰% کم کرنے کا ہدف مقرر کیا ہے۔ حکومت نے بتیس لاکھ ڈالر کے خرچ سے ایک تحقیق کروائی ہے جو دنیا بھر میں اس سلسلہ کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ تحقیق ہے۔ چنانچہ ایک ایسا بکٹیریا تیار کیا گیا ہے جو تیس سال کی بجائے صرف پانچ سال کے عرصہ میں کوڑا کرکٹ کو کھا کر اور اس پر عمل کر کے اسے نہایت قیمتی کھاد میں تبدیل کر دے گا جو ملک کے اندر اور باہر فروخت کی جا سکے گی اور پھلوں اور اجناس کی پیداوار بڑھانے کا موجب ہوگی۔ اس طرح ان جراثیم (بکٹیریا) کی مدد سے ہر سال جہاں کروڑوں ٹن کوڑا کرکٹ ٹھکانے لگ جایا کرے گا وہاں نہایت قیمتی روڑی بھی مہیا ہو جائے گی۔ گویا آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والی بات ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 16.2.96)

عمر بھر تر و تازہ رہنے کے لئے مچھلی کھائیں

انگلینڈ کے طبی مجلّہ The Lancet میں یونیورسٹی آف سرے کی ایک تحقیق شائع ہوئی ہے کہ مچھلی کے تیل میں جو اومیگا ۳ (Omega3) قسم کے تیل ہوتے ہیں وہ رات کے وقت نظر کی خرابی اور آنکھوں کی بیماری Dyslexia (جس میں پڑھنا مشکل ہوجاتا ہے) کے لئے بہت مفید ہے۔ جو مائیں حمل کے دوران مچھلی زیادہ کھاتی ہیں ان کے بچے زیادہ ذہین ہوتے ہیں اور جو ہونے والی مائیں مچھلی نہیں کھاتیں ان کے بچوں کے دماغ اور آنکھ کے پردہ کی جھلی کمزور رہ سکتی ہے کیونکہ اس سے ڈی۔ایچ۔اے (Docosahexaenoic Acid) کی کمی ہوجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے دماغ اور آنکھوں کی صحیح نشو ونما نہیں ہوسکتی۔

مچھلی پر کئی ادارے تحقیق کر رہے ہیں۔ سڈنی کے رائل پرنس الفریڈ ہسپتال والوں نے تحقیق کی ہے کہ جو بچے مچھلی نہیں کھاتے ان میں سے ۱۸،۴ فیصد کو دمہ کی شکایت تھی اور جو ہفتہ میں ایک بار سے زیادہ مچھلی کھاتے تھے ان میں سے صرف ۹ء۴ فیصد بچے دمہ میں مبتلا تھے۔ گویا مچھلی دمہ، زکام، کھانسی وغیرہ کے خلاف بھی جسم میں مدافعت پیدا کرتی ہے۔

سڈنی ہی میں ایک اور ادارہ Garuan Institute نے بھی مچھلی پر تحقیق کی ہے وہ کہتے ہیں مچھلی میں اومیگا۔۳ کے استعمال سے خون جمنے کا خطرہ کم ہوجاتا ہے اس سے کولیسٹرول لیول بھی کم ہوتا ہے نیز یہ جسم کی سوجن کو کم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس سے جوڑوں کی دردوں (Arthritits) میں افاقہ ہوتا ہے۔ مچھلی ذیابیطس کے لئے بھی مفید ہے۔ جن جانوروں پر تحقیق کی گئی ان میں سے ایسے جن کو انسولین کے خلاف بدن میں مزاحمت تھی ان کو مچھلی کھلانے سے انسولین

کے خلاف ان کی الرجی ختم ہوگئی۔

سڈنی مارننگ ہیرلڈ لکھتا ہے کہ مچھلی کے تیل کے ایسڈ کی صورت میں موجودہ ہزار سال کا معجزانہ علاج دریافت ہوا ہے۔ سالمن مچھلی جو بالخصوص اومیگا ۳ سے بھرپور ہوتی ہے وہ امراض قلب کولیسٹرول لیول، دمہ، آرتھرائٹس اور نظر کی بیماریوں کا بہت عمدہ علاج ہے۔ اخبار لکھتا ہے شاید ہی کوئی ہفتہ گزرتا ہوگا جب مچھلی کے فوائد پر کوئی نئی سے نئی تحقیق سامنے نہ آتی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مچھلی کو اپنے فضلوں میں سے گنواتے ہوئے اسے ''**لَحْماً طَرِيًّا**'' قرار دیا ہے (النحل: ۱۵) ''**طریاً**'' مصدر ہے جو کبھی مفعول اور کبھی فاعل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو ''**لحماً طریاً**'' کے معنے ہوئے ایسا گوشت جو تر و تازہ رکھا گیا ہے یا ایسا گوشت جو کھانے والے کو تر و تازہ رکھتا ہے یعنی صحت بخش ہے۔ اور ''طریاً'' ہونے کی وجہ سے جسم کی رطوبات کو قائم رکھتا ہے جیسے کسان زمین میں بیج بونے کے لئے اس کے ''وطر'' (وتر) پر آنے کا انتظار کرتا ہے۔ ''**طَرَی البِنَا**'' کسی عمارت کو مٹی گارے سے پلستر کرنے کو کہتے ہیں جس سے عمارت میں ایک نیا پن، خوبصورتی اور مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے۔ الغرض مچھلی کے فوائد پر ہمیشہ تحقیق ہوتی رہے گی اور ہر تحقیق قرآنی صداقت کو ثابت کرنے والی ہوگی۔

(الفضل انٹرنیشنل 16.2.96)

اس دور کے بچے بھی ذہنی دباؤ کا شکار ہیں

کچھ عرصہ قبل امریکہ میں ایک بچی Jessica ہوائی جہاز چلاتے ہوئے حادثہ کا شکار ہوگئی اس کی عمر صرف سات سال تھی۔ اگر وہ بچ رہتی تو وہ دنیا کی سب سے کمسن پائلٹ ہوتی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سڈنی کی ایک مضمون نگار Jaslyn Hall لکھتی ہیں کہ آج کے دور کے بچے سخت ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۸۲ء اور ۱۹۹۳ء کے دوران نوجوانوں کی خودکشی میں پچاس فیصد اضافہ ہوا ہے۔ بچپن سے ہی ذہنی تناؤ میں پلے ہوئے بچے جب بڑے ہونگے تو یہ تناؤ عام معاشرتی زندگی میں ضرور تلخی پیدا کرے گا۔ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ بچوں پر یہ دباؤ خود ان کے والدین اور معاشرہ کی طرف سے ڈالا گیا ہے۔ جیسیکا (جو حادثہ کا شکار ہوئی) کی والدہ نے کہا کہ تم کو پتہ نہیں میری بیٹی کو ہوائی جہاز چلانے کا کتنا شوق تھا۔ وہ اپنی اس خواہش کے پورا کرنے میں آزاد تھی۔ اس کی آزادی پر قدغن نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا اتنی چھوٹی عمر کی بچی کو ہوائی جہاز کی حفاظت کا بوجھ اٹھانے پر مقرر کیا جاسکتا تھا یا اس کو اس کی اجازت دی جاسکتی تھی؟ کیا بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ان کو مناسب جسمانی سزا دینی چاہئے یا نہیں؟ یا پھر کیا بچوں کو شروع سے ہی آزاد چھوڑ دینا چاہئے؟ ان کو اپنے فرائض سمجھنے کے قابل ہونے سے پہلے ہی سارے حقوق دے دینے میں کیا خطرات مضمر ہیں؟ ان دونوں میں سے کون سی بات بچوں کی تربیت اور بہتر معاشرہ کی تعمیر کے لئے زیادہ مناسب ہے؟ وہ لکھتی ہیں کہ کسی زمانہ میں والدین بچوں کو بتایا کرتے تھے کہ کیا بات درست ہے اور کیا غلط۔ وہ کیا کریں، کیا نہ کریں اور عمر اور سمجھ کے لحاظ سے کس چیز یا مقام کا حصول ان کے لئے مناسب ہے وغیرہ وغیرہ لیکن اب اس کی بجائے والدین بچوں سے غیر حقیقی

توقعات وابستہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''تم یہ کر سکتے ہو۔ مجھے پتہ ہے تم کر سکتے ہو' اور بچوں کی طرف سے جذباتی جواب یہ ہوتا ہے میں اسے کیوں نہیں کر سکتا یا کر سکتی، میں یہ حاصل کرنا چاہتا ہوں یا کرنا چاہتی ہوں''۔ مغربی معاشرہ میں سن بلوغت کے اثمار ووٹ کا حق ،الکوحل خریدنے کا حق اور ڈرائیونگ Licence کے حصول کا حق تصور کئے جاتے ہیں۔لیکن عصر حاضر کے معاشرہ میں یہ حدود مسلسل تبدیل ہو رہی ہیں۔ بچوں سے غیر حقیقی اور غیر طبعی توقعات وابستہ کی جاتی ہیں۔ چودہ سال کی سپر ماڈل لڑکی، تیرہ سال کا اولمپک تیراک اور اگر جیسیکا زندہ رہتی تو سات سال کی پائلٹ لڑکی وغیرہ بچوں کو کہا جاتا ہے کہ زندگی کا مزا ہی کیا ہے۔اگر پندرہ سال تک تم مقصد زندگی حاصل نہ کر سکو۔ معاشرہ کی طرف سے بچوں پر الگ دباؤ ہیں۔نوجوانوں کی بیکاری کا خوف، کم سے کم عمر میں زیادہ سے زیادہ کاموں میں مہارت حاصل کرنے کا فکر، چھوٹی سے چھوٹی عمر میں پڑھائی کا آغاز، سکول میں ہوتے ہوئے یونیورسٹی کورسز میں داخلہ، نئے سے نئے کمپیوٹر کو استعمال کرنے کا مقابلہ، بچوں کے لئے لڑائی بھڑائی، قتل وغارت اور سیکس پر مبنی فلمیں، ویڈیو، رسالے اور کمپیوٹر کے پروگرام وغیرہ۔ مضمون نگار آخر پر لکھتی ہیں کہ آج کے بچوں کے والدین اور بڑوں کے لئے یہ بھاری چیلنج ہے کہ وہ بچوں کے حق انتخاب (Freedom of Choice) اور ذمہ دارانہ افعال (Responsible Action) کے درمیان نازک توازن قائم کریں۔

یہ مضمون خیال افروز ہے بالخصوص ایک ایسی جماعت کے لئے جو دنیا کی اصلاح کے لئے کھڑی کی گئی ہو۔اسلام میں والدین کو بچوں کا امین اور محافظ ونگران مقرر کیا گیا ہے۔ جہاں اولاد کے احترام اور چھوٹوں پر شفقت کی تلقین کی گئی ہے وہاں اساتذہ اور بڑوں کے حقوق بھی قائم کئے گئے ہیں اسلام میں نیکی کی تلقین اور برائی سے روکنا معاشرہ کی بہتری کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور اسے شخصی آزادی کے منافی نہیں سمجھا جاتا۔اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ موجودہ کلچر کے ایسے اجزاء جو قرآنی تعلیم کے مخالف ہیں انہیں بار بار اپنی نظر کے سامنے لاتے رہیں اور اس سے مجتنب رہنے کی کوشش کرتے رہیں۔آمین

(الفضل انٹرنیشنل)

پہلی ٹیسٹ ٹیوب بے بی اٹھارہ سال کی ہوگئی

سائنس کے اس شعبہ سے متعلقہ مذہبی، سماجی واخلاقی مسائل

برطانیہ کی لوئیس براؤن دنیا بھر میں پہلی ٹیسٹ ٹیوب بے بی ہے۔ وہ حال ہی میں اٹھارہ سال کی ہوگئی ہے اور بچوں کی نرسنگ کی تعلیم حاصل کررہی ہے۔ لوئیس کی پیدائش ایک ایسے طریق علاج سے ممکن ہوئی جس کو آئی وی ایف (In Vitro Fertilisation) کہتے ہیں۔ اس میں جنین (Embryo) کو مصنوعی طریق سے ٹیسٹ ٹیوب میں پیدا کیا جاتا ہے اور مزید پرورش کے لئے اسے اس کی قدرتی حیاتیاتی ماں کے جسم میں پیوند کردیا جاتا ہے۔ اس طریق علاج کی بدولت اب تک ڈیڑھ لاکھ بچے پیدا ہوچکے ہیں جن میں سے بیس ہزار صرف آسٹریلیا میں ہیں۔ اکثریت ایسے بچوں کی ہے جن کے والدین پہلے اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ اس لحاظ سے سائنس کی یہ ایجاد خدا کے فضل کے حصول کا ذریعہ بن گئی ہے۔

لیکن ہر اچھی ایجاد کی طرح اس کے بھی بعض ایسے پہلو ہیں جن سے مذہبی، سماجی اور اخلاقی مسائل پیدا ہورہے ہیں۔ کئی لوگ غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شوقیہ بھی الٹے پلٹے کام کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات سامنے آئے ہیں یا ان کا امکان ہے کہ ایک عورت اپنے بیٹے اور بہو کے بچے کو جنم دے رہی ہے گویا وہ بچہ کی ماں بھی ہے اور دادی بھی۔ دوسری اپنے والد اور والدہ کے بچے کو جنم دے رہی ہے گویا وہ بچہ کی ماں بھی ہے اور بہن بھی۔ تیسری اپنی ہمشیرہ کے بچے کی والدہ بن گئی ہے۔ چوتھی ایک وفات شدہ جوڑے کے بچے کی ماں ہے۔ اور پانچویں ایک لاتعلق جوڑے کی

اولاد کو اجرت پر اپنے پیٹ میں پال رہی ہے یا ایسے بچہ کو جس کے حیاتیاتی والدین (Biological Parents) نے کبھی ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ ہو۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اس غیر ذمہ دارانہ طرز عمل سے رشتوں کے تقدس اور حسب نسب کو پامال کرنے کے امکان پیدا ہو رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک فوری مسئلہ یہ سامنے آیا ہے کہ اس وقت صرف برطانیہ میں ساٹھ ہزار جنین (Embryos) لیبارٹریوں میں نائٹروجن میں منجمد پڑے ہیں۔ جن میں سے نو ہزار ایسے ہیں جن کو وجود میں آئے ہوئے اب پانچ سال پورے ہو رہے ہیں جبکہ برطانوی قانون کے مطابق جنین پانچ سال سے زیادہ عرصہ تک منجمد نہیں رکھے جاسکتے۔ یہ ایسے جنین ہیں جن کا کوئی وارث نہیں۔ بعض غیر شادی شدہ عورتیں یا لا اولاد جوڑے ان کو حاصل کر کے متبنیٰ (Adopt) بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن جن کے وہ ہیں ان کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں ہوسکتا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ ان جنینوں کا کیا کیا جائے۔ کیا ان کو جلا کر راکھ کر دیا جائے اور کیا ایسا کرنا انسانی جانوں کے مارنے یا حمل ضائع کرنے (Abortion) کے مترادف ہے یا نہیں۔ یوں بھی ہر دفعہ جب بغرض علاج ٹیوب میں جنین تیار کئے جاتے ہیں تو وہ ضرورت سے زائد ہوتے ہیں ان میں سے صرف تین جنین پیوند کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔ جو باقی بچتے ہیں اور استعمال نہیں ہوسکتے کیا ان کو ضائع کر دینا مذہبی و اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی تو نہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے کئی سوچنے والوں کو پریشان کر رکھا ہے اور ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائے۔

(الفضل انٹرنیشنل 27.9.96)

آسٹریلیا میں گزشتہ سال ۸۲۶۰ ملین ڈالرز کا جوا کھیلا گیا

آسٹریلیا میں جوا کھیلنے کی لت روز بروز ترقی پذیر ہے۔شاید ہی اتنا جوا دنیا بھر میں کہیں اور کھیلا جاتا ہو۔گزشتہ سال اس سے پہلے سال کے مقابلہ میں ۲۰۰،املین ڈالرز کا جوا زیادہ کھیلا گیا۔ ڈالر کی حقیقی قیمت خرید کو مدنظر رکھتے ہوئے گزشتہ دس سال میں اس سے پہلے دہاکہ کی نسبت دگنی رقم جوئے پر لگائی گئی۔گویا اس رقم میں ہر سال دس فیصد اضافہ ہو رہا ہے۔جوئے پر لگنے والی رقم ۶۱۷ ڈالر فی کس سالانہ تھی ۔آسٹریلیا کی ریاستوں کی حکومتوں کے بجٹ کی دس فیصد آمد جوا کھلانے والے اداروں سے ٹیکس کی صورت میں وصول ہوتی ہے۔یہ اتنی بڑی آمد ہے کہ حکومتیں جوئے کی روز افزوں ترقی میں خاصی دلچسپی لیتی ہیں ۔انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ اس جوئے کا عوام کی اخلاقی ، اقتصادی اور سماجی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 27.9.96)

آپ کا ٹی وی ویڈیو فون کا کام بھی کرے گا

ویڈیو فون میں آپ بات چیت کے علاوہ تصویر بھی دیکھتے ہیں۔حال ہی میں امریکہ کی ایک کمپنی (MCI Corporation) نے ایک ایسے آلہ کی نقاب کشائی کی ہے جو آپ کے ٹی وی پر پڑا ہوگا اور اس میں ایک چھوٹا سا کیمرہ نصب ہوگا اور آپ کے ٹی وی اور فون دونوں کے ساتھ منسلک ہوگا۔ جب آپ کے فون کی گھنٹی بجے گی آپ ٹی وی بند کر کے فون اٹھالیں اگر دوسری طرف بھی ایسا آلہ نصب ہے تو آپ دوسری طرف بولنے والے کی جہاں آواز سنیں گے وہاں اس کی تصویر بھی ٹی وی پر دیکھ سکیں گے ۔اگر آپ خود ٹی وی کے سامنے اس وقت تک نہیں آنا چاہتے تو کیمرہ کے لینز (Lense) پر پردہ ڈال دیں۔اس آلہ کی قیمت ۱۳۰۰ ڈالر ہوگی اور فون کا خرچ اتنا ہی ہوگا جتنا آج کل بغیر تصویر کے ہوتا ہے۔آپ بات چیت کو وی سی آر پر ریکارڈ بھی کر سکیں گے اور منہ ہلائے بغیر بھی ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے کو پیغام دے سکیں گے۔خیال ہے کہ اس سال (۱۹۹۶ء) میں جون تک یہ آلہ برائے فروخت بازار میں آجائے گا۔

رابطے اتنی تیزی سے ترقی کر رہے ہیں کہ فاصلوں کے پرانے تصور مٹتے چلے جا رہے ہیں جب سے فون عام ہوئے ہیں لوگوں نے خط لکھنے بند کر دئے ہیں یا کم کر دئے ہیں۔اب ویڈیو فون جب عام ہو جائیں گے تو گفتار یار کے ساتھ دیدار یار بھی ممکن ہو جائے گا اور اس کا ریکارڈ بھی۔تو خط لکھنے کی قدیم روایت کو مزید دھکا لگے گا اور ساتھ ہی گھروں کی پرائیویسی کو بھی۔

(الفضل انٹرنیشنل 12.7.96)

پھلوں اور فصلوں کی بیماریوں کے لئے

ہومیوپیتھی طرز علاج

پھلوں اور فصلوں کی بیماریوں کے علاج کا عام طریق تو یہ ہے کہ ان پر جراثیم کش ادویہ چھڑکی جاتی ہیں۔جن سے بیماری پیدا کرنے والے جراثیم مرجاتے ہیں ۔یہ طریق علاج ڈاکٹری کی اینٹی بائیوٹک ادویہ کے مشابہ ہے۔اس میں نقصان یہ ہے کہ وہ جراثیم ان دواؤں کے عادی بنتے جارہے ہیں اوراپنے اندر تبدیلیاں پیدا کرکے ان کے خلاف قوت مزاحمت پیدا کرلیتے ہیں۔وہ دوائیں غیر مؤثر ہونے لگتی ہیں تو نئی دوائیں تلاش کرنا پڑتی ہیں۔ نیز انہی دواؤں کے زہریلے اثرات کسی نہ کسی شکل میں تھوڑا بہت ان انسانوں اور حیوانوں تک بھی پہنچتے ہیں جوانہیں استعمال کرتے ہیں۔

اس مسئلہ کے حل پرآسٹریلیا کے سائنس دان غور کررہے ہیں۔اب انہوں نے ایک جدید طریق علاج دریافت کیا ہے جس میں پودوں کوایسی دوائیں دی جائیں گی جو بجائے جراثیم کو براہ راست مارنے کے خود پودوں کی اپنی قوت مدافعت کواس طرح ابھاریں گی کہ وہ جراثیم کا مقابلہ کرکے ان کوختم کرسکیں۔گویا پودے اپنا علاج خود کریں گے۔ پودوں کی قوت مدافعت کو بڑھایا اور ابھارا جائے گا۔یہ دوائیں زہریلی نہیں ہونگی ۔یہ طریق علاج اپنی فلاسفی میں ہومیوپیتھی سے مشابہ معلوم ہوتا ہے جس میں دوا روح کوایک پیغام دیتی ہے جس سے جسم کا دفاعی نظام بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے متحرک اور مستعد ہوجاتا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 12.7.96)

چودہ ہزار سال قبل شمالی اور جنوبی امریکہ میں بھی آسٹریلیا کی اصل نسل کے لوگ آباد تھے

امریکہ اور برازیل کے سائنس دانوں نے ہزاروں سال پرانی انسانی کھوپڑیوں پر جو علیحدہ علیحدہ تحقیق کی ہے اس کے نتائج حیران کن طور پر یکساں نکلے ہیں۔

دونوں کی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ چودہ ہزار سال قبل شمالی اور جنوبی امریکہ میں بھی وہی نسل آباد تھی جو آسٹریلیا میں تھی۔ یہ تحقیق اس عام خیال کے خلاف ہے کہ امریکہ میں سب سے پہلے منگولین نسل کے ریڈ انڈین آباد ہوئے تھے۔ بلکہ ان سے پہلے آسٹریلیا کے (Aborigines) وہاں پہنچ چکے تھے۔

اس تھیوری کے مطابق چالیس ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزرا کہ اس نسل کے لوگ ایشیا سے ہجرت کر کے آسٹریلیا میں آباد ہوئے۔ بعد میں ان کی ایک شاخ آج سے چودہ ہزار سال قبل آبنائے بیرنگ (Bering Strait) سے ہوتے ہوئے ایشیا سے براعظم امریکہ میں جا آباد ہوئی۔ وہ زمین کے آخری برفانی دور کا زمانہ تھا۔ (اب سے گیارہ تا ستائیس ہزار سال قبل) اور یہ آبناء زمینی پل کا کام دے رہی تھی۔

(الفضل انٹرنیشنل 12.7.96)

سویا بین امراض قلب، کینسر اور سن یاس کے امراض کا علاج ہے

آسٹریلیا کی نیوکاسل یونیورسٹی کی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ سویا بین میں ایسے کیمیاوی مادے ہیں جن کو Isoflavones کہتے ہیں اور جو کولیسٹرول کم کرتے ہیں۔ امراض قلب، کینسر اور عورتوں میں حیض کی دائمی بندش کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بیماریوں کا مؤثر علاج ہیں۔ چند ماہ تک عام دودھ کی بجائے سویا بین کا دودھ استعمال کرنے سے تقریباً نو دس فیصد کولیسٹرول کم ہو جاتا ہے جس سے ۲۲ تا ۲۵ فیصد دل کا حملہ کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 12.7.96)

آسٹریلین کتے بھونکیں گے نہیں، صرف کاٹا کریں گے

سڈنی کے شمالی مضافات میں رہنے والے کتوں کے بھونکنے سے بہت پریشان تھے بالخصوص راتوں کو ان کی نیند خراب کرتے۔ یہاں بعض میاں بیوی جو ایک دوسرے کے خراٹوں کو بھی برداشت نہیں کرتے وہ بھلا کتوں کے بھونکنے کو کب تک برداشت کرتے۔ آخر جب شکایات بہت بڑھیں تو ان کے تدارک کی طرف بھی توجہ پھری۔ معلوم ہوا کہ اس طرح کی شکایات فرانس میں بھی ہیں چنانچہ ایک فرانسیسی کمپنی نے اس کا علاج ایک کالر کی شکل میں دریافت کرلیا ہے۔ یہ کالر کتون کو بھونکنے سے روکتا ہے۔ اس کی قیمت ۱۹۰ ڈالر ہے جس میں کچھ الیکٹرانک آلات، بیٹری، مائیکروفون اور ایک تیز بدبودار مگر بے ضرر دوائی کی پچکاری ہے۔ جب کتا بھونکنے لگتا ہے تو اس کی آواز سے آلات متحرک ہوتے ہیں اور دوائی کی پھوار کتے کے ناک پر پڑتی ہے اور وہ بھونکنا بند کردیتا ہے۔ تقریباً ایک ہفتے کے بعد کتے کو بھونکنے سے نفرت ہوجاتی ہے اور وہ غریب بھونکنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ یہ کالر کثیر تعداد میں فرانس سے درآمد کئے گئے ہیں لہٰذا یہاں کے کتے کتیاں بھونکنے سے ہی متنفر ہورہے ہیں۔ اب کتے بھونکیں گے نہیں بلکہ سیدھا کاٹا ہی کریں گے۔

کیا پتہ کل کلاں کو انسانوں کے لئے بھی ایک ایسا کالر تیار ہوجائے کہ جونہی کوئی دل آزار، غیظ وغضب، طعن و تشنیع اور بدظنی وغیبت کی بات منہ سے نکلے تو کالر سے ایسی پھوار نکلے جو زبان کو بات کرنے سے روک دے۔ ایسا روحانی کالر تو خدا نے پہلے ہی انسان کے ساتھ باندھا ہوا ہے شاید کبھی جسمانی بھی ایجاد ہوجائے۔ جیسے فرمایا ’’ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (قٓ:۱۹) یعنی انسان کوئی بات نہیں بولتا مگر اس کے پاس کوئی نگران ومحافظ ہوتا ہے جو اسے

ریکارڈ کرتا جاتا ہے۔قرآن کریم انسان کے گلے میں کالر باندھنے کا بھی ذکر کرتا ہے جو یوم حساب کو ایک کتاب کی شکل میں اس کے سامنے آحاضر ہوگا جیسے فرمایا ''وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا (بنی اسرائیل:۱۴)اور ہم نے ہر انسان کی گردن میں ایک پرندہ یا عمل باندھ رکھا ہے جس کو ہم قیامت کے دن ایک کھلی کتاب کی شکل میں اس کے سامنے رکھ دیں گے۔

(الفضل انٹرنیشنل14.6.96)

الکوحل کی کوئی حد بھی محفوظ نہیں کہلا سکتی

سڈنی میں حال ہی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی ہے جس کے سپرد اس امر کا فیصلہ کرنا تھا کہ الکوحل کی کتنی حد محفوظ قرار دی جا سکتی ہے۔ کانفرنس میں ماہرین نے اپنی آراء پیش کیں۔ پروفیسر روڈنی جیکسن نے کہا ''یہ موجودہ تصور کہ شراب پینے کا صحت کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے یہ تجرباتی شہادت کی ایسی تشریح پر مبنی ہے جو بہت سادہ اور سطحی ہے اور ضرورت ہے کہ اس کو زائل کیا جائے۔''

ایک ماہر نفسیات (MR. Vaughan Raees) نے کہا ''اپنی حقیقت یعنی فنی لحاظ سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ الکوحل زہر ہے اور اس کی زیادہ مقدار آپ کو ہلاک کر سکتی ہے۔''

بعض ماہرین نے اس کے فائدے بھی گنوائے۔ آخر پر جو فیصلہ ہوا وہ یہ تھا:

"Our Strategy has to be about harm minimisation if we told people like the under 40s Not to drink, they would just laugh.We say there is absolutely no amount of Alcohol that,s absolutely "safe". For some people, "safe"levels may not be drinking at all."

یعنی ضروری ہے کہ ہماری حکمت عملی ایسی ہو جس سے کم از کم نقصان کا احتمال ہو۔ اگر ہم چالیس سال سے کم عمر کے افراد کو کہیں کہ وہ نہ پئیں وہ اس پر صرف ہنسیں گے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں

کہ پورے طور پر الکوحل کی کوئی مقدار ایسی نہیں ہے جسے مکمل طور پر ''محفوظ'' قرار دیا جا سکے۔ بعض لوگوں کے لئے محفوظ حد یہ ہے کہ وہ بالکل نہ پئیں۔

قرآن کریم نے بھی شراب کے فائدہ اور نقصان دونوں کا ذکر کر کے نقصان کے پلڑے کے بھاری ہونے کا ذکر کر کے اس سے اجتناب کا حکم دیا ہے ہر تحقیق جو رو رعایت کے بغیر کی جائے گی اس نتیجہ پر پہنچے گی۔

(الفضل انٹرنیشنل 14.6.96)

شادی اب بھی مستحکم معاشرہ قائم کرنے کے لئے کنجی کی حیثیت رکھتی ہے

بوسٹن یونیورسٹی کی پروفیسر Brigitte Berger جو مشہور ماہر عمرانیات (Sociologist) ہیں نے سڈنی میں اپنی تقریر میں شادی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج بالعموم میاں بیوی اور بچوں کے روائتی خاندان کو نفرت اور مذمت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن یہی وہ طاقت تھی جس کے نتیجہ میں مغرب کا جمہوری اور خوش حال معاشرہ وجود میں آیا تھا اور دونوں کی قسمت باہم نہ کھل سکنے کے انداز میں بندھی ہوئی ہے۔ مستقبل کے جو تیکنیکی مسائل ہیں ان کو حل کرنے کے لئے نفسیاتی طور پر مطمئن فعال متحرک اچھے تعلیم یافتہ اور اخلاقی لحاظ سے ذمہ دار افراد کی ضرورت ہے اور ایسے بچے شادی شدہ مطمئن گھرانوں ہی کی پیداوار ہو سکتے ہیں۔

تیس سال قبل خاندان کی مرکزیت کے خلاف جنگ شروع کی گئی تھی اس کے نتیجہ میں مغربی حکومتیں مجبور ہو گئیں کہ غیر شادی شدہ گھرانوں کو بھی برابری کا درجہ دے دیا جائے۔ اس سے خاندان کی ایسی شکل ابھری جس نے غیر قانونیت، جرائم، ڈرگ کا استعمال، عنفوان شباب کے حمل، غیر شادی شدہ ماؤں اور غیر ذمہ دار مفت خوروں کے سیلاب کو بے قابو کر دیا ہے۔ مغربی حکومتوں نے ایسے افراد کو بجائے سوسائٹی میں مدغم کرنے کے ایسی پالیسیاں وضع کیں جس سے یہ لوگ سوسائٹی پر بوجھ بنتے چلے گئے اور خطرہ ہے کہ آج کی سوسائٹی کا یہ زیریں طبقہ (Under Class) مغربی معاشرہ کا ایک مستقل حصہ نہ بن جائے۔ ان خطرات کو اب مغرب میں محسوس کیا جا رہا ہے اور امریکہ اور برطانیہ میں شادی اور روائتی

خاندان کی افادیت پھر سے تسلیم کی جانے لگی ہے لیکن اس کے آثار مجھے آسٹریلیا میں ابھی نظر نہیں آتے ۔آسٹریلیا والوں کو بھی سوچنا چاہئے ۔ غیر شادی شدہ گھرانوں کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ افراد کے لئے اچھی ہوں تو ہوں لیکن قوم کے لئے اچھی نہیں ہیں روایتی مرکزی خاندان آج بھی بچے کے لئے سکول میں کامیابی کی بہترین ضمانت ہے ۔شادی کا عہد اور ذمہ داری ہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے متوسط خاندانوں کے بچوں میں عزم استقلال ، ذمہ واریت ، امانت ودیانت ، فعالیت اور خود اعتمادی کے اوصاف پیدا کئے جاسکتے ہیں جو کسی بھی قوم کی ترقی کے لئے ضروری ہیں۔

باتیں تو پروفیسر صاحبہ نے بہت اچھی کی ہیں مغربی معاشرہ میں ان کو بار بار دھرانے کی ضرورت ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 5.1.96)

آسٹریلیا میں دو گز زمین کے حصول میں دشواری

سڈنی کے قبرستانوں کے منتظمین کی ایسوسی ایشن نے حکومت کو متنبہ کیا ہے کہ اگر حکومت نے فوری کاروائی نہ کی تو آئندہ دس سال بعد مرنے والوں کو قبر کی جگہ مہیا نہیں ہو سکے گی ۔ اکثر قبرستان آئندہ پانچ سال میں بھر جائیں گے اور قبروں کی قیمتیں (زمین کی بجائے) آسمان سے باتیں کرنے لگیں گی ۔ اب بھی ایک قبر کی قیمت مختلف قبرستانوں میں ۱۳۰۰ اور ۳۵۰۰ ڈالر کے درمیان ہے قبریں بڑی مہنگی پڑ رہی ہیں ہر قبر کی حفاظت اور نگرانی پر ہر سال ۴۰ تا ۱۱۰ ڈالر خرچ ہوتے ہیں جن میں افراط زر کی وجہ سے ہر سال اضافہ ہو رہا ہے ۔ ایسوسی ایشن نے تجویز پیش کی کہ قبر کی جگہ کو فروخت کرنے کی بجائے پچیس یا پچاس سال کے لئے لیز (Lease) پر دیا جائے جیسا کہ بشمول اٹلی بعض ملکوں میں رواج ہے ۔ مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر قبروں کو ٹھیکہ پر دینے کی تجویز نیو ساؤتھ ویلز کی پارلیمینٹ میں زیر غور آئی جس پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی ۔ ایک ممبر پارلیمینٹ نے کہا کہ Rest In Peace (امن چین سے آرام کرو) جو قبروں پر لکھے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم مرنے کے بعد ہر ایک کو ہمیشہ کے لئے آرام کرنے کا حق حاصل ہے ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد سونے والے کو اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے اور اس کی جگہ کسی دوسرے کو الاٹ کر دی جائے ان کی تشویش بزبان شاعریوں بیان کی جاسکتی ہے ۔

؎ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یہ بھی کہا گیا کہ زمین کی ضرورت مردوں کی نسبت زندوں کو زیادہ ہے اس لئے متبادل طریقے سوچے جائیں بہرحال حکومت نے فیصلہ کیا کہ قبروں کی زمین کو معین عرصہ کے لئے کرایہ پر دینے کا سلسلہ فی الحال شروع نہیں کیا جائے گا۔ یہ خبر جہاں اہل قبور کے لئے اطمینان کا باعث ہوگی وہاں زندوں کے لئے بھی باعث تسلی ہوگی جو روز بروز اپنے اپنے حصہ کی دوگز زمین کی طرف رواں دواں ہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 22.13.95)

سسلی کے مجسمہ مریم کے آنسوؤں کا راز

ہمیشہ سے انسانوں کا ایک طبقہ توہم پرستی کا شکار رہا ہے۔ سیاسی وسماجی افراتفری کے دور میں توہم پرستی خصوصاً زور پکڑ جاتی ہے۔ سابق یوگوسلاویہ اور روسی ریاستوں کے جنگ وجدل کے دور میں یورپ خصوصاً اس کا تجربہ کررہا ہے۔ لوگوں کو میڈونا کے مجسموں کی آنکھوں میں آنسو نظر آتے ہیں چرچ اس طرح کی روایات کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتا رہا ہے سوائے ایک رونے والی میڈونا کے جس کو چرچ نے ۱۹۵۳ء میں سرکاری طور پر تسلیم کرلیا کہ اس کی آنکھوں سے واقعی آنسو ٹپکتے ہیں۔ یہ میڈونا حضرت مریم کا پلاسٹر کا مجسمہ ہے جو سسلی کے مشرقی ساحل پر واقع شہر Siracusa میں بنا ہوا ہے۔

اب ایک کیمسٹ نے اس مجسمہ کے آنسوؤں کا راز بھی فاش کردیا ہے اس کا ذکر برطانیہ کے رسالہ ''کیمسٹری'' میں کیا گیا ہے۔ کیمسٹ نے ہو بہو اس رونے والے مجسمہ کی طرح کا ایک مجسمہ بنایا جو بغیر کسی میکانکی کل یا الیکٹرانک آلات کے آنکھوں سے آنسو بہاتا ہے وہ کافی عرصہ لوگوں کو بے وقوف بناتا رہا۔ اب اس نے اس راز سے پردہ اٹھادیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ مجسمہ پلاسٹر کا بنا ہوا ہے جس کی اندرونی سطح مسام دار (Porous) ہے اور باہر کی چکنی روغن دار (Glazed) ہے۔ اندر کی سطح پانی جذب کرلیتی ہے اور باہر کی نمی کو خارج ہونے سے روکتی ہے۔ اس کے سر میں ایک خفیہ مقام ہے جہاں سے اندر سے خالی مجسمہ میں پانی ڈالا جاتا ہے اور اس کی آنکھوں پر سے روغن ایسے طریق سے کھرچا ہوا ہے کہ محسوس نہیں ہوتا۔ اندر کی سطح کا جذب شدہ پانی باہر شبنم کے قطرات کی طرح آنکھوں سے ٹپکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح (Dr. Garlaschelli) نے آنسو ٹپکانے والی مریم کے مجسمہ کا طلسم توڑ دیا اور اس کے دنیا کے

دکھوں پر ٹپکنے والے آنسو جھوٹے نکلے۔ جبکہ ۴۲ سال سے چرچ ان آنسوؤں کو حقیقی تسلیم کرتا رہا ہے۔
بھلا پتھر کی مورتیاں بھی کسی کے دکھوں پر آنسو ٹپکایا کرتی ہیں؟

(الفضل انٹرنیشنل 5.1.96)

.

آسٹریلیا کے باسیوں کی خدمت میں شہد کی مکھی کا حصہ

حال ہی میں نیوساؤتھ ویلز (آسٹریلیا) کی حکومت نے آبادیوں کے قریب بعض جنگلوں اور پارکوں میں شہد کی مکھیاں پالنے کے ممانعت کی ہے۔سائنسدانوں نے اس حکم پر نکتہ چینی کرتے ہوئے حکومت کو متنبہ کیا ہے کہ ایسا کرنے سے اس علاقہ کی زرعی فصلوں کو نقصان پہنچے گا۔انہوں نے کہا کہ آسٹریلیا میں ہر سال ۷۰۰ ملین ڈالر کی فصلیں شہد کی مکھی کی مرہون منت ہیں۔یہ مکھیاں ان فصلوں کو گابھن یا بارور (Pollinate) کرتی ہیں جس کے بغیر کسی فصل کو پھل نہیں لگ سکتا۔اگر ان مکھیوں کو ختم کر دیا جائے یا دور بھیج دیا جائے تو دس سال کے عرصہ میں یہ فصلیں پھلوں سے محروم ہونا شروع ہو جائیں گی۔علاوہ ازیں آسٹریلیا ہر سال ان مکھیوں کی بدولت ۲۴ ملین ڈالر کا شہد پیدا کرتا ہے اور چھ ملین ڈالر کی زندہ مکھیاں دوسرے ملکوں کو برآمد کی جاتی ہیں۔یادرہے کہ شہد کی مکھی دوسو سال پہلے آسٹریلیا میں لائی گئی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فصلیں اپنی پیدائش سے لے کر پکنے تک بے شمار خاموش اور مفت مزدوروں کی مرہون منت ہیں۔جہاں فصلیں آسمان کے پانی گابھن کرنے والی ہواؤں،فضا میں نائیٹروجن بکھیرنے والی کڑک سورج کی روشنی وغیرہ کی محتاج ہیں وہاں ایک ایک پودے کے لئے غذا تیار کرنے والے لاکھوں بکٹیریا جو مٹی میں سرگرم عمل ہوتے ہیں اور مکھیوں اور پرندوں وغیرہ کی بھی محتاج ہیں۔

اگر یہ سارے عناصر، جاندار کارکن اور عوامل کارفرما نہ ہوتے تو فصلیں کیسے اگتیں۔اسی

لئے خدا نے کھیتوں کے بارہ میں فرمایا ’’ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ‘‘ کہ کیا تم کھیتوں کو اگاتے ہو کہ ہم اگاتے ہیں۔ ہاں سچ یہی ہے کہ وہی اگاتا ہے ہم کہاں اگاتے ہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 22.12.95)

شہد کی مکھی کے دل پر اُترنے والی وحی کا ایک عملی نظارہ

سڈنی یونیورسٹی کے شعبہ بیالوجی نے شہد کی مکھیوں کے چھتے کا بغور مشاہدہ کر کے معلوم کیا ہے کہ ان کی ملکہ کا اپنی کالونی پر بڑا سخت حکم چلتا ہے۔ مکھیاں اپنی ملکہ کی سختی سے اطاعت کرتی ہیں اور ہمیشہ ان کی خدمت پر مستعد رہتی ہیں۔ کچھ مکھیاں نظم و نسق قائم رکھنے کے لئے پولیس کا کردار ادا کرتی ہیں اور کچھ بیرونی حملہ کے خلاف بارڈر سیکوریٹی کا کام سرانجام دیتی ہیں۔ شہد کی عام کالونی میں انڈے دینے کا حق صرف ملکہ کو ہوتا ہے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی مکھی بغاوت کرتے ہوئے انڈہ دینے کی جسارت کرے تو پولیس کی مکھیاں اس کو فوراً ہڑپ کر جاتی ہیں اور انڈے کا نام ونشان نہیں چھوڑتیں۔ لیکن جونہی کوئی ملکہ وفات پا جاتی ہے تو ساری کالونی ایک طوائف الملوکی کا شکار ہو جاتی ہے اور ہر مکھی جو اس کے دل میں آئے کرتی ہے۔ نظم و نسق قائم رکھنے والی پولیس مکھیاں بھی اپنا کام چھوڑ کر بیٹھ جاتی ہیں اور بارڈر کی حفاظت کرنے والی بھی اپنے کام سے غافل ہو جاتی ہیں۔ متعدد بار کے تجربات میں یہ مشاہدہ کیا گیا کہ جونہی ملکہ کو پکڑ کر باہر نکال لیا گیا تو مکھیوں نے سمجھا کہ ان کی ملکہ فوت ہو گئی ہے۔ اور اس کے بعد ایسی افراتفری اور بدنظمی دیکھنے میں آئی جس نے ریسرچرز (Researchers) کو حیران کر دیا۔ سبھی مکھیاں اپنے کام چھوڑ کر بیٹھ گئیں اور جونہی اس کا علم دوسری مکھیوں کی کالونیوں کو ہوا تو انہوں نے بے ملکہ کی کالونی پر دھاوا بول دیا کیونکہ ان کے بالمقابل دفاع کرنے والے کوئی نہ تھے۔ دوسرے چھتوں کی مکھیاں جو اپنی ملکہ کی موجودگی کی وجہ سے وہاں انڈے نہیں دے سکتی تھیں وہ ایسے موقع کی تلاش میں رہتی ہیں اور ایسے چھتہ میں آ کر انڈے دے

دیتی ہیں کیونکہ وہاں انہیں کوئی روکنے والا نہیں ہوتا۔ ان کو نَر مکھیوں کی خواہش تھی جو انہوں نے پوری کر لی۔

مکھیوں کے جینز کے تجزیہ (Genetic Analysis) سے پتہ چلا ہے کہ ملکہ کے چھتہ میں تیسرا حصہ ایسی مکھیوں کا تھا جن کا تعلق دوسرے چھتوں سے تھا۔ لیکن دوسری کالونیوں سے آئی ہوئی مکھیوں کے نَر بچے جب جوان ہوتے ہیں تو پتہ نہیں کیسے ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم دراصل دوسری کالونیوں سے تعلق رکھنے والے ہیں اس لئے وہ یہ چھتّہ جہاں وہ پیدا ہوئی تھیں چھوڑ کر اپنے اصلی چھتوں میں چلے جاتے ہیں یا پھر کوئی اور ملکہ تلاش کر کے اپنے لئے نئی کالونی بسا لیتے ہیں۔

(ماخوذ از: سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۶/اکتوبر ۲۰۰۵ء)

یہ تحقیق جہاں بڑی دلچسپ ہے وہاں خیال افروز بھی ہے۔ شہد کی مکھیوں کا نظم وضبط دیکھ کر انسان حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا مجال کہ کوئی مکھی اپنی ملکہ کی تابعداری نہ کرے۔ مادہ مکھی خود انڈے دینا چاہتی ہے لیکن باوجود خواہش کے نہیں دیتی کہ یہ مقام صرف ملکہ کو حاصل ہے۔ اس میں بے جا تصرف نہ ہو۔ مکھیاں اپنے چھتے جیومیٹری کے اصولوں پر بناتی ہیں۔ مثلاً چھتے کا ہر خانہ چھ پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر خانہ کی اطراف چھ سے کم یا زیادہ ہوتے تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ برابر صحیح نہ بیٹھتے اور شہد ٹپکتا رہتا۔ چھتے کا ڈیزائن بالکل ویسا ہی ہے جیسا شہد کو بحفاظت جمع کرنے کے لئے ہونا چاہئے تھا۔ مکھیوں کا باہمی تعاون بھی خوب ہے۔ وہ اپنا علم دوسروں کو منتقل کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتیں۔ مثلاً ایک مکھی کو شہد کی تلاش کے دوران جہاں کہیں مناسب پودے اور پھول وغیرہ ملتے ہیں وہ واپس آ کر اپنی دوسری ساتھیوں کو اشاروں کی زبان میں اپنے پیروں کو اوپر نیچے دائیں بائیں کر کے بتا دیتی ہیں کہ کس رُخ پر اور کتنے فاصلہ پر وہ جا کر شہد چُن سکتی ہیں۔ دوسری مکھیاں بھی خوب سمجھتی ہیں اور اپنے چھتہ کا راستہ نہیں بھولتیں۔ دشمن کے بارہ میں بھی اسی طرح دوسروں کو بتاتی ہیں اور اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ ایک چمچہ شہد کے لئے ایک مکھی کو اندازاً دو ہزار میل کا سفر جنگل میں کرنا پڑتا ہے۔ اسی کا ذکر فرماتے ہوئے ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ نے کہا تھا کہ حق تو یہ ہے کہ شہد کے ہر چمچہ کو کھاتے ہوئے خدا تعالیٰ کا دو ہزار بار شکر ادا کرنا چاہئے۔

ائیر پورٹ کے قریب رہنے سے ملیریا بھی ہو سکتا ہے

سنتے تھے کہ ائیر پورٹ کے قریب رہنے سے صحت کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اب ڈاکٹروں کو اس کی ایک اور وجہ معلوم ہوئی ہے جس کا ذکر میڈیکل جرنل آف آسٹریلیا میں کیا گیا ہے۔

واقعہ یوں ہوا کہ سوئٹزرلینڈ کا ایک ۵۴ سالہ شخص جو جنیوا ایئر پورٹ کے قریب رہتا تھا ملیریا کا شکار ہو کر جاں بحق ہو گیا جب کہ اس سارے علاقہ میں ملیریا پھیلانے والے مچھر کا نام ونشان نہیں ملتا۔ بادی النظر تو یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایئر پورٹ کا قرب کسی کو ملیریا میں مبتلا کر دے یہ تو اسی طرح کی بات لگتی ہے جو امام دین گجراتی نے کہی تھی کہ

نہ چھیڑو نہ چھیڑو میری پنڈلیوں کو
کہ ان میں ہے درد جگر مام دینا

مگر جب پوری خبر پڑھی تو وجہ سمجھ میں آ گئی۔ کسی دور دراز ملک میں ایک مچھر نے کسی ملیریا میں مبتلا شخص کو کاٹ لیا اور اس طرح مچھر میں ملیریا پیدا کرنے والے جراثیم سرایت کر گئے۔ اس علاقہ سے کسی مسافر کے لباس یا سامان میں چھپ کر وہ مچھر جس کے ہاتھوں کسی دور دراز بسنے والے شخص کی موت لکھی تھی جنیوا پہنچ گیا۔ اور ابھی ائیر پورٹ کے قریب ہی کہیں شکار تلاش کرتا پھر رہا تھا کہ ایک شخص مل گیا جس کے جسم میں اس نے ملیریا کے جراثیم منتقل کر دیئے اور اس کو ملیریا بخار نے آ لیا لیکن چونکہ اس علاقہ میں ملیریا ہوتا ہی نہیں ڈاکٹر اس کے بخار کی نوعیت کو نہ سمجھ سکے۔ چونکہ ملیریا کی طرف ان کا ذہن منتقل نہ ہوا مریض کو صحیح علاج میسر نہ آ سکا اور وہ چل بسا۔ ملک الموت نے ایک مچھر کے ذریعہ کدھر سے کہاں وار کیا۔ اگرچہ بات اسی طرح کی ہے کہ

؎ مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

یعنی شہد کی مکھی کو باغ میں نہ جانے دینا ورنہ شہد بنے گا موم بنے گی اور ناحق کسی پروانے کا خون ہو جائے گا۔

بہر حال اس واقعہ کے بعد ڈاکٹروں نے ہدایت جاری کی ہے کہ خواہ کسی شخص نے ایسے علاقہ کا سفر نہ بھی کیا ہو جہاں ملیریا موجود ہو تو پھر بھی اگر مریض ائیر پورٹ کے قریب رہتا ہو یا اس کا وہاں آنا جانا رہتا ہو اگر بخار کی وجہ سمجھ نہ آئے تو ملیریا کا امکان بھی پیش نظر رکھ لیا کریں۔

(الفضل انٹرنیشنل 4.4.03)

کمپیوٹر کا نشہ موت کا باعث بھی بن سکتا ہے

کمپیوٹر کے جو نشہ باز مسلسل گھنٹوں اس کے آگے بیٹھے رہتے ہیں ان کو ڈاکٹروں نے ہوشیار کیا ہے کہ وہ D.V.T یعنی (Deep Vein Thermobosis) کی مہلک مرض کا شکار ہو سکتے ہیں۔ یہ وہی بیماری ہے جو ہوائی جہاز کی لمبی فلائٹ پر بغیر ہلے جلے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنے سے بھی ہو سکتی ہے۔ جس کو ''اکانومی کلاس سنڈرم (Economy Class Syndrome)اس لئے کہتے ہیں کہ اس کلاس میں ٹانگیں ہلانے جلانے کے لئے جگہ بہت کم ہوتی ہے۔

اس بیماری میں ٹانگوں کی شریان میں خون کا تھکا (Blood Clot) جم جاتا ہے جو جب خون کے ساتھ پھیپھڑوں میں پہنچتا ہے تو پہلے سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے پھر پھیپھڑوں کے اوپر جو شفاف جھلی (Pleurisy) ہوتی ہے وہ سوج جاتی ہے، پھر بے ہوشی واقع ہوتی ہے جو موت پر منتج ہوتی ہے۔ اس مہلک بیماری کا سب سے زیادہ خطرہ حاملہ عورتوں، موٹے افراد، بوڑھوں اور سگریٹ نوشوں کو ہوتا ہے۔

کمپیوٹر کے رسیا لوگوں میں سب سے پہلے جو کیس علم میں آیا وہ نیوزی لینڈ کے ایک ۳۲ سالہ نوجوان کا تھا جو اکثر بارہ بارہ گھنٹے بلکہ کبھی تو ۱۸ گھنٹے روزانہ کمپیوٹر کے آگے جم کر بیٹھا رہتا تھا۔ پہلے اس کی پنڈلی سوجی جس میں دس روز مسلسل درد ہوتی رہی۔ پھر سانس لینے میں مشکل پیش آنے لگی۔ وہ بے ہوش ہو گیا اور آخر وفات پا گیا۔

ذرائع ابلاغ میں بہت سے ایسے جوأ بازوں کی خبریں بھی آئی ہیں جو تیس تیس گھنٹے جوئے کی مشینوں کے آگے بیٹھے رہتے تھے۔ اور آخر اسی بیماری کا شکار ہو کر چل بسے۔ ان کے علاوہ بھی بہت

سے واقعات تحقیق کرنے والی ٹیم کے علم میں آئے ہیں۔ چنانچہ اس بیماری کے ماہر ڈاکٹر بیکر نے لوگوں کو مشورہ دیا ہے کہ احتیاط سے کام لیں کیونکہ دیر دیر تک کمپیوٹر کے آگے بیٹھے رہنا آپ کی صحت کے لئے مضر ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 4.4.03)

آسٹریلوی پارلیمنٹ کے نقیب کا عصا

ہر چیز کی اہمیت وقت اور مقام کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ چھڑی بہرحال چھڑی ہے خواہ بادشاہ کی ہو یا فقیر کی۔ لیکن ایک چھڑی (Rod) ایسی ہے جس کے بغیر پارلیمنٹ کے کام رک سکتے ہیں۔ یہ چھڑی آسٹریلیا کے ایوان بالا (سینیٹ) کے نقیب (Usher) مسٹر راب ایلیسن کی ہے جس کے ٹوٹنے سے بڑی پریشانی پیدا ہوئی۔

ہوا یوں کہ آسٹریلیا کے گزشتہ انتخابات کے بعد نئ پارلیمنٹ کا افتتاح سر ولیم ڈین، گورنر جنرل نے کرنا تھا (جو کہ ملکہ برطانیہ کے نمائندہ ہیں) جس میں سیاہ چھڑی کے نقیب مسٹر راب (Usher of the Black Rod) کا بھی ایک کردار تھا اور ان کی چھڑی کا بھی۔

پارلیمنٹ کے افتتاح سے ایک روز قبل مسٹر راب اپنی چھڑی پالش کی غرض سے اپنے گھر لے آئے تھے۔ جب غسل خانہ میں وہ چھڑی کی جھاڑ پونچھ کر رہے تھے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور جب اس سے فارغ ہو کر واپس آئے تو چھڑی گر کر ٹوٹ چکی تھی۔ اور زمین پر یوں پڑی تھی جیسے عین فٹ بال کے میچ کے دوران کسی کھلاڑی کی ٹانگ ٹوٹ جائے۔ یہ چھڑی ۱۴۵ء میٹر لمبی سیاہ آبنوس کی لکڑی سے بنی ہوتی ہے جس کے تین حصے ہیں جن کے درمیان جوڑ ہوتے ہیں۔ بس ایک جوڑ ٹوٹ گیا تھا۔ چھڑی کے دستہ پر حکومت آسٹریلیا اور تاج برطانیہ کا نشان کندہ ہوتا ہے چنانچہ اسی وقت مکینک بلائے گئے اور چھڑی کی مرمت کروائی گئی۔

برطانوی روایات کے مطابق جن پر آسٹریلیا میں بھی عمل ہوتا ہے جس وقت ایوان زیریں (ایوان نمائندگان یا ہاؤس آف کامنز) کا اجلاس ہو رہا ہو برطانوی تاجدار بادشاہ یا ملکہ یا ان کا نمائندہ

(گورنر جنرل) ایوان میں داخل نہیں ہوسکتا۔ جب گورنر جنرل نے ایوان سے خطاب کرنا ہوتو وہ سینٹ کے نقیب کوحکم دیتے ہیں کہ ارکان اسمبلی کوکہیں کہ سینٹ کے ہال میں آجائیں۔جس پرنقیب (جس نے کالے رنگ کا لمبی دم والا کوٹ، تنگ پہنچوں والی پر برجس، عدالتی بوٹ، سیاہ دستانے پہنے ہوتے ہیں تلوار جسم پر آویزاں کی ہوتی ہے اور ہاتھ میں مذکورہ بالا عصا یا چھڑی پکڑی ہوتی ہے) ایوان زیریں میں آکر تین بار چھڑی سے دروازہ پر زور سے ٹھوکر لگاتے ہیں۔جس پر ایوان زیریں کا نقیب (Serjeant at Arms) دروازہ سے باہر جھانک کر دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے کہ ''کون ہو؟'' جب اس کو بتایا جاتا ہےتو پھر وہ تسلی کرتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی سپاہی تونہیں اور جب دیکھتا ہے کہ کسی رکن پارلیمنٹ کی گرفتاری کا خطرہ نہیں تو پھر وہ ایوان کو بتاتا ہے اور وہ اس کے پیچھے پیچھے ایوان بالا میں داخل ہوتے ہیں جہاں گورنر جنرل ان سے خطاب کرتا ہے۔اس ساری کاروائی میں نقیب کے عصا کا ایک مخصوص کردار ہوتا ہے۔خطرہ تھا کہ مرمت شدہ چھڑی کہیں زور سے ٹھوکر لگاتے ہوئے اپنے جوڑ سے دوبارہ نہ ٹوٹ جائے لیکن خیر گزری اور کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

اس روایت کی ابتداء ۱۶۴۲ء میں ہوئی جب شہنشاہ چارلس اول نے برطانوی ہاؤس آف کامنز پر مسلح چھاپہ مارا تھا اور کئی ممبران پارلیمنٹ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی۔تب سے یہ برطانیہ (اور دیگر سترہ ممالک میں جو آج بھی ملکہ برطانیہ کو اپنا سربراہ تسلیم کرتے ہیں) یہ روایت چلی آتی ہے کہ ملکہ یا ان کا کوئی نمائندہ اجلاس کے دوران ایوان زیریں میں داخل نہیں ہوتے۔ برطانوی قوم اپنی روایات کی کتنی پاسبان ہے یہ اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 23.8.96)

روزانہ اسپرین کھانے کے حیران کن فوائد

ایک نادر محقق پروفیسر Peter Elwood کہتے ہیں کہ پچاس سال کی عمر سے زائد ہر شخص کو روزانہ اسپرین کی چھوٹی ٹکیہ (75 یا 100 ملی گرام) استعمال کرنی چاہیئے۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ایسا کرنے سے ہارٹ اٹیک اور سٹروک (فالج) کا خطرہ تیسرا حصہ کم ہو جاتا ہے۔ نیز لگتا ہے کہ یہ کینسر اور ایلزائمر (Alzheimer) کی بیماریوں کے خلاف بھی کچھ بچاؤ کرتی ہے۔

اسپرین کو ایک حیران کن دوا (Wonder Drug) سمجھا جاتا ہے۔ یہ بید کے درخت (Willow) کی چھال کے ایک اہم جزو (Salicin) سے تیار کی جاتی ہے اور تقریباً ۵۰ دواؤں کا جزو بن چکی ہے۔

ہمارا جسم ہارمون کی طرح کا ایک مادہ (Prostaglandin) ایسا بناتا ہے جو دوسرے پیغام رساں مادوں کے ساتھ مل کر جسم کے ہر حصہ میں پہنچتا ہے اور درد، بخار، سوجن وغیرہ کی علامات پیدا کرتا ہے۔ اسپرین اس مادہ کی پیدائش کو کم کر کے ان علامتوں میں کمی لاتی ہے۔ اسپرین کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ خون کو پتلا رکھتی ہے۔ اور اس کو منجمد ہونے سے روکتی ہے۔ حکماء کہتے ہیں کہ یہی کام پیاز بھی کرتا ہے اسی لئے گرمیوں میں صحراؤں کے مسافر ہمیشہ پیاز ساتھ رکھا کرتے ہیں۔

اگر خون کا کوئی ذرہ منجمد ہو جائے یعنی Clot بن جائے تو اگر وہ دل کی شریانوں میں چلا جائے تو ہارٹ اٹیک کا خطرہ ہوتا ہے۔ دماغ کی شریانوں میں رکاوٹ ڈال دے تو سٹروک (فالج) پیدا کر دے گا۔ لیکن اگر اسپرین کی وجہ سے خون پتلا ہو کر جسم کی باریک شریانوں میں بسہولت پہنچتا رہے تو خیال ہے کہ اس سے فضلہ کی تھیلی (Bowl) اور چھاتی کے کینسر کا خطرہ میں بھی کمی آئے گی۔

نیز تدریجاً یادداشت ختم ہونے کی بیماری (Alzheimer) کے بچاؤ میں بھی اس سے مدد ملے گی۔

بعض ماہرین کا خیال ہے (اگرچہ اس بات سے اختلاف بھی کیا جاتا ہے) کہ اگر ہوائی جہاز کے سفر سے پہلے اسپرین کھائی جائے تو اس سے ٹانگوں میں خون جمنے کی مرض (Deep Vein Thrombosi) جس میں خون جمنے سے جو پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہے، اسپرین کا باقاعدہ استعمال اس کے لئے بھی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

اسپرین کے استعمال میں احتیاط کی بھی ضرورت ہے۔ اگر آپ خون پتلا کرنے کی دوسری دوائیں بھی استعمال کر رہے ہیں تو اسپرین نہ کھائیں کیونکہ خون کا زیادہ پتلا ہونا بھی سٹروک (فالج) کا موجب بن سکتا ہے۔ بہرحال اسپرین کا استعمال شروع کرنے سے پہلے اپنے ڈاکٹر سے ضرور مشورہ کرنا چاہئے۔

(ماخوذ از سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۱ اپریل ۲۰۰۵ء)

(الفضل انٹرنیشنل 3.6.05)

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

مسلمان اپنے عمل سے خود ہی اسلام کو بدنام کررہے ہیں اورالزام دوسروں کو دیتے ہیں اس کی تازہ مثال وہ خبر ہے جو آسٹریلیا کے ایک کثیر الاشاعت روزنامہ میں شائع ہوئی ہے:

''(ترجمہ) پاکستان کے روزنامہ جنگ کے مطابق ہر دوسری پاکستانی عورت کسی نہ کسی قسم کے ظلم وتشدد کا نشانہ بنتی ہے۔ ہزاروں عورتیں ہر سال عزت کے نام پر قتل کی جاتی ہیں۔گذشتہ پانچ سالوں کے دوران صرف پنجاب میں ۹۶۷۹ عورتیں قتل ہوئیں ان میں سے ۱۶۳۸ عورتیں تو ان کے گھر والوں نے ہی انتقام اور گھریلو جھگڑوں کی بناء پر قتل کردیں ۴۶۶۲ عورتیں اس لئے ماری گئیں کہ وہ بے چاری جہیز تھوڑا لائی تھیں یا اس لئے کہ انہوں نے ورثہ کی جائیداد میں سے اپنا حصہ طلب کیا تھا۔مقتولین میں سے ۳۳۷۹ عورتوں کو یا تو آگ سے جلا کر مارا گیا یا تیزاب پھینک کر۔

ایک دوسرے پاکستانی روزنامہ ''خبریں'' میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ایک جاگیردارانہ رسم جاری ہے جس کو 'کاروکاری' کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ جن عورتوں کے بارہ میں خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے خاندان کی بے عزتی کی ہے انہیں باقاعدہ ایک رسمی تقریب کے طور پر قتل کیا جاتا ہے اور مارنے کے بعد ان کی لاشوں کو غیر رشتہ دار مردوں کے سپرد کردیا جاتا ہے جو انہیں کہیں دور لے جا کر بغیر کوئی مذہبی رسم ادا کئے زمین میں دبا آتے ہیں۔

مذکورہ بالا صورت حال پر ہندوستان کے اخبار پاؤنیر کے ایڈیٹر ساجد عبید نے سخت غصہ کا

اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ ہے وہ پاکستان جس کے بارہ میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا جو دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں عورتوں کا زیادہ خیال رکھتا ہے اور قابل توجہ قرار دیتا ہے۔ یہ بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ باوجود مسلمان ہونے کے پاکستان کے حکام اور عوام اسلام کے بنیادی اصول صداقیت اور انصاف کے معاملہ میں ناکام ہوگئے ہیں۔''

(سڈنی مارننگ ہیرلڈ مورخہ ۲۹ اپریل ۲۰۰۴ء)

(الفضل انٹرنیشنل 25.6.05)

زیتون کی خوبیاں اور اس سے متعلقہ روایات

اٹلی کے انتخابات میں ''زیتون کے درخت کا اتحاد (Olive Tree Coalition) جیت گیا ہے۔ایک اخبار کے کالم نویس لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ اتحاد کا خوبصورت نام ہے۔زیتون قوم کی صحت کے لئے اچھا ہے۔اس میں نہ صرف کولیسٹرول نہیں ہوتا بلکہ یہ کینسر اور امراض قلب کے خلاف جسم میں قوت مدافعت پیدا کرتا ہے۔زیتون عمدہ اخلاق کی نمائندگی کرتا ہے۔اس کا صاف پاک تیل جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو کا ذائقہ بہت عمدہ ہوتا ہے۔زیتون ہمت، بہادری اور صبر بھی ظاہر کرتا ہے کیونکہ یہ سب سے اچھا ایسی زمین میں اگتا ہے جہاں کی زمین اور آب وہوا ایسی ہو کہ اسے نشوونما کے لئے جدوجہد درکار ہو۔زیتون امن کا بھی نشان ہے اور اسے روایتی طور پر صلح اور امن کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔زیتون فتح کا بھی نشان ہے۔چنانچہ شروع میں اولمپک کھیلوں میں جیتنے والوں کو زیتون کے پتوں سے بنا ہوا تاج پیش کیا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں زیتون کی قسم کھائی ہے یعنی اس کو شہادت کے طور پر پیش کیا ہے جیسے فرمایا ''والزیتون'' (التین:۲) اس کی تشریح میں حضرت مصلح موعودؓ تفسیر صغیر میں فرماتے ہیں:

> ''زیتون کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ زیتون کی شاخ حضرت نوحؑ کے واقعہ کی یاد دلاتی ہے اور وہ بھی رحم اور امن کے واقعہ کو۔چنانچہ بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی جب جودی یعنی اراراط پر پہنچی تو حضرت نوحؑ نے مختلف پرندوں کو چھوڑا تا کہ وہ پتہ لے کر آئیں کہ کہیں زمین بھی نظر آتی ہے یا نہیں۔آخر میں انہوں نے کبوتری چھوڑی جب وہ واپس آئی تو زیتون کی ایک

تازہ پتی اس کے منہ میں تھی جس سے حضرت نوحؑ نے سمجھ لیا کہ اب خدا کی
طرف سے فضل نازل ہو گیا ہے اور زمین نظر آنے لگ گئی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے
قافلہ سمیت وہاں اتر گئے۔"

قرآن کریم میں اللہ کے نور کی جو مثال دی گئی ہے اس میں جس چراغ کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی زیتون کے بابرکت درخت سے روشن کیا گیا بتایا گیا ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ اس طرح نور محمدیؐ کو درخت زیتون سے روشن قرار دے کر اس سے مشابہت دی گئی ہے۔ گویا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ایسا ہے جو ظاہری و باطنی، جسمانی و روحانی صحت کے لئے بھی اچھا ہے۔ روحانی لذت کا سرچشمہ اور شمع ہدایت کی جان ہے۔ صبر و استقلال اور مجاہدہ کی خاص شان کا مالک ہے اور صلح اور امن اور رحم کا منبع ہے۔ آج دنیا امن امن پکارتی ہے حقیقی امن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں ہی مل سکتا ہے اور آخری فتح کا تاج بھی آپؐ ہی کے مبارک سر کے لئے مقدر کیا جا چکا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل)

جونکوں کا طب جدید میں استعمال

دو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ سے اطباء کئی بیماریوں کے علاج کے لئے جونکوں کا استعمال کرتے رہے۔ جونکیں جسم کے متاثرہ حصہ سے خون چوستی ہیں اور اس حد تک خون پیتی ہیں کہ ان کا اپنا حجم پانچ گنا بڑھ جاتا ہے اور سیر ہونے کے بعد گر جاتی ہیں۔ گزشتہ صدی میں وجع المفاصل (Gout) موٹاپا۔ (Obesity) اور کالی کھانسی (Whooping Cough) کے علاج کے طور پر جونکیں لگوانا عام تھا۔ جونکیں طب جدید میں بھی استعمال ہوتی ہیں اور سڈنی کے لور پول ہاسپٹل میں اور سینٹ ونسنٹ ہسپتال میں باقاعدہ پالی جاتی ہیں۔ لیکن فرق یہ پڑا ہے کہ یہ جونکیں خاص اس غرض کے لئے تیار کی جاتی ہیں۔ ان جونکوں میں ایسی دوائیں شامل ہیں جو درد کو روکتی ہیں۔ خون منجمد نہیں ہونے دیتیں تاکہ جونک اترنے کے بعد بھی خون جاری رہے اور خون کو جاری کرتی ہیں۔ پچھلے دنوں سڈنی میں ایک بچی کا ہاتھ دروازے میں آ گیا انگلی کا یک حصہ کٹ کر علیحدہ ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن سے انگلی کو ٹوٹے ہوئے حصہ کو دوبارہ جوڑ تو دیا لیکن اس کی رگیں اتنی باریک تھیں کہ ان کا جوڑنا اور ان میں دوران خون کا قائم رکھنا نہایت مشکل تھا چنانچہ یہ کام لوسی کے سپرد کیا گیا جو ایک ننھی جونک کا نام ہے اس کے خون چوسنے سے اور ان دواؤں کی مدد سے جو اس کے جسم میں شامل تھیں تمام چھوٹی بڑی رگوں میں خون جاری رہا اور بچی کی انگلی بالکل جڑ گئی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اگر جونک لوسی مدد نہ کرتی تو بچی صوفی کی انگلی کبھی صحیح نہ جڑ سکتی۔ البتہ ڈاکٹروں نے لوسی سے کام نکالنے کے بعد اس کا اپنا کام تمام کر دیا تاکہ کسی اور مریض پر استعمال کر کے اس بچی کی انفیکشن ادھر منتقل نہ ہو جائے۔ ایک جونک ایک ہی مریض پر استعمال کی جاتی ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل)

مینڈک برفانی علاقوں میں کیسے زندہ رہتے ہیں؟ ایک راز جوانسانی اعضاء کی پیوندکاری میں ممد ثابت ہوگا

اللہ کی مخلوق پر غور وفکر کرنے سے عجب طرح کے راز منکشف ہوتے ہیں۔شمالی امریکہ کے مینڈک (Wood Frogs) کی بعض اقسام ایسی ہیں کہ اگر انہیں منفی ۱۵ ڈگری سنٹی گریڈ پر منجمد کرلیا جائے تو ان کو دوبارہ زندہ کیا جاسکتا ہے۔ برف میں مینڈک کا دماغ۔دل اور جسم کا دوتہائی پانی منجمد ہوجاتا ہے لیکن پھر بھی زندہ رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کو شدید سرد موسم برداشت کرنے کی طاقت عطا کی ہے۔کینیڈا کی چارلٹن یونیورسٹی کے پروفیسر Prof.Ken Storcy نے کہا کہ اگر ہم ان مینڈکوں اور کچھووں کے راز معلوم کرلیں تو انہیں انسانی اعضاء کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔سڈنی میں پروفیسر سٹوری نے ایک کانفرس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم انسانی اعضاء کو ۴۸ گھنٹے تک بھی محفوظ رکھنے کے قابل ہوجائیں تو انسانی اعضاء کی پیوندکاری میں بہت ممد ثابت ہوگا۔ اس عرصہ میں ڈاکٹر اعضاء کے دینے اور لینے والے کے درمیان صحیح (Matdh) کرسکتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے کہا کہ انسانی جسم کو محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل کام ہے صرف بعض اعضاء ہی منجمد کئے جاسکتے ہیں جیسے دل کے والو، وریدیں اور شریانیں۔کھال، دانت مادہ تولید و بیضہ اور لبلبہ (Pancreases) وغیرہ استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

پروفیسر موصوف کی تحقیق نے ان مینڈکوں میں بعض منفرد قسم کے لحمیات (Nuclcating Proteins) معلوم کئے ہیں جو ان کے خون میں شامل ہوتے ہیں جن کے گرد

پانی منجمد ہوسکتا ہے چنانچہ خون کا پانی تو منجمد ہو جاتا ہے اور خلیات (Cells) منجمد ہونے سے بچے رہتے ہیں جو اگر منجمد ہو جائیں تو ضائع ہو جائیں۔ اگر اس طرح کے مخصوص پروٹین انسانی اعضاء میں بھی شامل کئے جاسکیں تو وہ کچھ زیادہ عرصہ کے لئے پیوند کاری کے لئے محفوظ رکھے جاسکتے ہیں۔ تحقیق کا دروازہ کھل گیا ہے۔ کنجی مل گئی ہے۔ مستقبل کا حال خدا جانے۔

(الفضل انٹرنیشنل 1.3.96)

مغربی معاشرہ میں بچوں کے دکھ

مادہ پرستی کی حدتک بڑھی ہوئی حب دنیا اور خود غرضی اور جنسی بے راہ روای اور منشیات کے استعمال نے گھروں کا جو امن برباد کر رکھا ہے اس کا سب سے دردناک شکار ننھے منے بچے ہیں۔ آسٹریلیا میں حکومت نے بچوں کی شکایات سننے اور ان کو مشورہ دینے کے لئے ٹیلیفون کی ایک مفت خدمت مہیا کی ہوئی ہے جس کا نمبر ۱۸۰۰۵۵۱۸۰۰ ہے۔

ایک خبر کے مطابق گزشتہ دو سالوں میں تنتالیس ہزار (۴۳۰۰۰) بچوں نے اس ادارہ کو فون کئے جس سے اس مسئلہ کی شدت کا پتہ لگتا ہے۔ یہ ساری شکایات چونکہ ریکارڈ پر رکھی گئی تھیں اب ان کا تجزیہ شائع ہوا ہے۔ بعض دفعہ پانچ سال کی عمر کے بچوں نے بھی فون پر بتایا کہ وہ سخت پریشان ہیں، والدین آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں، اندر ہی اندر کچھ کھچڑی پک رہی ہے ہمیں اندھیرے میں رکھا جا رہا ہے۔ زیادہ جھگڑے لین دین اور خرچ کے معاملات پر ہوتے ہیں۔ کاش ہم کچھ کر سکتے اور کما کر والدین کو دے سکتے تا ان کے جھگڑے ختم ہو جاتے۔ والدین کی علیحدگی کا خوف ہر وقت ان کے ننھے ذہنوں پر مستولی رہتا ہے۔ بعض چھوٹے چھوٹے بچے بچیاں لوگوں کے گھروں میں جا کر چاکلیٹ وغیرہ بیچ کر یا ان کے گھروں کے چھوٹے موٹے کام کر کے اپنے والدین کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ بیس فیصد شکایات گھریلو مسائل کے بارہ میں تھیں جو شکایات میں سے سب سے بڑی تعداد میں تھیں۔

فون کرنے والے بچوں کی عمریں زیادہ تر ۱۰اور ۱۴ سال کے درمیان تھیں۔ کئی ماں باپ کی متوقع علیحدگی پر دلبرداشتہ تھے۔ بعض علیحدگی کے بعد کے مسائل سے پریشان تھے۔ بعض اپنے سوتیلے

والد یا والدہ کی سرد مہری یا سختی کے شاکی تھے۔ دوسری شکایات میں دوستوں اور ہم جولیوں سے جھگڑے، گھر کے اپنے افراد یا باہر والوں کی بچوں سے جنسی زیادتیاں، بچپن کے حمل، مار پیٹ، خوف زدگی، اکیلا پن اور منشیات کا استعمال تھا۔ بعض بچے مجبور ہو کر گھروں کو چھوڑ جاتے ہیں اور اس سے بدتر حالات میں پھنس جاتے ہیں اور بعض گلیوں میں بسنے والے بچے (Street Kids) بن جاتے ہیں۔ یہی ستم رسیدہ بچے بڑے ہو کر مجرم بن کر پورے معاشرے کا امن برباد کرتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق گھروں سے بھاگنے والے بچے کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے گھروں کو کسی شوق میں نہیں چھورا بلکہ ان کے گھریلو حالات ہی نا قابل برداشت ہو گئے تھے۔

(الفضل انٹرنیشنل 1.3.96)

برطانیہ کے سرد وتاریک موسم کے ستم رسیدوں کو آسٹریلیا کی سیاحت کا مشورہ

خبر ہے کہ امسال برطانوی شہریوں کو انتہائی سرد تاریک اور اداس موسم سرما کا سامنا کرنا پڑا ہے. جنوری ۹۶ء کے اکتیس دنوں میں صرف ساڑھے انیس گھنٹے سورج کا منہ دیکھنا نصیب ہوا ورنہ گہرے بادلوں نے دنوں کو بھی تاریک بنائے رکھا۔جن کے اعصاب کم زور ہیں وہ ایک ایسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہوگئے ہیں جس میں خودکشی کے ذریعہ دنیا ہی چھوڑ دینے کا رجحان پایا جاتا ہے اندازہ ہے کہ برطانیہ کے چار فیصد باسی اس بیماری کا شکار بن گئے ہیں جس کا نام ڈاکٹروں نے SAD یعنی Seasonal Affective Disorder رکھا ہے۔ماہرین نفسیات نے ان کو مشورہ دیا ہے کہ اگر واقعی دنیا چھوڑنے کا ارادہ ہے تو آسٹریلیا چلے جاؤ۔ایک ہی بات ہے،خدا بھلی کرے گا ٹھیک ہو جاؤ گے۔

آسٹریلیا کئی لحاظ سے ایک منفرد ملک ہے، اسے دنیا کا پچھواڑا کہا جاتا ہے۔ یہ واحد ملک ہے جو سارے کا سارا جنوبی نصف کرہ میں واقع ہے اور ایک پورے براعظم پر مشتمل ہے۔سڈنی سے پرتھ کا سیدھا فاصلہ ۳۲۷۸ کلومیٹر ہے۔سورج ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں تقریباً تین گھنٹے لیتا ہے۔ یہاں کے موسم دنیا سے الٹ ہوتے ہیں اور دن رات بھی (بمقابلہ یورپ) ملک کے ساحلی علاقے آباد ہیں اور بہت خوبصورت جب کہ باقی اکثر حصہ صحرائی ہے۔ ہر وقت ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں ہر طرح کا موسم مل سکتا ہے، شدید سرد سے شدید گرم تک،سڈنی میں بعض دن تو ایسے آتے ہیں کہ ایک ہی دن میں سردی اور گرمی دونوں موسموں کا مزا آجاتا ہے۔ الغرض ہر طرح کے

موسم اور ہر طرح کی زمین آسٹریلیا بھی گویا حاجی لق لق کی آنکھوں کی طرح ہے جس نے کہا تھا

مزا برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو ے

سیاہی ہے سفیدی ہے شفق ہے ابر باراں ہے

(الفضل انٹرنیشنل 8.3.96)

آسٹریلیا کا ننھا منا ہیرو

آسٹریلیا کے قصبہ بونارگہ میں ایک نادر میموریل ہال تعمیر کیا گیا ہے جو ایک ننھے ہیرو کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ہے اور دنیا بھر میں اپنی طرز کی واحد یادگار ہے۔ یہ ہیرو بہت گمنام ہے۔آسٹریلوی بھی نہیں بلکہ انسان بھی نہیں بلکہ ایک ننھا پتنگا ہے۔ہوا یہ کہ ۱۹۲۵ء میں ناشپاتی کے باغوں میں خاردار کیکٹس (Cactus) کثرت سے پیدا ہو گیا جسے ناشپاتی کی طاعون کا نام دیا گیا۔ جب کوئی علاج کارگر نہ ہوا تو ۱۹۳۶ء میں ارجنٹائن سے یہ پتنگا درآمد کیا گیا جو کیکٹس کے پھولوں کو چٹ کر جاتا ہے اور اسے افزائش سے روک دیتا ہے۔ یہ اتنی بڑی خدمت تھی جو آج بھی جاری ہے کہ اس کی قدر افزائی میں مذکورہ بالا ہال تعمیر کیا گیا۔لیکن یہ اپنی نوعیت کا واحد کیڑا نہیں بلکہ اور بھی کئی ہیں جن کی افادیت اور خدمات کا واضح اقرار کیا جانے لگا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 8.3.96)

یورپ اور شمالی امریکہ کے شب و روز۔ رجحانات کے آئینہ میں

یواین کے ادارہ اکنامک کمیشن برائے یورپ نے ۵۶ ملکوں کے رجحانات پر مشتمل ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کے مطابق عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتیاں سب سے زیادہ امریکہ میں ہوتی ہیں جہاں ہر سال فی لاکھ ۱۱۸ عورتیں اس کا نشانہ بنتی ہیں جب کہ اسی نسبت سے سویڈن میں ایسی عورتوں کی تعداد ۴۳ ہے کینیڈا میں ۲۳ ہے اور فرانس میں ۱۷ ہے اس لئے کینیڈا باوجود امریکہ کے قرب کے عورتوں کے لئے اس کی نسبت کافی محفوظ ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ باوجودیکہ سوئٹزلینڈ دنیا کے امیر ترین ملکوں میں سے ہے وہاں صرف ۳۰٪ لوگ اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ امریکہ میں قتل کی شرح ایک لاکھ پر ۱۲ء۴ ہے جو کہ یورپ اور کینیڈا کے مقابلہ میں پانچ گنا زیادہ ہے۔ جہاں تک شرح پیدائش کا تعلق ہے سابق روس کی مسلمان ریاستوں ازبکستان، ترکمانستان اور کرگستان میں فی ہزار آبادی پر ۲۸ تا ۳۲ کے درمیان ہے جب کہ سپین اور اٹلی کی کیتھولک آبادی میں اضافہ کی شرح اس سے تین گنا کم ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 8.3.96)

کیا کسی انسان کے جسم سے ایک ذرہ لے کر ہو بہو اسی طرح کا ایک اور انسان پیدا کیا جا سکتا ہے؟

ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا لیکن سائنسدان کہتے ہیں کہ اس امر کا امکان ہے کہ مستقبل میں ایسا ہو سکے۔ یہ واقعہ ایک بھیڑ کے ساتھ تو گزر چکا ہے اس لئے کوئی عجب نہیں کہ انسانوں کے ساتھ بھی کبھی ہو سکے۔

مذکورہ بالا امکان اس خبر کے بعد ظاہر کیا گیا ہے جس کا پچھلے دنوں اخبارات اور ٹی۔وی وغیرہ پر خوب چرچا رہا اور جس نے تمام دنیا کو ورطہ ءحیرت میں ڈال دیا۔

ہوا یوں کہ ایڈنبرا سکاٹ لینڈ کے ایک ادارہ Roslin Institute کے ایک سائنس دان Dr.Ian Wilmut نے ایک چھ سالہ بالغ بھیڑ کے تھنوں سے کچھ ذرات (Cells) لے کر ہو بہو اسی طرح کی ایک اور بھیڑ پیدا کر لی جو جولائی ۱۹۹۶ء میں پیدا ہوئی اور اس کا نام 'گڑیا' یعنی Dolly رکھا گیا۔ گڑیا اس بھیڑ کی ہو بہو نقل ہے جس کے خلیات سے اس کا جسم تشکیل پایا ہے نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ اپنے جینز (Genes) کے اور DNA کے اعتبار سے بھی۔ یوں کہ اگر ایک بھیڑ کے جسم کا کوئی حصہ نکال کر دوسری کو لگا دیا جائے تو وہ اسے اپنا ہی عضو سمجھ کر قبول کر لے اور رد نہ کرے۔

اس قسم کے تجربات پھلوں اور سبزیوں پر تو پہلے ہی کامیابی سے کئے جا رہے ہیں لیکن بچوں کو دودھ پلانے والے جانوروں کا جڑواں تیار کرنے کا پہلا کامیاب تجربہ ہے۔ چونکہ انسان بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے یعنی Mammal ہے اس لئے سائنسدان کہتے ہیں کہ اب یہ ممکن ہو گیا ہے

ایک انسان کے جسم سے ایک ذرہ لے کر چند مراحل سے گزار کر عین اس طرح کا ایک اور انسان بھی پیدا کیا جاسکے گا۔ پہلے یہ بات ناممکن سمجھی جاتی تھی اور صرف سائنسی افسانوں ہی میں اس کا ذکر ملتا تھا۔ ڈاکٹر ولمٹ نے جس طرح اس مشکل کو حل کیا وہ کچھ یوں تھا کہ انہوں نے پہلے مرحلہ میں جس بھیڑ کا جڑواں بنانا مقصود تھا اس کے تھنوں سے اس کا DNA حاصل کیا اور اس کو لیبارٹری میں بڑھایا۔

دوسرے مرحلہ میں ایک دوسری بھیڑ سے اس کا انڈہ حاصل کیا اور لیبارٹری میں جا کر اس کا اپنا DNA نکال کر اس کی جگہ پہلی بھیڑ کا فٹ کر دیا۔ پھر ٹیسٹ ٹیوب کے عمل کی طرح اس جنین کی افزائش کی۔ تیسرے مرحلہ میں ایک تیسری بھیڑ لی اور یہ جنین اس کے رحم میں منتقل کر دیا۔ اس بھیڑ نے متبادل ماں Surrogate Mother کا کردار ادا کیا اور اس نے جولائی ۱۹۹۶ء کو گڑیا کو جنم دیا۔ اس ڈرامہ میں تین مادہ بھیڑوں نے حصہ لیا جب کہ کسی نر بھیڑ کا کوئی عمل داخل نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا طریق سے ایک بہترین جانور سے عین اسی طرح کے ہزاروں جانور پیدا کئے جاسکتے ہیں اور اس طرح گوشت زیادہ مقدار میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ جانوروں میں انسانی جینز اور ان کی خصوصیت شامل کر کے ایسے جانور پیدا کئے جاسکتے ہیں جو نیم حیوان نیم انسان ہوں گے اور ان کے اعضاء دل گردہ وغیرہ انسانوں کے جسموں میں لگائے جاسکیں گے جو اگر زیادہ عرصہ کام نہ بھی کریں تو اتنی مہلت مریض کو دے دیں گے کہ اس کے جسم کے لئے قابل قبول انسانی اعضاء مہیا ہوسکیں۔ اس کے علاوہ جینز کی تبدیلیوں سے جانوروں کا دودھ اس قابل بنایا جاسکے گا کہ اسے بطور دوا استعمال کیا جاسکے۔

مذکورہ بالا تجربہ حیران کن تھا۔ اس کی کامیابی کا سن کر پرنسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر آف بیالوجی ڈاکٹر لی سلور (Dr.Lee Silver) نے کہا کہ اس خبر پر یقین نہیں آتا کیونکہ اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ سائنس کے اس شعبہ میں کچھ بھی کیا جاسکتا ہے۔ سب حدیں ٹوٹ چکی ہیں اور جو کچھ سائنسی افسانوں میں لکھا گیا تھا وہ سب سچا ثابت ہو رہا ہے۔ گویا افسانے حقیقت بن رہے ہیں۔ لوگ کہتے تھے ایسا ہونا ممکن نہیں لیکن سائنسدانوں نے ۲۰۰۰ء سے بھی پہلے یہ کر دکھایا۔

سب سے زیادہ فکر کی بات جو سامنے آئی ہے وہ یہ کہ اگر بھیڑ والا تجربہ انسانوں پر بھی کامیاب ہو جائے تو پھر انسانوں کے مثنیٰ بھی بننے لگیں گے اور اس سے بہت سے سماجی اور اخلاقی

مسائل جنم لیں گے۔ یہ تجربہ انسانوں پر کس کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص کے گردے بیکار ہو گئے ہیں اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور موت یقینی نظر آ رہی ہے۔ ڈاکٹر اس کے جسم سے ایک ذرہ لے کر اور اس کی بیوی کا بیضہ لے کر اس کا DNA نکال دیتے ہیں اور مریض کا اس کی جگہ فٹ کر کے ٹیسٹ ٹیوب میں جنین تیار کرتے ہیں۔ اس جنین کو مریض کی بیوی کے جسم میں منتقل کر دیتے ہیں جو وقت پر ایک بچے کو جنم دیتی ہے۔ یہ بچہ مریض کی جینیاتی نقل ہوگا اس لئے اس کا ننھا گردہ جہاں پر وہ آہستہ آہستہ بڑھ کر پورے سائز کا ہو جائے گا۔ چونکہ نیا گردہ مریض کے اپنے ہی جسم کا گویا ایک حصہ ہوگا اس لئے جسم اسے رد نہیں کرے گا۔ لیکن اس عمل میں نوزائیدہ بچہ کی جان جائے گی جب کہ مریض کی جان بچ جائے گی۔ اگر وہ مریض شادی شدہ نہ ہو اور پیسے خرچ کر سکتا ہے تو کسی دوسری عورت کی خدمات بھی کرایہ پر حاصل کر سکتا ہے۔ گویا انسانوں کے بچوں کو پیدا کر کے ان کے اعضاء کو بطور سپیئر پارٹس کے استعمال کیا جا سکے گا جو نہایت ہی بھیانک خیال ہے۔ وہ بچہ بھی قیامت کے دن سوال کر سکتا ہے کہ خدایا مجھے کس جرم میں قتل کیا گیا؟

دوسری مثال فائدہ کا پہلو اپنے اندر رکھتی ہے۔ فرض کریں ایک بچہ کو لیکومیا (Leukeemia) کی بیماری ہے اور کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کا مغز (Bone Marrow) اگر تبدیل ہو جائے تو جان بچ سکتی ہے لیکن ایسا جو جسم قبول کرے میسر نہیں آ رہا۔ اب اس نئے تجربہ کے مطابق اس بیمار بچے کے جسم کا ایک ذرہ سے اس کی والدہ اس جیسے ایک اور بچے کو جنم دیتی ہے (باپ کی ضرورت یہاں پر بھی نہیں ہے) نوزائیدہ بچہ چونکہ مریض کا جڑواں ہے اس کے جسم سے مغز لے کر مریض میں جب منتقل کیا جائے گا تو وہ شفایاب ہو جائے گا اور نوزائیدہ بچہ کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

ٹی۔وی کے ایک پروگرام میں اس مسئلہ پر دلچسپ گفتگو ہو رہی تھی تو ایک صاحب نے کہا کہ اگر اس طریق سے دس بیس صدام حسین اور وجود میں آ جائیں تو پھر کیا ہو۔ اور ایسے ہی چونکہ ہزاروں سال پہلے فوت ہوئے شخص کے جسم سے بھی DNA حاصل کیا جا سکتا ہے اگر سو، دو سو آئن سٹائن اور پیدا ہو جائیں تو پھر دنیا میں کیسا انقلاب آ جائے گا۔

لیکن بالفرض اگر کوئی انسان دوبارہ بھی اپنے پہلے قویٰ کے ساتھ جنم لے لے تو ضروری

نہیں کہ وہ ویسا ہی بن جائے جیسے پہلے تھا۔ وہ پہلے سے بہتر بھی بن سکتا ہے اور خراب بھی۔ والدین، اساتذہ، تعلیم وتربیت، ماحول، ساتھی اور ترقی کے مواقع تبدیل ہوتے رہتے ہیں جو انسان کو کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ دو جڑواں بھائی اگر ایک جیسی قابلیت بھی رکھتے ہوں تو ضروری نہیں کہ زندگی میں ایک جیسا مقام حاصل کر لیں۔ بسا اوقات ایک دوسرے سے محنت اور سازگار ماحول کی وجہ سے کہیں آگے نکل جاتا ہے۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر انسانوں کے جڑواں اس طرح تیار ہونے لگے تو اس سے گھمبیر معاشرتی اور اخلاقی مسائل جنم لے سکتے ہیں۔ اسی لئے ویٹیکن نے بھی اس کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ شادی کے علاوہ کسی طریق سے بھی انسانی پیدائش خدائی منصوبہ کے خلاف ہے۔ قرآن کریم تو چودہ سو سال پہلے ہی خدا کی مخلوق میں تبدیلی کی نہ صرف خبر دے چکا ہے بلکہ اسے شیطانی فعل قرار دے چکا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خلق یا جینز کی تبدیلی جسے آج کل سائنسی زبان میں Genetic Engineering کہتے ہیں اس کے ذریعہ ضرور کچھ شیطان کی مرضی کے کام بھی کئے جائیں گے۔ (النساء:۱۲۰)

خدا نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور اسے اپنی شکل پر پیدا کیا ہے۔ امکانی طور پر اگر انسان جسم کے ایک ذرہ سے ہو بہو اس جیسا اور انسان خدائی قوانین کو بروئے کار لا کر پیدا کر سکتا ہے تو خدا خود ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔ ضرور کر سکتا ہے۔ اگرچہ اگلا جہان مادی نہیں بلکہ روحانی ہے لیکن قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی انسان کا کسی نہ کسی رنگ میں تعلق اس کے جسم کے ذرات سے بھی رہتا ہے۔ یہ خدائی اسرار میں سے ہے اور انسانی عقل اس کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ خدا تعالیٰ دوسری پیدائش کے بارہ میں فرماتا ہے:

> (انسان) اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ جب ہڈیاں گل سڑ جائیں گی تو ان کو بھلا کون زندہ کرے گا۔ تو کہہ دے کہ ایسی ہڈیوں کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق کی حالت سے واقف ہے۔ (یٰسٓ:۷۹۔۸۰)
>
> (وہ کہتے ہیں) کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے

اور ہڈیاں ہو جائیں گے ہم کو پھر سے اٹھا کر کھڑا کر دیا جائے گا؟ اور (اسی طرح) ہمارے پہلے باپ دادوں کو بھی؟ تو کہہ دے ہاں (ہاں) بلکہ تم ذلیل ہو جاؤ گے۔ (الصّٰفّٰت: ۱۷۔۱۹)

(الفضل انٹرنیشنل 21.3.97)

آپ کے (Genes) آپ کی ملازمت کو بھی خطرہ میں ڈال سکتے ہیں

جینز (Genes) پر جونت نئی تحقیقات ہو رہی ہیں ان سے بعض موروثی بیماریوں کا بھی علم ہوا ہے اور جن لوگوں کے خون میں ایسے جینز دریافت ہوتے ہیں جن سے بعض بیماریوں کے پیش آنے کا خطرہ ہوتا ہے تو آجر انہیں ملازمت میں لینے سے کتراتے ہیں۔ یہ بیماریاں کئی قسم کی ہوسکتی ہیں مثلاً نفسیاتی اور ذہنی بیماریاں۔ امراض قلب اور کینسر وغیرہ۔

امریکہ میں ایک سوشل ورکر کے خاندان میں کسی کو ایک نفسیاتی مرض تھی تو اس کا علم ہونے پر اس سوشل ورکر کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ امریکہ کی ائرفورس میں ایک ملازم کو بھی یہی تکلیف ہونے کا ۵۰٪ امکان تھا تو اس کو بھی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

امریکہ میں سرکاری ہسپتال اور علاج کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لئے اکثر کمپنیوں کو پرائیویٹ طور پر ہیلتھ انشورنس لینی پڑتی ہے۔ اگر یہ انشورنس کمپنیاں جینز کی بنیاد پر بیمہ کرانے سے انکار کر دیں یا ان کے لئے بیمہ اتنا مہنگا کر دیں کہ وہ کروا نہ سکیں تو ایسے غریب لوگ عام علاج معالجہ کی سہولت سے محروم ہو جائیں گے اور ہسپتالوں سے ایمرجنسی کے علاوہ انہیں کوئی سہولت میسر نہیں آسکے گی۔ اس چیز نے امتیازی سلوک برتنے کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے اور یہ خطرناک رو جو چل پڑی ہے اسے جین ازم (Gene-ism) کا نام دیا گیا ہے اور اس سے عوام میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 26.7.96)

باپ کی وفات کے کئی سال بعد پیدا ہونے والا ٹیسٹ

ٹیوب بے بی اپنے باپ کا وارث ہوگا

تسمانیہ (آسٹریلیا) کی ہائیکورٹ کا فیصلہ

تسمانیہ (آسٹریلیا) کے ایک میاں بیوی کے تین بچے پہلے سے موجود تھے۔ پتہ نہیں ان کو کیا سوجھی کہ انہوں نے چار عدد جنین (Embryos) لیبارٹری میں منجمد کروا دیئے۔ ان میں سے دو کو استعمال کر کے ۱۹۹۴ء میں بیوی نے ایک بچے کو جنم دیا اپریل ۱۹۹۵ء میں خاوند انتقال کر گیا۔ اب اس کی بیوہ اس کے ایک اور بچے کو جنم دینا چاہتی ہے۔ اس کے خاوند کا ترکہ ایک لاکھ نواسی ہزار ڈالر کا ہے۔ لہٰذا ماں نے مناسب سمجھا کہ پانچویں بچے کی تیاری سے قبل عدالت سے یہ فیصلہ کروا لیا جائے کہ ہونے والا بچہ بھی اپنے آنجہانی باپ کا وارث ہوگا۔ تسمانیہ ہائی کورٹ تک معاملہ پہنچا اور جسٹس سلائیسر (j.Slicer) نے فیصلہ دیا چونکہ یہ فیصلہ پہلے سے موجود ہے کہ باپ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والا بچہ ورثہ پائے گا لہٰذا اگر تم کسی مزید بچے کو جنم دو تو وہ باپ کے ترکہ میں سے حصہ پائے گا۔ بعض دوسری ریاستیں اس فیصلے سے متفق نہیں۔ ریاست وکٹوریہ کے ایک افسر نے کہا ہے کہ فیصلہ میں ایک وفات شدہ شخص کو زندہ کی طرح تسلیم کیا گیا ہے جس کو ہم درست نہیں سمجھتے۔

(الفضل انٹرنیشنل 26.7.96)

لوگ آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟

اس سوال کا جواب ماہرین نفسیات نے بہت تجربات کے بعد یہ دیا ہے کہ:

''ایسا ہی جیسا آپ ان کو سمجھتے ہیں۔''

نفسیات کی ایک شاخ کو STT یعنی (Spontaneous Trait Transference) کہا جاتا ہے۔یعنی ہر انسان میں بعض نمایاں امتیازی صفات ہوتی ہیں جو اس کی شخصیت کا طرۂ امتیاز کہی جاسکتی ہیں۔ یہ صفات اچھی بھی ہوسکتی ہیں اور بری بھی اور پاس اٹھنے بیٹھنے والوں کو منتقل ہوجاتی ہیں ۔امریکہ کی اوہائیوسٹیٹ یونیورسٹی کے پروفیسر جان سکورانسکی جو اس شعبہ سے متعلق ہیں انہوں نے اپنی لیبارٹری میں بہت سے افراد پر ایسے تجربات کئے ہیں جن کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ لوگ دوسروں کے بارہ میں آپ کی اچھی یا بری باتیں سن کر خود آپ کے بارہ میں لاشعوری طور پر کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ان کے تجربات کی رپورٹ رسالہ (Joumal of personality & Social Psychology) میں شائع ہوئی ہے جو دلچسپی کی حامل ہے۔

پروفیسر صاحب نے بہت سے لوگوں کو وڈیو پر کسی شخص کی تصویر دکھائی جس کے ساتھ ایک بیان بھی تھا جس میں کسی کے بارہ میں بعض باتیں بتائی گئی تھیں۔وہ باتیں یا تو صاحب تصویر نے کسی کے بارہ میں کہی تھیں جس کو وہ جانتا تھا یا کسی اور نے صاحب تصویر کے بارہ میں کہی تھیں۔جب لوگوں سے رائے لی گئی کہ صاحب تصویر یا دوسرے شخص کو آپ کیا سمجھتے ہیں تو تقریباً سبھی نے یہ کہا کہ جس نے یہ باتیں بیان کی ہیں وہ خود ہی ایسا ہے یعنی جنہوں نے دوسروں کے بارہ میں اچھی رائے ظاہر کی وہ خود اچھے تھے اور جس نے نکتہ چینی کی اور دوسروں کے نقص بیان کئے وہ خود اچھے نہ تھے۔ان

تجربات سے پروفیسر مذکور نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر آپ مجلس میں دوسروں کے نقائص اور کمزوریاں بیان کرتے ہیں تو سننے والوں کے ذہن میں خود آپ کے بارہ میں برا تاثر پیدا ہوتا ہے اور خود آپ کا مقام ان کی نگاہ میں گر جاتا ہے۔ اور جو شخص دوسروں کے بارہ میں بالعموم اچھی اور مثبت رائے ظاہر کرتا ہے لوگ خود اس کو اچھا سمجھتے ہیں۔ رپورٹر باب بیل تجربات کے مذکورہ بالا نتائج تحریر کر کے لکھتے ہیں کہ ہماری ماں ٹھیک ہی کہا کرتی تھی کہ اگر تم کسی کے بارہ میں اچھی بات نہیں کر سکتے تو پھر بہتر ہے کہ منہ بند رکھو اور خاموش رہو۔

(ماخوذ از سڈنی ہیرلڈ ۲۸ مارچ ۱۹۹۸ء)

باب بیل کی ماں واقعی ٹھیک کہا کرتی تھی۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ ہر غیبت اور نکتہ چینی کرنے والے کے لئے ہلاکت ہے اور یہ کہ سچوں اور نیکوں کی صحبت اختیار کیا کرو۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی یہی فرمایا تھا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے یعنی جیسا تم دوسرے کو دیکھتے ہو دراصل تم اپنا عکس ہی اس میں دیکھتے ہو۔ اگر تم اس کو دل سے اچھا سمجھتے ہو تو تم خود اچھے ہو اور اگر برا سمجھتے ہو تو تمہاری اپنی برائی ہی اس میں جھلکتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جیسا رویہ کسی کا دوسرے کے بارہ میں ہوتا ہے ویسا ہی لاشعوری طور پر دوسرے کا رویہ اس کے بارہ میں ہو جاتا ہے منافقت سے اختیار کیا ہوا رویہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ جھوٹ کاٹھ کی ہنڈیا کی طرح ہوتا ہے۔ حضرت رسول کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ قوم ہلاک ہوگئی اسی نے قوم کو ہلاک کیا بلکہ وہ خود سب سے زیادہ ہلاک شدہ ہے۔

بلاشبہ انسان کے خیالات دوسروں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ماہرین نفسیات نے بھی تجربات سے یہی ثابت کیا ہے اور سائنس دان بھی خیال کی قوت (Thought Energy) کے قائل ہیں۔ امریکہ کی بحریہ نے محض خیال کی طاقت سے بطور ریموٹ کنٹرول کشتی کی موٹر کو کنٹرول کر لیا ہے اور اب محض خیال اور ارادہ کی قوت سے ہوائی جہازوں کے نظام کو کنٹرول کرنے کے بارہ میں کوشش کر رہے ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو قرآن وحدیث کی باتوں کو سچا ثابت کرنے والی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام سچے علوم قرآن کے خادم ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اثر صحبت: لیکن صحبت میں بڑا اشرف ہے۔ اس کی تاثیر کچھ نہ کچھ

فائدہ پہنچا ہی دیتی ہے۔ کسی کے پاس اگر خوشبو ہو تو پاس والے کو بھی پہنچ ہی جاتی ہے۔ اسی طرح پر صادقوں کی صحبت ایک روح صدق کی نفخ کر دیتی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ گہری صحبت نبی اور صاحب نبی کو ایک کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن شریف میں کُوْنُوا مَعَ الصَّادِقِین (توبہ:۱۱۹) فرمایا ہے اور اسلام کی خوبیوں میں سے یہ ایک بے نظیر خوبی ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے صادق موجود رہتے ہیں۔''

(ملفوظات جلد ۸ صفحہ ۳۱۵)

اللہ تعالیٰ کا جماعت احمدیہ پر یہ بہت بڑا انعام ہے کہ خلیفہ وقت کی ذات میں وہ صادق ہر وقت موجود رہتا ہے۔ کہیں جسمانی صورت میں بھی اور کہیں ایم ٹی اے کے توسط سے اور آپ کے خطبات اور فرمودات اور نیکی کی باتیں ہر وقت ہمارے کانوں میں پہنچتی رہتی ہیں۔ دوسروں کو یہ نعمت کہاں میسر ہے۔ **الحمد لله على ذلک**۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ے جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یعنی اگر مجھ میں کوئی خوبی ہے تو یہ میرے ہم نشیں کی صحبت کا ہی اثر ہے ورنہ میں تو محض خاک ہی ہوں۔

(الفضل انٹرنیشنل 10.7.96)

آسمانی بجلی گھروں کے قیام کی تجویز

آسمان سے سورج کی گرمی کو زمین پر منعکس کر کے متعدد بڑے بڑے بجلی گھروں کی تعمیر کے منصوبے تیار کئے جا رہے ہیں ۔ یہ کوئی بہت دور کی بات نہیں آئندہ بیس سالوں میں سکائی پاور سٹیشنوں کا قیام ممکن ہے ۔امریکی ادارہ ناسا (National Aeronautics and Space Administration) نے امریکہ کے ایوان نمائندگان کی سب کمیٹی کو بتایا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ خلا سے شمسی توانائی حاصل کرنے کے مسئلہ پر سنجیدگی سے دوبارہ غور کیا جائے ۔آئندہ بیس سالوں میں شمسی توانائی کے دو منصوبے کام شروع کر سکتے ہیں ۔

پہلے منصوبہ کا نام Sun Tower رکھا گیا ہے ۔اس میں ایسا نظام قائم کیا جائے گا جس میں متعدد سیٹلائٹ خط استوا کے اوپر بارہ ہزار کلومیٹر کی بلندی پر زمین کے گرد چکر لگائیں گے ۔ ہر سیٹلائٹ ۲۰۰ تا ۴۰۰ میگاواٹ بجلی پیدا کرے گا ۔ (ایک میگاواٹ ایک ہزار کلوواٹ کا ہوتا ہے) سٹیلائیٹ پر ایسی ڈسکیں لگی ہوں گی جو سورج کی گرمی کو زمین پر منعکس کریں گی جس کی طاقت سے بجلی گھر چلیں گے ۔اس منصوبہ کے تحت دنیا بھر میں کہیں بھی پاور سٹیشن تعمیر کئے جا سکیں گے اور اس طرح امریکی ادارے جس ملک کو چاہیں گے بجلی مہیا کر سکیں گے ۔

دوسرے منصوبہ کا نام Solar Disk ہے ۔اس کے تحت سیٹلائٹ بہت زیادہ اونچائی پر قائم کئے جائیں گے لیکن ان کا مقصد کسی خاص علاقے کو بجلی مہیا کرنے تک ہی محدود ہوگا ۔اس کا ہر سیٹلائٹ پانچ ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کر سکے گا ۔لطف کی بات یہ ہے کہ اگرچہ سیٹلائٹ کے مختلف حصے زمین پر ہی تیار کئے جائیں گے لیکن ان کو آسمان پر جوڑنے کے لئے کسی خلاباز کی ضرورت نہیں ہوگی ۔

ان کو ناسا کے انجینئر زمین پر سے ہی ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ تعمیر کریں گے۔ وہ منظر بھی عجیب ہوگا جب بغیر ظاہری ہاتھ سے استعمال کے آسمان پر مصنوعی سیارے بن رہے ہونگے۔

ناسا کے انجینئروں کا خیال ہے کہ اکیسویں صدی میں دنیا کی بجلی کی ضروریات اتنی بڑھ جائیں گی کہ انہیں مروجہ طریقوں سے پورا نہیں کیا جاسکے گا۔ لہٰذا شمسی توانائی کا استعمال فائدہ بخش ہوگا۔

(الفضل انٹرنیشنل 12.6.98)

چوہوں کے نوزائدہ بچوں کا خلا کا سفر

ناسا امریکہ کے سائنسدان انسانوں کو لمبا عرصہ خلا میں رکھنے اوران پر بے وزنی کی کیفیت کے اثرات معلوم کرنے کے لئے تجربات کررہے ہیں۔ چنانچہ ۱۷؍اپریل ۹۸ء کو جو خلائی شٹل کولمبیا خلا میں بھجوائی گئی اس میں سات خلا باز تھے اوران کے ساتھ دو ہزار کترنے والے جانور (Rodents) اور کیڑے مکوڑے شامل تھے۔

خلا میں بھیجے جانے والے جانوروں میں انگوٹھے کے سائز کے ۹۶ عدد چوہوں کے بچے بھی تھے جن کی عمر صرف نو دن تھی۔ مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ بے وزنی کی کیفیت دماغ اوراعصابی نظام کی نشوونما پر کیا اثر ڈالتی ہے۔ کچھ چوہیاں حاملہ بھی تھیں تا ان کے ہونے والے بچوں پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا اندازہ ہو سکے۔

چوہوں کے بچوں کو خلا کا سفر راس نہیں آیا۔ ان میں سے زائد از نصف جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس پر جانوروں کے حقوق کی ایک سوسائٹی (Peta) نے احتجاج کرتے ہوئے کہا ہے کہ ناسا کا تجربہ بڑا خوفناک ہے۔ ناسا والے چوہوں کو بھی نہیں سنبھال سکتے نہ زمین پر ان کو زندہ رکھ سکتے ہیں نہ خلا میں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہمارا اندازہ تھا کہ صرف ۱۰ فیصد کے قریب چوہوں کے بچے مریں گے لیکن ہوا یہ کہ ان کی ماؤں (Surrogate Mother) نے پانی کم پیا اور انہوں نے اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلایا یا دودھ بنا نہیں۔ بہرحال وہ مائیں بچوں سے دور دور رہیں اوران کی طرف سے غافل رہیں۔ اس لئے موت کی اصل وجہ ناکافی نرسنگ تھی نہ کہ ناسا کی غفلت۔

خلا بازوں کا قد بے وزنی کی وجہ سے کچھ بڑھ گیا ریڑھ کی ہڈی کچھ سیدھی ہوگئی لیکن زمین پر

قدم دھرتے ہی وہ اپنے اصل قد پر لوٹ آئے۔ خلابازوں پر بھی بے وزنی کے اثرات معلوم کرنے کے لئے کئی قسم کے تجربات کئے گئے۔

(الفضل انٹرنیشنل 12.6.98)

سمندر کی تہہ میں معدنیات

امریکی سائنسی ادارہ AAAS کے ۱۹۹۷ء کے اجلاس میں بتایا گیا کہ مستقبل میں سطح سمندر کے نیچے ابلنے والے آتش فشاں پہاڑوں سے معدنیات حاصل کی جائیں گی لیکن چونکہ وہ کوئی تین کلومیٹر زیرِ زمین ہیں اس لئے وہاں تک پہنچنا خاصہ مہنگا پڑے گا۔ اس لئے ان کے نکالنے کی باری تب آئے گی جب زمین کی کانیں خالی ہو جائیں گی یا وہاں سے نکالنا بہت زیادہ مہنگا ہو جائے گا۔

نیویارک سٹیٹ کی Rutgers University کی Dr Richard Lutz نے بتایا کہ سمندر کی تہ سے نیچے جو آتش فشاں پہاڑ ہیں وہ چمنیوں کی شکل میں گیسیں اور پگھلی ہوئی قیمتی دھاتیں اگل رہے ہیں جیسے سونا، چاندی، تانبہ اور سکہ وغیرہ۔ نیز یہ بھی پتہ چلا ہے کہ لاوے کے راستوں کے اردگرد ایسی جاندار مخلوق پھولتی پھلتی ہے جو سخت گرم ماحول، گندھک اور تاریکی کو پسند کرتی ہے۔

(سڈنی ہیرلڈ ۱۸ فروری ۱۹۹۸ء)

قرآن مجید میں پیشگوئی تھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب زمین اپنے خزانے باہر نکال پھینکے گی (الزلزال ۳) جس طرح آج زیرِ زمین سے پٹرولیم اور معدنیات نکالی جا رہی ہیں۔ ایسا تاریخ میں پہلے کب ہوا تھا اور اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا دوسرا دور وہ ہوگا جب خشکی کے بعد سمندر کے نیچے سے بھی مدفون خزائن باہر نکالے جائیں گے۔ ایک لحاظ سے اس کا بھی آغاز ہو چکا ہے اور سمندر کے نیچے سے پڑولیم نکالا جا رہا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 12.6.98)

لہسن کی بو، پیچش پیدا کرنے والے امیبا کو بھی ناگوار ہے

امیبا(Amoeba)ایک خلیاتی (Single-Cell) مخلوق ہے ۔جو پانی ، مٹی یا بطور پیراسائٹ جانوروں میں پایا جاتا ہے۔ وہ امیبا جو پیچش پیدا کرتا ہے لہسن کی بو اس کے بعض اینزائمز (Enzymes) کو روک دیتی ہے اور اس طرح ان کی نشو ونما رک جاتی ہے۔لہسن میں وہ چیز جو بو پیدا کرتی ہے اس کو Allicin کہا جاتا ہے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ حکماء ہمیشہ سے پیاز اور لہسن کو بطور جراثیم کش دوا کے استعمال کرتے رہے ہیں۔ پیاز کا ایک مشہور فائدہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ خون کو جمنے (Blood Clotting) سے بچاتا ہے۔ چنانچہ گرم صحراؤں میں سفر کرنے والے Dehydration اور اس کے نتائج (خون جمنا وغیرہ) سے بچنے کے لئے اپنے ساتھ پیاز ضرور رکھتے تھے۔عرب میں آج بھی پیاز بہت کھایا جاتا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 26.6.98)

آپ کے دماغ کی ٹریننگ اور ترقی آپ کے ہاتھ میں ہے

پروفیسر Michael Posner of Oregon University Eugene USA نے انسانی دماغ پر بڑے دلچسپ تجربات کئے ہیں۔انہوں نے پہلے ایسے بچوں کے دماغوں کا مشاہدہ کیا جنہوں نے ابھی پڑھنا لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔پھر جیسے جیسے حساب اور لکھنا پڑھنا سیکھتے گئے ان کے دماغوں میں تبدیلیاں پیدا ہوتی گئیں۔دماغ کے جو حصے زیر استعمال آتے گئے ان کے اجزاء میں باہم رابطہ بڑھ گیا جیسے انہوں نے ایک دوسرے سے بولنا شروع کر دیا ہو۔جس بچے نے نہ پڑھا اس کا دماغ کورے کا کورا رہا۔

دماغ میں ان گنت قویٰ ودیعت کئے گئے ہیں لیکن وہ کار آمد اور مفید تبھی بنتے ہیں جب انہیں استعمال کیا جائے۔پنگھوڑے کی عمر سے لے کر لحد تک علم حاصل کرتے رہنے میں یہی حکمت ہے کہ اس طرح انسان کا دماغ ترقی کرتا اور کار آمد رہتا ہے۔اس لئے یہ کبھی نہ سوچیں کہ بوڑھے طوطے کیا سیکھیں گے۔

(الفضل انٹرنیشنل 26.6.98)

دانتوں کو صاف نہ رکھنے سے دل کی تکلیف بھی ہوسکتی ہے

مشہور مقولہ ہے کہ دانت اچھے تو صحت اچھی ۔اب نئی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ بیکٹیریا (Sterptococcus Sanguis) جو منہ کے اندر تو بے ضرر ہوتا ہے لیکن جب خون کی رو میں داخل ہوتا ہے تو یہ خون میں لوتھڑے (Clot) بنا سکتا ہے جس سے دل کا عارضہ پیدا ہوتا ہے ۔جن لوگوں کے مسوڑوں میں تکلیف ہوتی ہے ان کو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

ایک اور ڈاکٹر نے ۲۵٦٦ سن یاس (Post-Menopausal) سے آگے نکلنے والی عورتوں کو زیر مطالعہ رکھا۔معلوم ہوا کہ جن عورتوں کے دانت نکل گئے تھے ان کو ہڈیوں کے بھربھرا ہونے اور ان میں کیلشیم کی کمی کی تکلیف ہوگئی تھی۔

منہ اور دانتوں کی صفائی اور مسواک کے استعمال پر تو اسلام میں ایسا زور دیا گیا ہے کہ گویا یہ عبادت کا حصہ بن چکا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 26.6.98)

سچ دل ودماغ (روح) پرسہل اور جھوٹ بوجھل پایا گیا

سائنسی آلات کی مدد سے سچ اور جھوٹ بولنے کے دوران دل ودماغ پر گزرنے والی واردات کا مشاہدہ ومعائنہ کیا گیا ہے۔ پتہ چلا ہے کہ سچ بولنا آسان اور جھوٹ بولنا مشکل ہے۔ یونیورسٹی آف پینسلوینیا (Pennsylvania) کے پروفیسروں نے متعدد رضا کاروں کے دماغوں کا معائنہ (Scanning) سچ اور جھوٹ بولنے کے دوران کیا ہے جس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انسان کے دماغ کے سامنے والا حصہ (Frontal Lobe) غوروفکر میں فعّال کردار ادا کرتا ہے اور اس عمل کو منضبط (Regulate) کرتا ہے۔ اس حصہ کی کارکردگی سکرین پر دیکھی جارہی تھی۔ جب کوئی والنٹیر سچ بولتا تو دماغ پرسکون نظر آتا اور جب وہ جھوٹ بولتا تو اس حصہ میں کشمکش اور سرگرمی دکھائی دیتی۔

چنانچہ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ دماغ کی تصویر (Brain Imaging) کے ذریعہ بڑی صحت کے ساتھ یہ پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ زیرمشاہدہ شخص سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ چنانچہ اس اصول کو کام میں لاکر نئی قسم کا جھوٹ پکڑنے کا آلہ (Lie Detector) بنایا جاسکتا ہے۔ آج کل جو آلہ اس غرض کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی پالی گراف (Polygraph) وہ ایک دوسرے اصول پر کام کرتا ہے جو یہ ہے کہ اس کے ذریعہ متعلقہ شخص کے دل اور اس کی شریانوں اور پسینہ پیدا کرنے والی غدود (Glands) میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو نوٹ کیا جاتا ہے۔ لیکن سوچ کا مرکز چونکہ دماغ ہے اور دل اور دوسرے اعضاء اس کی پیروی کرتے ہیں اس لئے جو اطلاع براہ راست مرکز سے

حاصل کی جائے گی وہ اس سے بہتر ہوگی جو آج کل اس کے ماتحت اداروں سے حاصل کی جاتی ہے۔

(سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۴ستمبر ۲۰۰۵ء)

سچ کی حالت میں دل و دماغ پُرسکون ہوتے ہیں جبکہ جھوٹ جسم وروح میں بے چینی اور کشمکش پیدا کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کی فطرت اور تخلیق سچائی سے مناسبت رکھتی ہے۔ عام مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ بچے سچ بولتے ہیں جب تک کہ وہ اپنے ماحول سے متاثر یا مرعوب ہوکر جھوٹ بولنا نہ سیکھ لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کتنا سچا ثابت ہوتا ہے کہ ہر بچہ صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے بعد میں اس کے والدین (یعنی ماحول وغیرہ) اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی وغیرہ بنا دیتے ہیں۔ انسان کی فطرت تو صحیح ہونی ہی تھی کیونکہ ''یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے''۔ (الروم:۳۱) خدا نے انسان کو اپنی صورت میں پیدا کیا ہے اس لئے اس نے اپنی ہی صفات کا رنگ اختیار کرنے کا ارشاد فرمایا ہے: ''اللہ کا رنگ پکڑو اور رنگ میں اللہ سے بہتر اور کون ہوسکتا ہے''۔ (البقرہ:۱۳۹) اللہ کا رنگ تو پھر یہی ہے کہ وہ ہر سچے سے بڑھ کر سچا ہے جیسے فرمایا: ''اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہے؟ (النساء:۱۲۳)

مریخ سے لائی جانے والی مٹی کے لئے خاص لیبارٹری کا قیام

ناسا امریکہ نے اعلان کیا ہے کہ مختلف اداروں کے سائنس دان مل کر ایک ایسی لیبارٹری قائم کر رہے ہیں جس میں وہ تمام مٹی پتھر وغیرہ رکھے جائیں گے جو مریخ سے لائے جائیں گے۔ منصوبہ کے مطابق مریخ سے مٹی ۲۰۰۱ء، ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۵ء میں لائی جائے گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر چہ خطرہ بہت معمولی ہے لیکن امکان ہے کہ مریخ سے لائی ہوئی مٹی کے ساتھ کچھ جراثیم بھی ساتھ زمین پر آجائیں جس سے زمین کے انسانوں، حیوانوں اور نباتات میں بیماری پیدا ہو جائے۔

(الفضل انٹرنیشنل 26.6.98)

خدا پر یقین، جسم اور روح دونوں کو صحت دیتا ہے

اس خبر کا عنوان ہے Faith Heals Body & Soul اور اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے ۱۷۲۷، بوڑھوں کا مطالعہ اس غرض سے کیا کہ مذہب پر اعتقاد کا ان کے جسموں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ انہوں نے واضح طور پر یہ پایا کہ اعتقاد کا جسم کے دفاعی نظام (Immune System) سے گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ ٹیم کے سربراہ Dr.Harold (Koeing) جو ڈرہم کی ڈیوک یونیورسٹی سے متعلق ہیں کہتے ہیں کہ ''ہمارا خیال ہے کہ مذہبی اعتقاد، ذہنی صحت اور جسم کے نظام دفاع کا آپس میں تعلق ہے۔''

(الفضل انٹرنیشنل 26.6.98)

گولیاں جو دشمن کا پیچھا کر کے اس کو لگیں گی

برطانوی رسالہ ''نیو سائنٹسٹ'' کے مطابق امریکہ ایسی ''سمارٹ بلیٹ'' (Smart Bullet) ایجاد کر رہا ہے جو اپنے نشانہ کا تعاقب کریں گی ۔ان گولیوں کو BLAMS یعنی (Barrel-Launched Adaptiv Munitions) کہا گیا ہے۔اور ایک لیزر کی شعاع (Laser Beam) گولی کی رہنمائی کرے گی۔ یہ تو وہی بات ہوئی:

ع ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں

(الفضل انٹرنیشنل 26.6.98)

کھچاؤ اور دباؤ کے حاملہ عورتوں اور ان کے ہونے والے بچوں پر بد اثرات

حال ہی میں ملبورن : آسٹریلیا میں ایک سائنس کانفرنس منعقد ہوئی ہے اس میں Dr Miodrag Dodic نے بتایا کہ حاملہ بھیڑوں کے بچوں پر دوران حمل ان کے ماؤں کو جس کھچاؤ اور دباؤ (Stress) سے گزرنا پڑا ہم نے اس کے اثرات کا مشاہدہ کرنے کے لئے تجربات کئے ہیں اس غرض کے لئے انہوں نے حاملہ بھیڑوں کو صرف دوروز کے لئے ان کو وہ ہارمون زیادہ مقدار میں دئے جوان کا جسم Stress کے دوران پیدا کرتا ہے یعنی ان کو Stress Hormones کی نارمل سے زیادہ مقدار دی گئی۔ پھر جب ان کے بچے جوان ہوئے تو ان کے معائنہ سے پتہ لگا کہ ان کو ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف ہوگئی ہے جوان بھیڑوں کو نہیں جن کی ماؤں کو دوران حمل فکر وتشویش کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ البتہ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ ایسے بچوں پر لمبا عرصہ چلنے والے بد اثرات کیا مرتب ہونگے۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جس چیز کا علم ہم سب کو ہونا چاہئے وہ یہ ہے کہ عورتوں کے آغاز حمل کے تین مہینے بالخصوص اہم ہوتے ہیں کیونکہ اس دوران بچہ کے تمام اعضاء بن رہے ہوتے ہیں اور اس کا وہ ماحول تیار ہو رہا ہوتا ہے جس میں بچہ نے پرورش پانی ہوتی ہے لہذا اس عرصہ میں ماں پر جو گزرتی ہے اس کا بچہ کی نشو ونما اور نفسیات پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

وہ کہتے ہیں ہماری آبادی کا چوتھا حصہ ۴۵ سال کی عمر کے بعد ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہو جاتا

ہے جس سے فالج اور امراض قلب پیدا ہوتے ہیں۔ لہذا یہ بہت ضروری ہے کہ حاملہ عورتوں کا ماحول خوشگوار رکھا جائے اور ان کو Stress سے بچایا جائے ورنہ امکان ہے کہ ان کے بچوں کو اس کے بدنتائج ۴۵ سال کی عمر کے بعد بھگتنا پڑیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جب حاملہ عورتوں کو کوئی تشویش کی بات پیش آئے تو وہ اپنی توجہ ادھر سے ہٹانے کے لئے ایک سے دس تک گنتی توجہ سے شروع کریں اس سے افاقہ ہوگا۔

(ماخوذ سڈنی ہیرلڈ ۸ مئی ۱۹۹۸ء)

گنتی کی بجائے اگر نماز، دعا، استغفار اور درود شریف سمجھ سمجھ کر پڑھا جائے اور خدا کی رضا پر راضی رہنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کیا جائے تو امید ہے کہ یہ فارمولا سٹریس کو دور کرنے کے لئے گنتی کی نسبت کہیں زیادہ مؤثر ہوگا۔ نیز اس تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے گھر کے ماحول کو خوشگوار رکھنا اور فکر و تشویش (Stress & Tension) کو خواہ مخواہ پیدا نہ ہونے دینا نہ صرف اپنی صحت کے لئے بلکہ اپنے بچوں کی صحت کے لئے بھی ضروری ہے۔ جو طبائع ہر وقت فکر و تشویش میں مبتلا رہتی ہیں ہوسکتا ہے کہ ان کے لاشعور میں وہی تشویش ڈیرے ڈالے ہوئے جو ان کی ماں کو ان کی پیدائش سے پہلے رہا کرتی تھی۔ بہر حال خدا کے قانون میں ہر چیز خواہ ایٹم کے برابر چھوٹی ہو، اچھی یا بری اپنا نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ جیسے فرمایا کہ جو ذرہ برابر بھی نیک یا برا عمل کرے گا وہ اس کا نتیجہ دیکھ لے گا۔ (سورۃ الزلزال) سوائے اس کے کہ خدا اس کے بدنتائج کو اپنے فضل سے محو کر دے جیسا کہ قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر مذکور ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 19.6.98)

بھونکے کُتا کاٹے قانون

وہ بھی کیا دن تھے کہ جب کتے بھونک بھونک کر ہی اپنا غصہ نکال لیتے تھے اس لئے جو بھونکتے تھے وہ کاٹتے نہیں تھے لیکن آج کل تو کتے بھونکتے بھی ہیں اور کاٹتے بھی ہیں۔ چنانچہ لوگوں کی شکایت اتنی بڑھیں کہ حکومت نیو ساؤتھ ویلز (آسٹریلیا) قانون بنا رہی ہے کہ مالک اپنے کتوں کو پٹہ بھی ڈالیں اور چھینکا بھی۔ ورنہ بھونکنے والے کتوں کے مالکوں کی قانون خبر لے گا۔

خبر کے مطابق کتا پہلی بار بھونکے گا تو ۱۰۰ ڈالر جرمانہ ہوگا اس کے بعد ہر بار بھونکنے پر پھر اتنا ہی جرمانہ یہاں تک کہ جرمانہ کی کل رقم ۴۴۰۰ ڈالر ہو جائے (یہ واضح نہیں کہ اتنا جرمانہ ادا کرنے کے بعد فری بھونکنے کی اجازت ہوگی یا نہیں) جو کتے زیادہ خطرناک ہیں ان کے مالکوں کو جرمانہ بھی ہوگا یعنی ۵۵۰۰ ڈالر تک۔ سڑکوں پر گند ڈالنے کی صورت میں موقعہ پر ہی ۲۰۰ ڈالر جرمانہ ہوگا۔ رجسٹریشن فیس بھی بڑھا کر ۱۰۰ ڈالر کر دی گئی ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ آئندہ جو بھی بلیاں کتے رجسٹر کئے جائیں گے ان کے اندر ایک مائیکرو چپ لگایا جائے گا جس سے ان کی نقل و حرکت ہر وقت معلوم کی جا سکے گی۔ یوں مفرور کتوں اور بلیوں کو پکڑنا اور مالکوں کو لوٹانا آسان ہو جائے گا۔ یہ مائیکرو چپ صرف دس ڈالر کی ہوگی۔

یاد آیا کہ چند روز قبل یہ خبر بھی آئی تھی کہ نیو ساؤتھ ویلز کے جو قیدی جیل سے باہر کام کرنے کے لئے جاتے ہیں ان کے گھٹنوں پر ایسا چھوٹا سا آلہ باندھ دیا جایا کرے گا جس سے ان کی نقل

وحرکت ہر وقت جیل میں ریکارڈ کی جاسکے گی ۔اور وہ جونہی اپنی مقررہ حدود سے تجاوز کریں گے ان کے خلاف فوری کارروائی عمل میں لائی جاسکے گی ۔

(الفضل انٹرنیشنل 19.6.98)

پڑھنے والا پین

اب تک ایسی عینک تو کوئی نہیں بنی جس کو پہن کران پڑھ بھی پڑھنے لگیں لیکن اس کی بجائے اب ایک کمپنی (Sieko Instruments) نے ایک ایسا قلم ایجاد کرلیا ہے جو اگر کسی ٹائپ شدہ لفظ پر رکھا جائے تو اس کو اونچی آواز سے پڑھ کر سنا دیتا ہے ۔اس کا نام Quicktionary Reading pen ہے اور جیبی سائز کا ہے۔کوئی تین سوڈالراس کی قیمت ہے لیکن یہ تحریر کو ایک ایک لفظ کر کے ہی پڑھ سکتا ہے۔بہر حال جن کے لئے عینک سے پڑھنا بھی ممکن نہیں لیکن وہ سن سکتے ہیں ان کے لئے مفید ایجاد ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 4.6.99)

بولنے والی کتاب

امریکہ کی ایک کمپنی نے ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس پر کہ پوری کتاب ریکارڈ ہو جائے اور آپ چلتے پھرتے کانوں کو لگا کر اس کو سنتے رہیں۔ کتاب کی کیسٹ بازار سے خریدنے کی بھی صورت نہیں، انٹرنیٹ کے ذریعہ دنیا بھر کی جو کتاب چاہیں اپنے کمپیوٹر پر لا کر اس کو Audible Software میں بھر لیں اور Mobile Player کے ذریعہ سنتے رہیں۔

کوئی پڑھنے والا ہو بلکہ سننے والا ہو۔ سہولتوں کے تو انبار لگ رہے ہیں۔ یہ سب ایجادیں کبھی دینی تعلیم اور تبلیغ کے لئے بھی استعمال ہونگی۔ انشاءاللہ

(الفضل انٹرنیشنل 4.6.99)

آپ کے گھر میں سب سے زیادہ بکٹیریا کہاں پائے جاتے ہیں

امریکہ کی University of Arizona نے تیس ہفتوں کی تحقیق کے بعد یہ معلوم کیا ہے کہ سب سے زیادہ بکٹیریا اس کپڑے میں ہوتے ہیں جس سے پلیٹیں دھونے کے بعد صاف کی جاتی ہیں۔ اس کپڑے کو نچوڑنے سے جو پانی نکلا اس میں ٹائلٹ کی سیٹ کے مقابلہ میں دس لاکھ گنا زیادہ بکٹیریا پائے گئے لہذا پلیٹوں کو دھونے کے بعد خود ہی سوکھنے دیں تو بہتر ہے۔ کپڑے کی نمی میں جراثیم خوب پھلتے پھولتے ہیں جب کہ ٹائیلٹ کی سیٹ چکنی ہونے کی وجہ سے بکٹیریا کی افزائش کے لئے کم موزوں ہے لیکن پبلک ٹائیلٹ کا استعمال پھر بھی احتیاط سے ہی ہونا چاہئے، ہر طرح کے لوگ انہیں استعمال کرتے ہیں۔ جو لوگ ڈش کلاتھ استعمال کرتے ہیں انہیں ہر ہفتہ کسی جراثیم کش پاؤڈر وغیرہ سے دھونا چاہیئے۔ جس تختہ پر سبزی، گوشت کاٹتے ہیں وہاں بھی جراثیم کافی موجود ہوتے ہیں۔ گندے پانی سے اگائی ہوئی سبزیوں پر بھی کئی بیماریوں کے جراثیم ہوتے ہیں جو دھلنے سے صاف نہیں ہوتے لیکن پکانے کے دوران مر جاتے ہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 4.6.99)

فرانس میں روبوٹ کے ذریعہ دل کا پہلا بائی پاس آپریشن

پیرس کے ایک ہسپتال میں پہلی بار ایک اوپن ہارٹ سرجری کا کامیاب آپریشن دو ڈاکٹروں نے ایسے روبوٹ (Robot) کے ذریعہ کیا ہے جس کو وہ کمپیوٹر کے ذریعہ مریض سے کئی میٹر دور بیٹھے ہوئے کنٹرول کر رہے تھے۔ پانچ دوسرے آپریشن بھی روبوٹ کے ذریعہ کئے گئے۔ مریض کے جسم میں صرف چار سنٹی میٹر (کوئی ڈیڑھ انچ) لمبا چوڑا چیرا دیا گیا۔ سرجن دور بیٹھے کیمرے کے ذریعہ مریض کے جسم کے اندر دیکھ رہے تھے اور کمپیوٹر کے ذریعہ روبوٹ کو ہدایات دے رہے تھے چونکہ کمپیوٹر کو سرجنوں کے ہاتھوں کی نسبت تین تا پانچ گنا کم جگہ درکار تھی اس لئے سرجری زیادہ ٹھیک طور پر کی گئی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مریض کو صحت یاب ہونے کے دوران نسبتاً کم درد محسوس ہوئی۔

ایک وقت وہ بھی آسکتا ہے جب ڈاکٹر ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے کسی مریض کا آپریشن روبوٹ اور کمپیوٹر کی مدد سے کر رہے ہونگے۔

(الفضل انٹرنیشنل 4.6.99)

برازیل کے گول کیپر کو ''سینٹ'' (ولی اللہ) کا درجہ دے دیا گیا

حال ہی میں فرانس میں جو فٹ بال کے ورلڈ کپ کے مقابلے ہوئے اس میں برازیل کی ٹیم کے گول کیپر کلاڈیو (Claudio Taffarel) نے سیمی فائنل میچ میں ہالینڈ کی طرف سے ہونے والے دو گول روکے اور اس طرح برازیل کی ٹیم فائنل میں پہنچ گئی جہاں اس کا مقابلہ فرانس کی ٹیم سے ہوا۔

برازیل کے چرچ نے دو گول روکنے کو اس قدر اہمیت دی کہ انہوں نے کلاڈیو کو سیدھا (Canonise) کر دیا یعنی اسے عیسائی اولیاء اللہ (Saints) کی مسلمہ فہرست میں شامل کر دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ کلاڈیو بہت ہی بزرگ اور بابرکت وجود ہے کہ جس کے ہاتھوں نے اتنا بڑا معجزہ کر دکھایا۔

پاکٹ بائبل ڈکشنری میں Canon of Scripture کے ماتحت لکھا ہے:

لفظِ Canon سے مراد Straight Rod or Rule ہے جیسے ترکھان کا فٹ رول۔ لہذا ہر وہ چیز جو اس قابل سمجھی جائے کہ وہ دوسروں کی قدر و قیمت کو متعین کرے یا ان کو کسی باقاعدہ نظام کے تحت لائے اسے Canon کہتے ہیں۔ آسمانی کتب میں چونکہ عقائد و اعمال کے قوانین مذکور ہوتے ہیں اس لئے جو کتاب بائبل کا حصہ بننے کے لائق سمجھی جائے اسے

Canonical کہتے ہیں گویا وہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے......''۔

ڈکشنری کے مطابق Canonize کا مطلب ہے کہ سینٹ یا عیسائی اولیاء کی مسلمہ فہرست میں شامل کرنا۔اب گویا کلاڈیو بھی سینٹ میری کی طرح سینٹ کلاڈیو کہلائے گا۔

لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ فائنل میچ میں کلاڈیو فرانس کی ٹیم کی طرف سے ہونے والے گولوں کو نہ روک سکا (شاید خدا کو اس کا سینٹ بننا پسند نہیں آیا) لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ چرچ نے اس کے سینٹ ہونے کا فیصلہ برقرار رکھا ہے یا واپس لے لیا ہے۔

اب گویا بزرگی، تقویٰ اور خدا شناسی کا فیصلہ کھیل کے میدان میں ہوا کرے گا۔ جتنے زیادہ کوئی گول کرے گا یا مخالف ٹیم کے گول روکے گا وہ اتنا ہی پہنچا ہوا سمجھا جائے گا۔ یہ تو مذہب کو کھیل بنانے والی بات ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 4.9.98)

غریب امریکیوں کی درد کی دوا

امریکہ دنیا کا امیر ترین ملک اور واحد سپر پاور ہے لیکن ایک خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے غریبوں کے دکھ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔

اے پی کی خبر کے مطابق کم از کم سات عورتوں نے دعویٰ کیا ہے کہ بچہ پیدائش کے دوران انہیں بے ہوش کرنے والی دوا (Anesthesia) کی ضرورت پڑ گئی لیکن وہ انہیں محض اس لئے نہ دی گئی کہ ان کے پاس ڈاکٹر کو دینے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ ایک ماں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ درد سے تڑپتی ہوئی لوٹ پوٹ ہوتی رہی اور درد کم کرنے کی دوا دئے جانے کے لئے بصد عاجزی منتیں کرتی رہی لیکن سب بے سود۔

(سڈنی ہیرلڈ ۱۷ جون ۱۹۹۸ء)

امریکہ کے ڈاکٹر اپنی مجبوریاں بہتر سمجھتے ہونگے لیکن خبر سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کے نزدیک غریبوں کے درد کا وہی علاج مناسب ہے جو غالب نے تجویز کیا تھا کہ

ع ''درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا''

(الفضل انٹرنیشنل 4.9.98)

پہاڑوں کے جنگل نیلے کیوں نظر آتے ہیں؟

سڈنی کے قریب ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس کا نام نیلے پہاڑ (Blue Mountain) ہے اور یہ دیکھنے میں بھی نیلگوں لگتے ہیں۔ پروفیسر تھامس نے تحقیق کے بعد سراغ لگایا ہے کہ ان کے نیلے رنگ کی وجہ یہ ہے کہ کروڑوں یوکلپٹس (Eucalypus) درخت فضا میں کچھ ایسی گیسیں چھوڑتے ہیں جو منجمد سی ہو جاتی ہیں اور پھر سورج کی روشنی میں نیلے رنگ کی شعاؤں کو منعکس کرتی ہیں جن سے جنگل نیلے رنگ کے نظر آتے ہیں۔

جو گیسیں یہ درخت پیدا کرتے ہین ان میں ایک کا نام Isoprene ہے یہ ان کے پتوں کو ٹھنڈا رکھتی ہے اور ۴۰ درجہ سینٹی گریڈ حرارت پر بھی اس کی وجہ سے پتے محفوظ رہتے ہیں۔ سائنس دانوں نے مصنوعی طور پر ایسا انتظام کیا کہ درخت یہ گیس نہ چھوڑیں تو پتے ۳۷ درجہ سینٹی گریڈ پر ہی جلنے شروع ہو گئے۔ دوسری گیس جو یوکلپٹس پیدا کرتے ہیں وہ Cineole ہے یہ پتوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور حیوانوں کی طرح نباتات کو بھی خود حفاظتی کا دفاعی نظام عطا کیا ہے۔ اور اگر یہ نہ ہوتا تو ہم بھی زمین پر نہ ہوتے۔

(الفضل انٹرنیشنل 28.7.95)

جدید آلات جاسوسی

تمام حکومتیں ایک دوسرے کے خلاف ممکن حد تک جاسوسی میں لگی رہتی ہیں ۔ ہم خیال حکومتیں اس سلسلہ میں ایک دوسرے سے تعاون بھی کرتی ہیں اور پھر آپس میں بھی ایک دوسرے کی طرف کان اور آنکھیں کھلی رکھتی ہیں۔ یہ سائنس بھی روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ایک فائبر آپٹک کیبل (Fiber Optical Cable) کسی عمارت میں چھپا دی جاتی ہے یہ سگنل ایک بہت چھوٹی سی بیٹری کے ذریعہ ریڈیو ویوز (Radio Waves) کو ایک اور Repeater Box میں بھیجتی ہیں جو سینکڑوں میٹر دور رکھا ہوتا ہے وہاں سے آگے پھر وہ سگنل جاسوس وصول کرتا ہے لیکن اب جدید سسٹم میں کسی عمارت کے اندر یہ کیبل بچھانے کے لئے یا رکھنے کے لئے نہیں جانا پڑتا۔ یہ ۱۹۸۰ء کی باتیں ہیں اب اس طرح کے آلات استعمال ہوتے ہیں۔

☆Gas Loaded Laser یہ دیواروں کے باہر سے بھی دیکھ لیتا ہے اور عمارت کے اندر کی تصویریں اور بات چیت حاصل کر لیتا ہے۔

☆Radio Laser: اس کا حجم ایک عام قلم جتنا ہوتا ہے اور یہ ہزاروں میٹر دور کی باتیں نہایت صفائی سے سن لیتا ہے۔

☆ بہت چھوٹے سائز کے چینی کے آلات جن کے اندر سونے کے پتے ہوتے ہیں اس کا پتہ بھی نہیں لگایا جاسکتا اور کسی عمارت کے اندر ان کو چھپایا جا سکتا ہے۔

☆Russian Made Sonic Bug: اس کے متعلق ابھی کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

☆Burst Bug اس کا بھی پتہ نہیں لگ سکا کہ کیسے کام کرتا ہے لیکن اتنا پتہ ہے کہ یہ ۲۰

سیکنڈ کی بات کو اکٹھا کر کے فوراً اطلاع آگے پہنچا دیتا ہے۔

☆Infra Red Beams یہ کسی کھڑکی پر پھینکی جاتی ہے جو بات چیت کے ہلکے سے ارتعاش کو بھی دور بھیج سکتا ہے اور وہاں سے باتیں صاف سنی جاسکتی ہیں۔ اگر ان شعاعوں کو کسی کمپیوٹر پر پھینکا جائے تو جو کچھ اس کی سکرین پر ٹائپ ہو ایک نظام کے واسطے سے ہزاروں میل دور بیٹھے بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

اور ابھی تو یہ سلسلہ ہر آن ترقی پذیر ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

(الفضل انٹرنیشنل 28.7.95)

انسان کے حقیر خدمت گار

اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لئے ان گنت خدمت گار مقرر کر رکھے ہیں۔ ایسے لشکروں کے نام، کام اور تعداد کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اس وقت اس حقیر سی موٹی بھدی مکھی کا ذکر مقصود ہے جو گائے بھینس کے گوبر پر بیٹھا کرتی ہے۔

جب گائے کو آسٹریلیا میں پہلی بار لایا گیا تو اس کے گوبر پر بیٹھنے والی مکھی کو ساتھ لانا بھول گئے۔ اس طرف ذہن ہی نہیں گیا ہوگا کہ اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ چراگاہیں بنجر ہونی شروع ہوگئیں۔ جہاں گائے گوبر پھینکتی اس کے نیچے کا گھاس خشک ہونا شروع ہوجاتا۔ اور ہوتے ہوتے ساری چراگاہیں بنجر ہوگئیں۔ آخر حکومت کے تحقیقی ادارہ CSIRO نے ۱۹۶۸ء میں گوبر کی مکھی کی پچاس اقسام کو آسٹریلیا بھر کی چراگاہوں میں پھیلا دیا۔ یہ مکھی گوبر پر کام کر کے زمین کی غذائیت کو واپس زمین میں بھیج دیتی ہے۔ زمین کو کھود کر زرخیز رکھتی ہے۔ یوں آسٹریلیا کی چراگاہوں پر پلنے والی لاکھوں گائیاں اور ان سے حاصل ہونے والے گوشت، دودھ، مکھن اور پنیر میں ان لاکھوں مکھیوں کی محنت بھی شامل ہے جو بغیر معاوضہ کے خدمت میں مصروف ہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 28.7.95)

ایٹمی کلاک کو آسمانی کلاک سے ملانا

ایٹمی کلاک گو ہزاروں سالوں میں ایک سیکنڈ کا فرق ڈالتا ہے لیکن ہمارے دن رات اور سال وغیرہ تو نظام شمسی کے تابع ہیں اور مذکورہ بالا وجوہات کی بناء پر قدرتی وقت میں سال بھر میں ایک آدھ سیکنڈ کا فرق پڑ سکتا ہے۔ ہم نظام شمسی اور اس کے اوقات کے پابند ہیں اور یہ انسانوں کے لئے بنیادی وقت ہے جس سے وہ مستغنی نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ایٹمی کلاک کو ہر سال نظام شمسی کے کلاک کے مطابق کرنے کے لئے ایک آدھ سیکنڈ آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے۔ دونوں اوقات کو ایک کر کے جو ٹائم نکلتا ہے اسے UTC کہا جاتا ہے۔

ایٹمی کلاک کے وقت کو کتنا آگے پیچھے کرنا ہے اس کا فیصلہ فرانس میں قائم ایک بین الاقوامی ادارہ بنام Intemational Eargh Rotation Service کرتا ہے۔ ۳۰ رجون ۱۹۹۷ء کو رات بارہ بجے، جی ایم ٹی، ٹائم کو ایک سیکنڈ آگے کیا گیا تھا اور عین اس وقت دنیا بھر کی گھڑیوں کو بھی اس کے مطابق آگے کیا گیا تھا۔ اس وقت آسٹریلیا میں اگلے روز کے صبح کے دس بجے تھے اس وقت ٹیلیفون کمپنی نے ۹ بج کر ۵۹ منٹ اور ۶۱ سیکنڈ کا وقت بتایا۔ گزشتہ ۲۵ سال میں اس طرح ۲۱ سیکنڈ بڑھائے جا چکے ہیں۔ ابھی تک کبھی کم نہیں کئے گئے اور نہ مستقبل قریب میں ایسا امکان ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ تمام گھڑیاں سورج اور چاند کے ساتھ زمین کی نسبتی رفتار کے تابع ہی کرنی پڑتی ہیں اور یہ بات قرآن کریم میں بھی بتائی گئی تھی کہ **الشَّمسُ والْقَمرُ بِحُسْبَان** (الرحمٰن:۶) یعنی سورج اور چاند ایک مقررہ قاعدہ اور حساب کے تحت چل رہے ہیں۔ نیز ایک اور مقام پر فرمایا **فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيلَ سَكَناً وَالشَّمسَ وَالْقَمرَ حُسْبَاناً ذٰلِكَ تَقْدِيرُ**

الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُo(الانعام:۹۷)

یعنی وہ (خدا) صبح کو ظاہر کرنے والا ہے اور اس نے رات کو باعث آرام اور سورج اور چاند کو ذریعہ حساب بنایا ہے۔ یہ اندازہ اس کا ہے جو غالب ہے (اور) بہت جاننے والا ہے۔'' پس انسانوں کو اپنی سب گھڑیاں بالآخر نظام شمسی یعنی سورج اور چاند وغیرہ کے حساب کے ماتحت ہی کرنی پڑتی ہیں جیسا کہ خدا نے فرمایا۔ **صدق اللہ العظیم**

(الفضل انٹرنیشنل 14.8.98)

ریڈیو کاربن ڈیٹنگ

(Radio Carbon Dating)

عام طور پر یہ رائے باوثوق سمجھی جاتی ہے کہ آسٹریلیا کے قدیمی باشندے (Abrigines) یہاں پر قریباً چالیس ہزار سال سے رہ رہے ہیں۔لیکن پندرہ ماہ قبل سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے شمالی آسٹریلیا (Northern Territory) کے آثار قدیمہ کے مطالعہ کے بعد یہ دھماکہ خیز اعلان کردیا کہ گول دائروں کی شکل میں پتھروں پر کندہ نشانات کی عمر ایک لاکھ سولہ ہزار سال (1,16,000) سے لے کر ایک لاکھ چھہتر ہزار سال (1,76,000) سال تک ہے۔ یہ نشانات ہزاروں کی تعداد میں Jinmium کے علاقہ میں علاقوں کی حد بندی یا غاروں کی طرف رہنمائی کی غرض سے کبھی انسانوں نے بنائے تھے۔سائنسدانوں کے ایک دوسرے حصہ کو تحقیق کے نتائج سے اختلاف تھا۔ چنانچہ انہوں نے عمر معلوم کرنے کے جدید ترین ذرائع استعمال کر کے اب یہ کہا ہے کہ ان نشانوں کی عمر کم ازکم پانچ ہزار سال سے زائد تو ہرگز نہیں۔ وہ کہتے ہیں جن پتھروں پر یہ نشان بنے ہوئے ہیں وہ بھربھرے ہیں اور اصل نشانات میں ان ذروں کی آلودگی شامل ہوگئی ہے یعنی پتھروں کی اپنی عمر نے نشانات کی عمر کے اندازہ کو غلط کردیا ہے۔اس کے بالمقابل پہلی ٹیم کے سائنس دان کہتے ہیں کہ ہمارا اندازہ درست تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اندازہ میں اختلاف اور تاویل (Interpretation) بالکل ممکن ہے۔

وہ جدید طریق جس سے اندازہ لگایا گیا ہے وہ Optically Stimulated

Luminescence کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے جس کو خاص طور پر اس تحقیق کے لئے Refine کیا گیا تھا۔اس طریق سے موقع پر پائی جانے والی ریت (Quartz Sand) سے جو نمونے حاصل کئے گئے تھے ان کے ایک ایک ذرہ کی عمر علیحدہ علیحدہ معلوم کی گئی تھی۔ابھی ایک مزید تحقیق ہونا باقی ہے ان نشانات کے اوپر ایک ہلکی سی تہ کاربن کی بھی ہے۔ریڈیو کاربن طریق سے ان کی عمر نکال کر مزید توثیق کی جائے گی۔

(سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۶ء)

جس ریڈیو کاربن ڈیٹنگ (Radio Carbon Dating) کا خبر میں ذکر کیا گیا ہے وہ عمر معلوم کرنے کا ایسا طریق ہے جس کو امریکہ کے ایک سائنس دان willard F. Libby نے ۱۹۴۰ء کی دہائی میں ایجاد کیا تھا۔انہوں نے معلوم کیا کہ ہر جگہ کاربن بکھرا پڑا ہے اور اس میں ایک تھوڑا سا جزو ایسے کاربن ایٹم کا بھی پایا جاتا ہے جو Radio Active ہوتا ہے۔اسے Carbon 14 کہتے ہیں اور اس میں سے تابکاری یا ریڈیائی شعائیں خارج ہوتی ہیں (جس طرح ایٹم بم سے خارج ہوتی ہیں) ان شعاؤں کے اخراج کی رفتار ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔اور انہیں ایک آلہ کی مدد سے ماپا جاسکتا ہے۔یہ کاربن ۱۴ کا ایسا انحطاط ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ماہیت تبدیل ہوتی جاتی ہے۔یہاں تک کہ ۵۷۰۰ سالوں میں کاربن ۱۴ کے ذرات آدھے رہ جاتے ہیں۔اسی طرح ۱۱۴۰۰ سالوں میں چوتھا حصہ۔۲۲۸۰۰ سالوں میں آٹھواں حصہ اور ۴۵۶۰۰ سالوں میں صرف سولہواں حصہ باقی رہ جاتا ہے۔چونکہ پچاس ہزار سال کے بعد یہ مقدار بہت کم رہ جاتی ہے۔اس لئے یہ طریق قابل اعتبار نہیں رہتا۔اور زیادہ پرانی اشیاء کے لئے ان کی عمر معلوم کرنے کے لئے دوسرے طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم سب میں ریڈیو کاربن موجود ہوتی ہے۔ایسے ہی تمام حیوانوں اور درختوں پودوں وغیرہ میں بھی لیکن جب تک وہ زندہ ہوتے ہیں وہ ہوا اور غذا کے ذریعہ اس کمی کو پورا کرتے رہتے ہیں۔لیکن مرنے کے بعد جب غذا اور سانس کا سلسلہ بند ہوجاتا ہے تو اس کی کمی کو پورا کرنے کا سلسلہ بھی بند ہوجاتا ہے اور جتنی یہ جسم میں مرتے وقت موجود ہوتی ہے وہ تابکاری شعاؤں کے اخراج کی وجہ سے آہستہ آہستہ کم ہوتی رہتی ہے اور اس کمی سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ

انسان یا حیوان کو مرے یا درخت کو گرے ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا ہے۔

کائنات میں ہر چیز کی عمر کا ایک اندازہ مقرر ہے اور ذرہ ذرہ میں یہ امر ودیعت کیا گیا ہے کہ وہ کتنا عرصہ زندہ رہے گا یعنی اپنی صفات کو ظاہر کر سکے گا۔ ایک دائرہ کے اندر ایک Band Width مقرر کر دی گئی ہے۔ جو بتاتی ہے کہ اس کی طبعی عمر اس حد سے اس حد تک ہے۔ انسان کے ہر DNA میں اس کی طبعی عمر کا اندازہ موجود ہے۔ مثلاً خدا اگر اپنے کسی پیارے بندے کو بتائے کہ تمہاری عمر ۷۵ سے ۸۵ سال کے درمیان ہوگی تو ایک تو اس پر اس کے DNA میں مرقوم عمر کا انکشاف کیا گیا اور دوسرے یہ کہ کوئی حادثہ یا مہلک بیماری اسے اس کی طبعی عمر تک پہنچنے سے نہیں روک سکے گی۔ واللہ اعلم

اللہ کی قدرت ہے کسی نے ہزاروں سال پہلے پتھروں پر کوئی نشان بنائے اور آج یہ معلوم کیا جا رہا ہے کہ اس نے کب یہ معمولی سا کام کیا تھا۔ کل کو اسی مقام پر اس کا DNA بھی گرا پڑا دریافت ہو سکتا ہے جس سے اس بندے کی تصویر بھی سامنے آ جائے گی۔ خدا نے سچ ہی فرمایا تھا فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗo (الزلزال ۹،۸) یعنی جس نے ایک ایٹم کے برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اس (کے نتیجہ) کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ایٹم کے برابر بھی بدی کی ہوگی وہ بھی اس (کے نتیجہ) کو دیکھ لے گا۔ (استغفر الله ربی من کل ذنب واتوب الیه)

(الفضل انٹرنیشنل 14.8.98)

یونیورسٹی کے بگاڑے ہوئے شادی نے سنوار دیئے

واشنگٹن پوسٹ کے مطابق امریکہ کے مچیگن یونیورسٹی (Uni.of Michigan) کے شعبہ سوشل ریسرچ نے ۳۳۰۰۰ نوجوان طلباء وطالبات پر مبنی ایک مطالعاتی رپورٹ جاری کی ہے جس پر اٹھارہ سال تک ۱۹۷۶ءاور ۱۹۹۴ء کے درمیان کام ہوتا رہا۔ یہ رپورٹ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ انسانی نفسیات پر جو اثرات یونیورسٹی کے زمانہ کی بے مہابہ آزادی، شادی اور طلاق کے مرتب ہوتے ہیں ان کا اعداد وشمار کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔

یونیورسٹی کے زمانہ میں طلباء وطالبات کو بالغ ذمہ دار افراد سمجھا جاتا ہے اوران کو اپنے افعال وکردار کے معاملہ میں پوری آزادی دی جاتی ہے اوران سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بھی پوری ذمہ داری سے آزادی کے حق کو استعمال کریں گے۔ لیکن رپورٹ کے مطابق اکثر طلباء جو اپنے گھروں کو چھوڑ کر یونیورسٹیوں میں پڑھنے کے لئے جاتے ہیں وہ آوارگی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ وہ کثرت شراب نوشی، سگریٹ نوشی بلکہ ناجائز نشہ آور اشیاء کے استعمال کی بدعادات میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اپنے امتحانوں میں وہ پاس ہوتے ہیں یا نہیں اس کا تو رپورٹ میں کوئی ذکر نہیں لیکن یہ تاثر ضرور ملتا ہے کہ ان میں سے اکثر آزادی اور ذمہ داری کے درمیان توازن برقرار رکھنے کے امتحان میں فیل ہوجاتے ہیں۔ شاید ایسے ہی کالجوں کے بارہ میں اکبرالہ آبادی نے کہا تھا:

یوں قتل پہ بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ریسرچ سے پتہ لگتا ہے کہ وہ جن کو یونیورسٹی کی آزادی نے بگاڑ دیا تھا شادی کے بندھنوں نے انہیں سنوار دیا۔ منگنی، شادی اور بچوں کی پیدائش کے بعد اکثر نوجوان منشی اشیاء اور کثرت شراب

نوشی سے بچنے لگے۔ایسے لوگوں کی تعداد میں نمایاں طور پر کمی حیران کن تھی۔ چنانچہ اس کا نام انہوں نے "Marriage Effect" یا شادی کا اثر رکھا ہے۔شادی کے بعد کوکین اور میریوآنا Cocain and Marijuana) کا استعمال تو بہت ہی کم پایا گیا۔ یونیورسٹی کے زمانہ میں بھی شادی کا اثر عادات پر نمایاں تھا۔ جہاں ۴۱ فیصد غیر شادی شدہ طلباء وطالبات ڈرگز استعمال کرتے ہیں وہاں ایسے شادی شدہ افراد کی تعداد ۲۸ فیصد ہے البتہ سگرٹ کا معاملہ مختلف ہے۔وہ ایسا ڈھیٹ نکلا کہ اس نے شادی کا بھی کوئی اثر قبول نہیں کیا۔گویا شادی نے بڑے بڑے ٹیڑھے چلنے والوں کو سیدھا کر دیا۔بقول حالی۔

ے اے عشق تو نے سارے کس بل دئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

لیکن وہی لوگ جو شادی کے بعد سدھر گئے تھے وہ طلاق کے بعد پھر اپنی پرانی عادات کی طرف لوٹ گئے۔

ہر گھر ایک اینٹ کی طرح ہے جس سے معاشرہ کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔اینٹیں کچی ہونگی تو مکان کچا ہوگا۔ پختہ ہونگی تو پختہ ہوگا۔گھر کا ماحول خوشگوار اور سکون آور ہوگا تو مجموعی طور پر معاشرہ بھی خوشگوار اور سکون آور ہوگا لہذا معاشرہ کو خوشگوار بنانے میں خوشگوار گھریلو زندگی اور حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز یعنی طلاق سے بچنے کا کردار بہت نمایاں ہے.....آزادی اللہ کی بڑی نعمت ہے بشرطیکہ اسے حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کیا جائے۔احساس ذمہ داری ایک حد تک انسان کو حد اعتدال میں رکھتا ہے لیکن اگر خدا کا خوف نہ ہو تو یہ کھوکھلی ریت کی دیوار کی طرح ہے جس پر جب ذرا دباؤ پڑے تو ٹوٹ جائے۔ سچی بات یہی ہے کہ۔

ے ہر اک نیکی کی جڑ یہ اتقا ہے
اگر یہ جڑ رہی سب کچھ رہا ہے

(الفضل انٹرنیشنل 23.5.97)

مغربی دنیا میں جرائم بڑھ رہے ہیں

آسٹریلیا کے فیڈرل اٹارنی جنرل نے کہا ہے کہ ہم روز بروز زیادہ پر تشدد ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ ۳ مارچ ۱۹۹۷ء کو کینبرا میں جرائم کے موضوع پر ہونے والی ایک مجلس مذاکرہ میں تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۹۸۳ء اور ۱۹۹۵ء کے دوران یعنی بارہ سال کے عرصہ میں قاتلانہ حملوں میں ۲۵۵ فیصد اضافہ ہوا ہے (یعنی کوئی بیس فی صد سالانہ) اسی عرصہ میں جنسی حملوں میں ۱۶۲ فیصد اور ڈاکوں میں ۷۱ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اس کے بالمقابل ایک ماہر نے کہا کہ یہ کہنا درست نہیں کہ آسٹریلیا میں تشدد کی کوئی لہر آئی ہوئی ہے بلکہ سو سال پہلے کی نسبت آج آسٹریلیا کی گلیوں میں چلنا پھرنا زیادہ محفوظ ہے۔ ایک اور ماہر نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آسٹریلیا کا شمار دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی نسبت محفوظ ممالک میں ہونا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ جرائم کے لحاظ سے ہم صرف برطانیہ اور جاپان سے پیچھے ہیں۔ برطانیہ اور جاپان میں ہر سال ایک لاکھ کی آبادی میں ایک آدمی قتل ہوتا ہے جب کہ آسٹریلیا، کینیڈا اور جرمنی میں دو آدمی قتل ہوتے ہیں۔ سویڈن جو کبھی محفوظ ممالک میں شمار ہوتا تھا اب وہاں تین، سویٹزرلینڈ میں چار امریکہ میں آٹھ نو آدمی قتل ہوتے ہیں۔ گویا امریکہ قتل و غارت گری کے مقابلہ میں بھی اول آیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جتنا جتنا کوئی ملک مادہ پرستی میں ڈوبتا اور خدا سے دور ہوتا جائے گا اتنا اتنا ہی اس کا امن برباد ہوتا چلا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا کیا کرتے تھے (اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ) یعنی اے اللہ تو ہی ہے جو ہر نقص اور آفت سے پاک اور محفوظ ہے اور تو ہی ہر قسم کی سلامتی، حفاظت اور امن کا سرچشمہ ہے۔ لہذا جن ممالک کے امن دن بدن برباد ہو رہے ہیں ان کو یہی کہہ سکتے ہیں۔

ے منبع امن کو جو تو چھوڑ کے دور چل دیا
تیرے لئے جہاں میں امن ہو کیوں امان کیوں
(کلام محمود)

(الفضل انٹرنیشنل 23.5.97)

وہ چیڑ کے درخت جو پندرہ کروڑ سال پہلے مر چکے تھے از سرِ نو زندگی پا کر بازار میں بکنے لگے

اڑھائی سال قبل سڈنی کے نیشنل پارک میں ایک سیاہ رنگ کا پتھر ملا۔ تجزیہ سے معلوم ہوا کہ یہ کسی جانور کا اندرونہ ہے جس نے پندرہ کروڑ سال پہلے کسی چیڑ کے درخت کی شاخیں پتے وغیرہ کھائے تھے جو مرنے کے بعد اس کے جسم میں پڑے رہ گئے اور گل سڑ کر چورا بن گئے۔ اور پھر لمبا عرصہ گزرنے کی وجہ سے سیاہ رنگ کے پتھر کی شکل اختیار کر گئے یعنی Fossilize ہو گئے۔ تجزیہ کے نتیجہ میں اس چیڑ کے درخت کے زندہ DNA مل گئے جس کی نوع کسی طبعی حادثہ کے نتیجہ میں ختم ہو چکی ہوئی ہے۔ یہ درخت کروڑوں سال قبل سڈنی کے شمال مغربی علاقہ میں اگا کرتے تھے پھر لاکھوں سال پہلے کوئی ایسا حادثہ گزرا کہ ان کی نسل یا نوع ہی ختم ہو گئی۔ جو ڈی این اے حالت خواب میں پڑے مل گئے ان کو مناسب عمل کے ذریعہ بڑھا لیا گیا اور وہی چیڑ کے درخت اب دوبارہ اگ آئے ہیں۔ چونکہ یہ متحجر (Fossilized) پودہ وولمی نیشنل پارک سڈنی سے دستیاب ہوا تھا اس لئے اس کا نام وولمی پائن (Wollemi Pine) پیٹنٹ کیا گیا۔ یہ پودے اب اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ عنقریب ان کو پھل لگنا شروع ہو جائے گا اور پھر ان کے بیج سے آگے درخت اگائے جا سکیں گے۔ اب تک جتنے اگائے گئے ہیں ان میں بیج کو نہیں بلکہ بچے کھچے ذرات کو استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ حکومت کا متعلقہ محکمہ اب ایسے لوگوں کی تلاش میں ہے جو تجارتی بنیادوں پر اس پودے کو فروخت کریں۔ خواہشمند احباب کیمڈن سڈنی کے نزدیک Mount Annan Botanic

Garden میں ان پودوں کا معائنہ کر سکتے ہیں۔لیکن وہ کہتے ہیں ان کو اس قسم کے کام کا تجربہ ہونا چاہئے ۔اب تک کوئی ایک سوا دارے کاروبار میں دلچسپی ظاہر کر چکے ہیں ۔ ہر پودہ جو بکے گا اس پر متعلقہ محکمہ رائیلٹی وصول کرے گا۔تا اس ریسرچ پر جو خرچ اٹھا ہے اسے پورا کیا جا سکے۔

(ماخوذ از سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۱۵/ مارچ ۱۹۹۷ء)

اللہ کی قدرت ہے کہ وہ درخت جو کروڑوں سال پہلے مر چکے تھے بلکہ مرور زمانہ سے پتھر بن چکے تھے۔وہ ایک بار پھر زندہ ہو کر دنیا کو دعوتِ نظارہ وفکر دے رہے ہیں۔قرآن کریم نے انسانوں کو اپنی حیات اخروی کو حیات نو کے آئینہ میں دیکھنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔اور اس سے مشابہ قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا:

”.......اور ہم اس (پانی) کے ذریعہ سے مردہ ملک کو زندہ کرتے ہیں۔اسی طرح مرنے کے بعد نکلنا بھی ہوگا......“

(قٓ:۱۰)

نیز فرمایا:

”اور انہوں نے یہ (بھی) کہا ہے کہ جب ہم (مرکر) ہڈیاں ہو جائیں گے اور کچھ عرصہ بعد گل کر ہڈیوں کا (بھی) چورا بن جائے گا (تو ہمیں از سر نو زندہ کیا جائے گا اور) کیا واقعی ہمیں ایک نئی مخلوق کی صورت میں اٹھایا جائے گا؟ تو (انہیں) کہہ کہ تم (خواہ) پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی اور ایسی مخلوق جو تمہارے دلوں میں ان سے بھی سخت نظر آتی ہو (تب بھی تم کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا) یہ سن کر وہ ضرور کہیں گے (کہ) کون ہمیں دوبارہ (زندہ کر کے وجود میں لائے گا) تو (انہیں) کہہ کہ وہی (خدا) جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا.....“

(بنی اسرائیل ۵۰۔۵۲)

(الفضل انٹرنیشنل 25.7.97)

برطانیہ میں سائنس دانوں نے نو ہزار سال قبل فوت ہونے والے شخص کی زندہ اولاد کا سراغ لگالیا

برطانیہ کے سائنس دانوں نے ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے جس پر وہ بڑے فخر و انبساط کا اظہار کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انہیں ایک ایسے شخص کے پتھرائے ہوئے جسم کا پورا ڈھانچہ ملا تھا جو نو ہزار سال قبل فوت ہوا تھا اس کا نام Cheddar Man رکھا گیا تھا۔ سائنس دانوں نے اس کے ایک دانت کے گڑھے (Cavity) میں سے اس کا DNA حاصل کیا اور جاسوسی کے حیران کن طریقے استعمال کرتے ہوئے ایک ایسا شخص ڈھونڈ نکالا جس کا DNA فوت شدہ شخص کے DNA سے Match کرتا تھا وہ ۴۲ سالہ شخص تاریخ کا استاد ہے اور اس کا نام Mr.Adrian Targett ہے۔

یہ دنیا کا قدیم ترین شجرہ نسب ہے (ہمارے آدم سے تو پہلے کا ہے) اور ہے بھی اس شخص کا جو تاریخ کا استاد ہے۔

(رائیٹر بحوالہ سڈنی مارننگ ہیرلڈ۔ ۱۰/ مارچ ۱۹۹۷ء)

سائنس دانوں کو واقعی جاسوسی کے اس عظیم کارنامہ پر خوش ہونے کا حق ہے۔ مسٹر ٹارگیٹ کو بھی The Son of Soil جیسا کوئی خطاب ملنا چاہیئے جو قدیم ترین معلوم برطانوی ہیں۔ کسی نسل کا نو ہزار سال سے ایک ہی قطعہ زمین پر رہتے چلے جانا کوئی معمولی بات نہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 25.7.97)

ڈائنوساور کیسے ختم ہوئے؟

حال ہی میں میکسیکو کے ساحل کے نزدیک سمندر کی گہرائی میں ایک ایسا سیارچہ (Asteroid) دھنسا ہوا ملا ہے جو تقریباً بارہ میل لمبا تھا۔ یہ واقعہ کوئی ۶۵ ملین سال پہلے گزرا تھا۔ سیارچے کے گرنے سے ایک زبردست دھماکہ ہوا اور زمین سے اتنی گرد اٹھی کہ سارے آسمان پر گرد کی تہہ بن گئی۔ گرد کی چادر نے ایک خاصے عرصہ کے لئے سورج کی روشنی کو زمین پر آنے سے روک لیا جس کے نتیجے میں زمین اتنی سرد ہوگئی کہ وہ بڑے بڑے جسموں والے رینگنے والے جانور (چھپکلی کی شکل کے) جنہیں ڈائنوساور (Dinisaur) کہتے ہیں زندہ نہ رہ سکے۔ اب ان کے ڈھانچے اور بڑے بڑے انڈے جو لمبا عرصہ دبے رہنے سے پتھر بن گئے ہیں کہیں کہیں دستیاب ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں ڈائنوساور کے علاوہ دوسرے حیوانوں کی ستر فیصد انواع بھی اس سردی میں ختم ہوگئیں۔ جو تیس فیصد انواع بچ گئیں وہ بھی کوئی تیرہ ملین کے قریب بتائی جاتی ہیں۔ اللہ کی مخلوق کا کون شمار کرسکتا ہے۔

بے شمار سیارچے ہمارے سورج کے گرد اب بھی چکر لگا رہے ہیں۔ ان کی زیادہ تعداد مریخ (Mars) اور مشتری (Jupiter) کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔ خدا ہی ہے جو انہیں گرنے سے روکے ہوئے ہے اگر اس طرح کا کوئی پتھر زمین سے آٹکرائے تو موجودہ حیوانوں اور انسانوں کی بھی خیر نہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 25.7.97)

ٹیڑھی سوچ کا نتیجہ

خبر آئی ہے کہ آسٹریلیا میں ایسے بچوں کی تعداد میں دھما کہ خیز اضافہ ہو گیا ہے جو بن بیاہی ماؤں کے ہاں پیدا ہوتے ہیں۔ گزشتہ دس سالوں میں شادی کے بندھن کے باہر پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد میں ۷۰ فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ کل نومولود بچوں میں سے ۲۷ فیصد بن بیاہی ماؤں کے بطن سے جنم لیتے ہیں۔

(سڈنی ہیرلڈ ۱۴ فروری ۱۹۹۸ء)

ایک دوسری خبر یہ ہے کہ نیو ساؤتھ ویلز کی پولیس کے کمشنر نے اپنے ہم جنس پرست (Homosexual) پولیس افسروں کو ہم جنس پرستوں کے حالیہ میلہ (Mardi Gras) میں وردی سمیت شامل ہونے کی اجازت دے دی ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ قوم نے ہم جنس پرستی کو ایک جائز بنیادی حق کے طور پر تسلیم کر لیا ہے اس لئے ایسا رجحان رکھنے والے افسروں کو میلے میں شمولیت سے روکنا ان کو ان کے حق سے محروم کرنے کے مترادف ہوتا۔

جنسی بے راہ وری، ڈرگ کا استعمال، جوا شراب وغیرہ اور ان سے متعلقہ جرائم کی خبریں اس کثرت سے آتی ہیں کہ بلاشبہ مادہ پرستی نے مذہبی اقدار پر ایسا بھرپور حملہ کر دیا ہے جس کی تاریخ عالم میں مثال نہیں ملتی۔

نفس امارہ کی کارستانیوں کا یہ سیلاب ایسے ہی پیدا نہیں ہو گیا بلکہ ان رجحانات کو فروغ دینے میں ایک مخصوص فلسفہ، طرز فکر اور کلچر کا ہاتھ ہے۔ شروع میں تو اس فلسفہ کو مغربی ملکوں کے دانشوروں، فلاسفروں، ادیبوں، شاعروں، استادوں، آرٹسٹوں اور سیاسی و سماجی رہنماؤں نے تسلیم کر لیا اور اسے

اپنی زندگیوں میں جاری وساری کر دیا اور پھر ان کی دیکھا دیکھی عوام الناس بھی جو اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں وہ بھی اسی ڈگر پر چل پڑے۔ اگرچہ ان کی اکثریت ایسی تھی کہ انہوں نے فلسفہ کی کسی کتاب کو ہاتھ نہ لگایا تھا وہ فقط اس ماحول میں سانس لیتے تھے جس میں اس جدید فلسفہ کا دھواں بکھر چکا تھا۔ جدید فلسفہ کی وہ شاخ جس نے مغربی یا عیسائی کلچر کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اسکا بانی سگمنڈ فرائیڈ ہے۔

فرائیڈ نے کہا کہ انسانی ذہن کے دو حصے ہیں ایک شعور (Conscience) اور دوسرا لاشعور (Uncncience) ۔انسان شعوری طور پر جو بھی سوچتا ہے، خواہش کرتا ہے یا کوئی کام کرتا ہے اس کا اصل منبع و مرکز اس کا لاشعور ہوتا ہے۔ اس لاشعور کو اس کی جبلت یاInstinct بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں لاشعور کا نہ کوئی علم ہے نہ اس پر کوئی کنٹرول ہے۔ ہمیں اس پر آگاہی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ہم سے کوئی قول وفعل سرزد ہوتا ہے ۔ چونکہ ہم لاشعور کو کنٹرول نہیں کر سکتے اس لئے لاشعوری طور پر جب ہم کوئی کام کرتے ہیں تو ہم اس کے لئے ذمہ دار بھی نہیں ٹھہرائے جاسکتے ۔ لاشعور سے اٹھنے والی خواہشات (Desires) نے ہی ہمیں بتانا ہے کہ ہم کیا سوچیں اور کیا کریں۔ ہمارا شعور البتہ بہت چالاک ہے وہ ہماری پوشیدہ خواہشات کو اس طرز اور رنگ میں پیش کرتا ہے کہ سماج اسے قبول کرے۔ اس کوشعور کی تہذیبی کوشش (Sublimation) کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ لاشعور میں جو کھچڑی پکتی رہتی ہے اسکا ہمیں کوئی علم نہیں ہوتا البتہ ہمارے تمام شعوری کام اس کی ضمنی پیداوار (By-Product) ہوتے ہیں۔ ہمارے جذبات وخواہشات اوران کے زیر اثر واقع ہونے والے کام اس دھوئیں کی طرح ہیں جو اس آگ سے اٹھتا ہے جو ہمارے لاشعور میں بھڑک رہی ہے نہ آگ ہمارے بس میں ہے نہ دھواں ۔فرائیڈ کا لاشعور انسان کی جبلت (Instinct) کی طرح ہے یعنی انسان وحیوان دونوں کوئی کام اپنی جبلت کے خلاف نہیں کر سکتے ۔گویا فرائیڈ کے نزدیک انسان اپنے اعمال میں مختار اور آزاد نہیں بلکہ مجبور ہے ایسے ہی جیسے حیوان ہے۔

اس کے مقابلہ میں بعض دوسرے فلاسفر کہتے ہیں کہ انسان میں شعور کے علاوہ ارادہ (Will) کی قوت بھی پائی جاتی ہے۔ مانا کہ ہمیں لاشعور کی آگ پر اختیار نہیں لیکن اس سے اٹھنے والے دھوئیں پر ضرور ہے۔ انسانی جبلت میں ہر طرح کی خواہشات موجود ہوتی ہیں جو اکثر ایک

دوسرے سے متضاد بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک طالب علم کرکٹ کا بے حد شوقین ہے لیکن اتفاق سے میچ کے روز اس کا امتحان بھی ہے۔ وہ دونوں میں سے کوئی بھی چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ایک طرف میچ دیکھنے کی شدید خواہش، دوسری طرف امتحان پاس کرنے کی شدید خواہش۔ آخر وہ اپنا مجموعی بھلا امتحان پاس کرنے میں سمجھتا ہے تو اس کی خاطر کھیل کود کی خواہش کو قربان کر دیتا ہے۔ اسی کو ارادہ یا ضمیر کہتے ہیں۔ یہ انسانی ضمیر ہی ہے جو اس کو بتاتی ہے کہ کون سا کام اچھا ہے اور کون سا برا (یعنی اس کی فطرت میں فسق و فجور اور تقویٰ کی راہوں میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔) اخلاق کی بنیاد تعریف (Praise) اور ملامت (Blame) کے دوستونوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان اپنے عمل میں آزاد نہیں تو نہ وہ اچھے کام کی تعریف کا مستحق رہتا ہے نہ برے کام کی مذمت کا سزاوار اور اس طرح اخلاقیات کی عمارت ہی دھڑام سے گر جاتی ہے۔

مغربی کلچر کی بنیاد ہی گویا اس بات پر ہے کہ انسان اپنے لاشعور میں دبی ہوئی دلی خواہشات کے آگے بے بس ہے۔ لہذا اسے اپنے فکر و عمل میں مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔ وہ اپنے لئے خود ضابطۂ حیات وضع کر سکتا ہے اور اسے کسی آسمانی رہنمائی کی حاجت نہیں۔ اس سوچ کا نتیجہ مادہ پرستی اور نفسانی لذات کی بے محابا تسکین کی صورت میں نکلتا ہے۔ آسٹریلیا میں گزشتہ دس سال میں بن بیاہی ماؤں کے ہاں بچوں کی پیدائش میں ستر فیصد اضافہ بھی اسی سوچ اور کلچر کی ہی پیداوار ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 18.9.98)

قدرتی گھڑیاں

اڑھائی لاکھ ڈالر کی نیلم الیکٹرانک گھڑی:

پرتھ آسٹریلیا کے سائنس دانوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے دنیا کا سب سے زیادہ صحیح وقت دینے والا ٹائم پیس ایجاد کرلیا ہے۔اس کی صحت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ یہ ان ایٹمی گھڑیوں سے بھی ایک ہزار گنا زیادہ درست وقت بتاتا ہے جو دنیا کے بین الاقوامی معیاری وقت جی ایم ٹی (Greenwich Mean Time) کو ماپنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یہ گھڑی اس حد تک صحیح ہے کہ ایک سیکنڈ کے دس لاکھ اربویں حصہ (Millionth of a Billionth of a second) کو بھی ماپ سکتی ہے۔

زمین کی کشش ثقل (Gravity) سے وقت بدل جاتا ہے۔ چنانچہ زمین سے جتنا اونچا آپ اٹھتے جائیں گے وقت اتنا ہی تیزی سے گزرے گا۔گھڑی کے موجدوں کا دعویٰ ہے کہ یہ گھڑی ایک اونچی عمارت کی پہلی اور آخری منزل کے وقت کا فرق بھی بتا سکتی ہے(خواہ یہ سیکنڈ کا لاکھواں حصہ ہو) آئن سٹائن کے عمومی نظریہ اضافت (General Theory of Relativity) سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ انسان کے سر اور پاؤں کے درمیان بھی وقت کا فرق ہونا چاہئے۔اس تھیوری نے مطلق وقت (Absolute Time) کے تصور کو ختم کر دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں ہر جگہ ایک ہی جتنا وقت نہیں گزرتا۔اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ''خلا و وقت'' کا خط منحنی (Space-Time Curve) کشش ثقل (Gravity) کی وجہ سے ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور اس ٹیڑھے پن کی

وجہ سے وقت گزرنے کی رفتار پر بھی فرق پڑ جاتا ہے۔

یونیورسٹی آف ویسٹرن آسٹریلیا پرتھ کے پروفیسر David Blair نے کہا ہے کہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ہم ایک ایسی گھڑی بنائیں جو ایک میٹر کے فاصلہ کے وقت کے فرق کو بھی ظاہر کر سکے۔

اس گھڑی میں چونکہ نیلم ہیرا استعمال ہوتا ہے اس لئے اس Saphire Clock کہا جاتا ہے۔گھڑی کی صحت کا راز نیلم کی صفائی میں مضمر ہے۔ کہتے ہیں اگر نیلم کا کوئی بہت ہی شفاف کرسٹل ہو تو وہ صاف ترین شیشہ سے بھی ایک لاکھ گنا زیادہ شفاف ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے مائیکرو ویولہروں کے گزرنے کے لئے یہ شفاف ترین چیز ہے۔

اس گھڑی کے اندر ایک انسانی مٹھی کے سائز کا نیلم کا بنا ہوا سلنڈر رہوتا ہے جس میں مائیکرو ویولہریں داخل کی جاتی ہیں ۔ یہ لہریں اپنی صدائے بازگشت (Echo) پیدا کرتی ہیں جن کو ایک حساس آلہ (Detector) وصول کرتا ہے ۔ یہ آلہ اتنا حساس ہوتا ہے کہ یہ گیارہ ارب سائیکل (Cycle) (چکر) ایک سیکنڈ میں وصول کرسکتا ہے۔ان لہروں کو الیکٹرانک آلات کے ذریعہ گن کر وقت معلوم کیا جاتا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 31.7.98)

ایٹمی کلاک

آج کل دنیا کا معیاری وقت ''جی ایم ٹی'' ایٹمی کلاکوں سے ماپا جاتا ہے۔ یہ گھڑی جدید نیلم گھڑی سے صحت میں پیچھے ہوگی لیکن ان کا معیار بھی حیران کن ہے۔ ایٹمی گھڑی کئی ہزار سال میں صرف ایک سیکنڈ کا فرق ڈالتی ہے۔

سائنس دان کافی عرصہ سے اس تلاش میں رہے کہ وہ کوئی ایسا آلہ ایجاد کرسکیں جو بالکل صحیح وقت دے اور اس پر کشش ثقل، جگہ، حرکت، ٹوٹ پھوٹ اور درجہ حرارت کا اثر نہ ہو۔ یا بہت کم اثر ہو۔ ان سب سوالوں کا جواب انہیں خود ایٹم کے اندر ہی مل گیا۔ انہوں نے معلوم کیا کہ بعض عناصر (Elements) ایسے ہیں کہ ان میں سے جو لہریں خارج ہوتی ہیں وہ نہایت باقاعدہ اور منظّم اور عین بروقت ہوتی ہیں۔ اگر ان لہروں کی تعداد کو ماپا جاسکے تو وقت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سیزیم (Cesium) ایک ایسا عنصر ہے کہ اس میں سے ایک سیکنڈ میں نو ارب سے کچھ زائد (9,192,631,770) لہریں خارج ہوتی ہیں۔ چنانچہ لہروں کو گننے کے کاؤنٹر کے ذریعہ صحیح وقت معلوم کیا جاتا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 31.7.98)

نظام شمسی کا کلاک

کارخانہ عالم کا نظام اتنا منضبط اور باقاعدہ ہے کہ سب کام عین وقت پر سرانجام پاتے ہیں ایک گھڑی اس نظام شمسی کی ہے جس کا حصہ ہماری زمین ہے۔اس کے وقت کو Asronomically Defined Universal Time کہا جاتا ہے۔یعنی سورج اور چاند وغیرہ کی رفتار سے وقت ماپنا یعنی وہ نسبتی رفتار جو زمین اور سورج کے درمیان ہے اس سے وقت کا اندازہ لگانا۔ہماری زمین سورج کے گرد ایک سال میں چکر پورا کرتی ہے اس ایک سال کو Tropical Year یا کیلنڈر کا سال کہا جاتا ہے۔یہ سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۶ سیکنڈ کا ہوتا ہے۔لیکن ان سالوں میں سیکنڈ یا اس سے کچھ کم فرق پڑ جاتا ہے جس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً زمین اپنے محور کے گرد کبھی کبھی ''ڈگمگاتی'' ہے۔یہ اپنے محور (Axis) پر جھکی ہوئی ہے۔اس کا مدار (Orbit) سورج کے گرد گول نہیں بلکہ بیضوی (Ovel Shaped) ہے جس کی وجہ سے جب زمین سورج کے قریب ہوتی ہے تو نسبتاً زیادہ تیز دوڑتی ہے پھر زمین کے سمندروں پر چاند کی کشش ثقل (Gravity) سے مدو جزر پیدا ہوتا ہے اور جو لہریں اٹھتی ہیں ان کی باہمی رگڑ کی وجہ سے بھی زمین کی رفتار کچھ دھیمی ہو جاتی ہے۔زمین کے بطن (Core) میں جو مائع مادہ ہے اس کی وجہ سے بھی کبھی زمین کی حرکت بے قاعدہ ہو جاتی ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 31.7.98)

آپ جسمانی و ذہنی اعتبار سے کتنے پانی میں ہیں؟

یہ دور ہندسہ کا ہے جسے انگریزی میں Digital Age کہتے ہیں۔کوئی بھی چیز ہوا سے بالآخر ہندسوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔نظام کمپیوٹر کا ہو یا مواصلات کا ہر طرف ہندسے ہی چلتے ہیں اور تو اور اب تو انسانوں کی جسمانی و ذہنی صحت کو بھی ہندسوں کی زبان میں ادا کیا جانے لگا ہے۔بھرتی کرنے والے ادارے اب امیدواراں سے اس طرح کے کوائف طلب کرنے لگے ہیں ۔عمر،قد، وزن، بلڈ پریشر، عام حالات میں نبض کی رفتار،کولیسٹرول،عمر باعتبار صحت اور آئی کیو وغیرہ۔

عمر باعتبار صحت نکالنے کے لئے جن امور کو فارمولے میں ڈھالا جاتا ہے ان میں بلڈ پریشر کولیسٹرول،مشقت کے دوران نبض کی رفتار،قد اور وزن کی نسبت، ورزش یا سیر کی عادت،نشہ کی لت تمباکونوشی، الکوحل کا استعمال اور کسی دوا کا مستقل استعمال وغیرہ ہیں۔''عمر باعتبار صحت'' نکال کر اصل عمر سے موازنہ کر کے دیکھا جاتا ہے کہ صحت کا معیار اچھا ہے یا برا۔ پندرہ سال کا بچہ بیس سال کے جوان جتنا مضبوط ہوسکتا ہے۔اور کوئی ستر سال کا پچاس سال والے شخص جیسی ہمت و طاقت کا مالک بھی ہوسکتا ہے۔

اسی طرح ''عمر باعتبار ذہانت'' بھی نکالی جاتی ہے جسے آئی کیو (Intelligence Quotient) کہا جاتا ہے۔آئی کیو معلوم کرنے کے لئے بہت سے ٹیسٹ بنائے گئے ہیں جن میں امیدوار کی عقل وفہم میں تیزی، باریک بینی،قوت فیصلہ، قائدانہ صلاحیت اور رجحانات کا جائزہ لیا جاتا ہے اور جو'ذہنی عمر'اس طرح نکلتی ہے اس کا جسمانی عمر کے ساتھ مقابلہ کر کے آئی کیو نکالا جاتا ہے۔اگر آپ کی جسمانی و ذہنی عمر دونوں ایک ہی ہیں تو آپ دوسروں سے بہتر ہیں ۔اور اگر ۱۴۰ ہے تو لوگ

آپ کی ذہانت سے ڈرنا شروع ہو جائیں گے اور آپ کے سامنے سنبھل کے بات کریں گے۔

جب یہ سارے جسمانی و ذہنی ٹیسٹ مکمل ہو جائیں گے تو آپ کی شخصیت کچھ اس طرح بیان کی جائے گی: ۲۵۔۱۷۰سم ۶۰ کے جی ۸۰/۱۳۰۔۷۲۔۴۔G۔۱۲۵ جس سے مراد یہ ہوگا کہ آپ کی عمر ۲۵ سال۔ قد ۱۷۰ سنٹی میٹر۔ وزن ۶۰ کلوگرام۔ بلڈ پریشر ۱۳۰/۸۰ نبض ۷۲، کولیسٹرول ۴، صحت کا معیار باعتبار عمر Good یعنی اچھا۔ ذہانت کا معیار باعتبار عمر ۱۲۵۔ تو دیکھا کہ کس طرح آپ کی جسمانی و ذہنی صحت چند ہندسوں میں ڈھل گئی ہے یعنی Digitise ہوگئی ہے۔ اب ایمپلائر آسانی کے ساتھ آپ کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کا دوسروں سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ اتنا ہو چکنے کے بعد پھر تعلیم و تجربہ کو بھی اسی طرح ہندسوں میں تبدیل کر کے نوکری ملنے یا نہ ملنے کا فیصلہ ہوگا۔ بڑھتی ہوئی بے کاری کے دور میں نوکری حاصل کرنا بھی جوئے شیر لانا ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 11.7.97)

ان گنت مخلوق جو انسان کی خدمت پر مامور ہے

سمندر کے اندر موجود نوے فیصد مخلوق اتنی چھوٹی ہے کہ ہم ننگی آنکھ سے اسے دیکھ نہیں سکتے اس کا سائز ایک ملی میٹر کے دسویں حصہ سے لے کر اس کے ہزارویں حصہ تک ہوتا ہے۔ ایک ایک خلیہ والی مخلوق (Single Cell Organism) جس کو Protist کہتے ہیں اسے خوردبین سے دیکھیں تو ان کی عجیب و غریب اور پیچیدہ ڈیزائن والی شکلیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ کوئی لمبوتری گاجر جیسی، کوئی بالکل گول، کوئی دائرہ کے باہر چھ پہلوؤں والی، کوئی گلوب یا ٹوکری جیسی شکل کی۔ سمندر سے ایک گلاس پانی کا لیں تو اس میں یہ کئی کروڑ کی تعداد میں پھدکتی نظر آئیں گی۔

پچھلے چودہ سال سے آسٹریلیا کی ایک خاتون سائنسدان ان پر تحقیق کر رہی ہیں۔ Fiona Scott کا کہنا ہے کہ اگر یہ ننھی مخلوق نہ ہوتی تو سمندری جانوروں کے لئے خوراک نہ ہوتی اور زمین کی جاندار مخلوق کو آکسیجن نہ ملتی۔ وہ کہتی ہیں کہ سمندری حیات کے لئے (جس پر انسانوں کا دارومدار ہے) خوراک کی تیاری کے سلسلہ کا آغاز اسی ننھی مخلوق سے ہوتا ہے۔ دوسرا بہت اہم کام جو یہ سرانجام دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ تمام ذی حیات مخلوق جو کاربن ڈائی آکسائیڈ اپنے سانس وغیرہ کے ذریعہ بناتی ہے اس کے نصف حصہ کو دوبارہ آکسیجن میں تبدیلی کرنے کا عظیم کارنامہ بھی یہی ننھی مخلوق سرانجام دیتی ہے۔ یہ انہیں کی پیدا کردہ آکسیجن ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں Fiona Scott ان جانداروں کو ''آکسیجن انجن'' کا نام دیتی ہیں (اگر زمین کی ۵۰ فیصد کاربن ڈائی آکسائیڈ فضا میں جمع ہوتی رہے اور دوبارہ آکسیجن میں تبدیل نہ ہو تو زندہ مخلوق شاید دم گھٹ کر مر جائے۔ اس لئے جب سمندروں کے دوسرے فوائد پر غور کریں تو ان میں بسنے والی اس ننھی مخلوق کو بھی یاد کرنا نہ بھولیں)

(ماخوذ از سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۰؍اپریل ۲۰۰۵ء)

خدا کی قدرت ہے کہ جس طرح سمندروں کی ۹۰ فیصد مخلوق نظر نہیں آتی مگر عظیم کارنامے سرانجام دیتی ہے اسی طرح کائنات میں بکھرا ہوا ۹۰ فیصد مادہ ایسا ہے جو کرّوں کی شکل میں تو نہیں ڈھلا مگر کائنات کے استحکام میں کئی طریق سے اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ پھر ہر پودہ جو اناج، سبزہ یا پھل وغیرہ کا اگتا ہے اس کی جڑوں میں کروڑوں ننھے مزدور کام کر رہے ہوتے ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتے مگر مٹی سے ان پودوں کے لئے غذا تیار کرتے ہیں۔ اسی لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ بتاؤ تو جو کچھ تم بوتے ہو ان کو تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ خدا کی مخلوق پر جتنا بھی غور کیا جائے دل سے یہی آواز آتی ہے کہ اے خدا! تیرا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً. سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّار

(آل عمران:۱۹۱)

(الفضل انٹرنیشنل 17.6.05)

توہم پرستی کی بلا

توہم پرستی عموماً جہالت اور شرک کی پیداوار خیال کی جاتی ہے اور یہ دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی ہے۔سڈنی کے علاقہ ولوبی (Willoughby) میں چینی آبادکاروں کی تعداد ہر پانچ سال میں دگنی ہو رہی ہے۔انہوں نے کونسل سے مطالبہ کیا ہے کہ ہمارے مکانوں اور گلیوں سے نمبر چار ختم کر دیا جائے کیونکہ وہ اسے منحوس سمجھتے ہیں۔چینی زبان میں ۴ کا عدد اور ''موت'' کا لفظ صوتی لحاظ سے باہم اتنے ملتے جلتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ میں چار نمبر کے مکان میں رہتا ہوں تو وہ سمجھے گا یہ کہہ رہا ہے کہ موت گھر میں رہتا ہوں۔اسی طرح اگر چینی اپنی زبان میں کہے کہ میں گلی نمبر ۴ میں رہتا ہوں تو سننے والا یہ خیال کر سکتا ہے کہ شاید اس نے ''کوچہ مرگ'' میں ڈیرہ ڈال لیا ہے۔چنانچہ چینی آبادکاروں کا مطالبہ کونسل کے اجلاس میں پیش کیا گیا جس پر سخت تنقید کی گئی کہ عام طریق سے محض وہم کی بناء پر ہٹنا اکثریت کو چینیوں کے خلاف انگیخت کرنے والی بات ہے اور نظم و نسق میں بعض مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔چنانچہ کونسل کو کہا گیا کہ اپنے وہم کا علاج جادو ٹونے کرنے والے عاملوں سے کرائیں، کونسل ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔چینیوں کے اکابر نے کہا کہ نمبر چار کی نحوست دور کرنے کا علاج اس طریق سے ممکن ہے کہ دروازے پر تعویذ ٹونا باندھ دیں۔ایک آئینہ لٹکا دیں۔کچھ ہم آہنگ گھنٹیاں باندھ دیں یا مکان کے نمبر کو سرخ پس منظر میں لکھ دیں۔چنانچہ کونسل سے مایوس ہو کر اب ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ باندھنے والے عاملوں کو تلاش کیا جا رہا ہے۔

مختلف قوموں اور ملکوں میں کئی دلچسپ قسم کے وہم رائج ہیں۔صبح گھر سے کام پر جانے کے لئے نکلتے ہیں تو پیچھے سے کسی نے بلا لیا تو آپ کا کام نہیں ہوگا۔اگر پہلا گاہک ادھار مانگے یا جھگڑا

کرے تو سارا دن خراب گزرے گا۔ اگر کالی بلی نے رستہ کاٹ لیا تو کام نہیں ہوگا۔ خرگوش کے پنجے پر ہاتھ رگڑنا خوش قسمتی کی علامت ہے۔ صبح آٹا گوندھتے ہوئے باہر گر جائے تو مہمان آئے گا۔ چھینک آنا بھی منحوس خیال کی جاتی ہے۔ اگر لکڑی کو کھٹکھٹائیں یا سیڑھی کے نیچے سے نہ گزریں تو بری قسمت بدل سکتی ہے۔ اتوار کے روز پیدا ہونا خوش قسمتی کی علامت ہے۔ اگر شادی کے روز تقریب کے انعقاد سے پہلے دولہا دلہن ایک دوسرے کو دیکھ لیں تو براشگون ہے۔ جب آدمی مرتا ہے تو کھڑکیاں دروازے کھول دیں تا روح کو باہر نکلنے میں دقت نہ ہو۔ نوزئیدہ بچہ کی پہلی بار سیڑھیوں کے ذریعہ اوپر لے جایا جائے نہ کہ نیچے۔ کسی کو بٹوہ تحفہ میں دیں تو خالی نہ ہو کچھ نہ کچھ رقم اس میں ضرور ہو ورنہ ہمیشہ ہی بٹوہ روپے سے خالی رہے گا۔ کئی لوگ سفر ۱۳ تاریخ کو یا جمعہ کے روز شروع نہیں کرتے۔ ہوٹلوں میں ۱۳ نمبر کا کمرہ کئی بار خالی رہتا ہے۔ جاپانی بھی چینیوں کی طرح چار کا عدد منحوس خیال کرتے ہیں۔ اگر شادی کے مہمان نئے شادی شدہ جوڑے پر چاول پھینکیں تو ان کے ہاں بچے بہت ہونگے۔ شیشہ توڑنا یا نمک گرانا بدقسمتی کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ ایک دیا سلائی سے تین سگریٹ سلگھانا بھی منحوس ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہم کی ایک شکل ”آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں۔“ کی ہے۔ بہرحال ہمارے پیارے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان سب وہموں سے آزاد کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ جب بھی کوئی اچھی یا بری شگون والی بات دیکھیں یا سنیں تو دعا کریں کہ

”اَللّٰھُمَّ لَا طَیْرًا اِلَّا طَیْرُکَ وَلَا خَیْرُاِلَّا خَیْرُکَ وَلَا حَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ“

کہ اے اللہ وہی بدشگونی ہے یا خیر ہے جو تیری طرف سے آئے اور تیری ہی ایک طاقت ہے جو ہمیں شر سے بچا سکے اور ضرر پہنچا سکے۔ یعنی تیرے سوا کسی چیز میں کوئی ذاتی خیر وشر نہیں ہے اور اس دعا سے ہر وہم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ **الحمد للہ**۔

(الفضل انٹرنیشنل 20.9.96)

حصہ دوم

مضامین متفرقہ

حضرت عزیر علیہ السلام

یہود کا ایک فرقہ عزیر کو ابن اللہ مانتا تھا:

حضرت عزیر علیہ السلام کو یہود میں ان کی خدمات کے سبب ایک خصوصی مقام حاصل تھا اور ان کے اس حد تک معتقد تھے کہ ان کے ایک فرقہ نے انہیں خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا۔ بنی اسرائیل اپنے خاص مذہبی محاورہ میں ہر اس شخص کو استعارۃً ابن اللہ کہہ دیا کرتے تھے جو ان کے نزدیک خدا کو ایسا پیارا ہوتا جیسے ایک باپ کو اسکا بیٹا ہوتا ہے اور جو خدا کی صفات اور قدرت کا مظہر ہوتا چنانچہ ان معنوں میں بائیبل میں اسرائیل۔ افرائیم۔ داؤد۔ سلیمان۔ آدم اور عیسیٰ علیہم السلام کو ابن اللہ کہا گیا ہے (دیکھیں Exodus 4:23, Jeremiah 31:9, Psalms 2:7, I.Chronicles 22:10, Luke 3:38, John 3:16, Romans 8:41, IJohn 5:1)

قرائن سے پتہ لگتا ہے کہ یہود اسی مروجہ اصطلاح میں حضرت عزیرؑ کو بھی استعارۃً ابن اللہ کہتے ہوں گے مگر رفتہ رفتہ (عیسائیوں کی طرح) ان کے ایک حصہ نے ان کو حقیقی معنوں میں ابن اللہ کہنا شروع کر دیا۔ مگر جس طرح مذہب۔ فرقے بنتے مٹتے رہتے ہیں یہ فرقہ بھی مرور زمانہ سے مٹ گیا اور آج یہودیوں میں سے کوئی انہیں خدا کا بیٹا نہیں مانتا۔

حضرت عزیر کو ابن اللہ کہنے کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ملتا ہے:

”اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ محض ان

کے منہ کی باتیں ہیں ۔ یہ ان لوگوں کے قول کی نقل کر رہے ہیں جنہوں نے (ان سے پہلے) کفر کیا تھا۔ اللہ انہیں نابود کرے یہ کہاں الٹے پھرائے جاتے ہیں‘‘ (التوبہ:۳۰) اس آیت میں یہ پیشگوئی مضمر ہے کہ جس طرح عزیز کو ابن اللہ کہنے والے نابود ہو چکے ہیں اسی طرح یہ بھی مقدر ہے کہ عیسٰیؑ کو ابن اللہ کہنے والے بھی نہیں رہیں گے وہ بھی اس عقیدہ کو انہیں کی طرح بیزار ہو کر ترک کر دیں گے۔

چونکہ آج کل یہود عزیر کو ابن اللہ نہیں کہتے اس لئے بعض معترضین اسلام کہتے ہیں کہ قرآن نے ایک خلاف حقیقت بات کہہ دی ہے ۔اس اعتراض کا جو جواب حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے دیا ہے وہ درج ذیل ہے:

حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ فرماتے ہیں:

’’دنیا میں کئی مذاہب آتے ہیں پھر مٹتے ہیں۔ ایک فرقہ تھا یہود سے وہ حضر موت (غربی کنارہ یمن) میں رہتا تھا وہ عزیر کو ابن اللہ کہتے تھے ہجری چوتھی صدی تک ان کا بقایا رہا ہے پس یہ اعتراض نہیں چاہئے کہ اب تو یہود نہیں کہتے عزیر ابن اللہ تھے کیونکہ دنیا میں ایسا ہوتا آیا ہے ۔ دیکھو قسطلانی داؤد ظاہری۔

لیث کے متبعین اب نہیں پائے جاتے مگر کتابوں میں ان کا ذکر ہے۔

(نوٹس درس القرآن فرمودہ حضرت خلیفۃ المسیح اول۔ مطبوعہ قادیان اکتوبر ۱۹۳۲ء۔ صفحہ ۲۶۳)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ فرماتے ہیں:

’’عزیر یا عزرا (Ezra) پانچویں صدی قبل مسیح میں گزرے ہیں۔ آپ سیرائیاہ (Seraiah) کی نسل میں سے تھے جو اپنے وقت کے بڑے دینی پیشوا (High Priest) تھے۔ آپ خود بھی دینی پیشوائی سلسلہ کے رکن تھے اور بطور ’’دینی پیشوا عزرا‘‘ (Ezra,the priest) کے جانے جاتے تھے۔ وہ اپنے زمانہ کی اہم ترین شخصیات میں سے تھے۔ اور ان کی شخصیت نے یہودی مذہب کی نشو ونما پر ایک دور رس اثر پیدا کیا۔ انبیاء بنی اسرائیل میں انہیں

عزت کا ایک خاص مقام حاصل تھا۔ مدینہ کے یہود اور حضر موت کا ایک یہودی فرقہ انہیں خدا کا بیٹا مانتا تھا یہودی علماء ان کا نام کئی اداروں سے منسوب کرتے ہیں۔ (قرآن مجید انگریزی مرتبہ ملک غلام فریدؒ۔ ترجمہ نوٹ ۱۱۷۶)

رینن (Renan) نے اپنی کتاب History of the People of Israel کے دیباچہ میں یہ رائے دی ہے کہ یہودیت کے معین ڈھانچہ (قانون) کا آغاز صرف عزرا کے وقت سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں کے ریکارڈ کے مطابق تو عزیزؑ کو اس قابل خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اگر شریعت پہلے ہی موسیٰؑ کی معرفت نہ دے دی گئی ہوتی تو عزرا کا یہ مقام تھا کہ ان کو اس کے لانے کا ذریعہ بنایا جاتا۔ انہوں نے نحمیاہؑ کے ساتھ مل کر کام کیا اور بابل کی سلطنت میں ۲۱۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(جیوش انسائیکلو پیڈیا و انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا بحوالہ نوٹ ۱۱۷۶ بر صفحہ ۴۰۲ ترجمہ وتفسیر انگریزی)

باوجودیکہ یہ آیت (سورۃ توبہ) مدینہ میں نازل ہوئی تھی لیکن مدینہ کے یہود نے کبھی یہ اعتراض نہیں کیا تھا کہ وہ عزیر کو ابن اللہ نہیں مانتے اس لئے کہ وہ ایسا اعتقاد رکھتے تھے۔

حضرت عزیرؑ کی بعثت کا تاریخی پس منظر

حضرت عزیر علیہ السلام اسرائیلی تاریخ کے جس نازک موڑ پر مبعوث ہوئے تھے اس کے پس منظر کے بیان سے ان کے کاموں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

کنعان (فلسطین) کی ابتدائی تاریخ کے مطابق آج سے تقریباً ۴۵۰۰ سال پہلے (۲۵۰۰ ق) عرب سے سامی (Semite) نسل کے قبائل وہاں آباد ہوئے تھے۔ یہ پتھر کا زمانہ تھا چنانچہ اس زمانہ کے کئی ہتھیار یروشلم کے قریب سے دریافت ہو چکے ہیں۔ تقریباً ۱۴۰۰ سال قبل مسیح میں یروشلم کا علاقہ مصریوں کا باجگزار بن چکا تھا (Encycl, Britanica VOL13,P7)

اس وقت تک نہ اسرائیلی قوم ابھی وجود میں آئی تھی نہ اسماعیلی۔ اسکے قریباً ۵۰۰ سال بعد (۲۰۰۰ ق م) میں ابراہیم علیہ السلام اپنے شہر اُور (Ur) سے جو جنوبی عراق میں واقع تھا ہجرت کر کے یروشلم (بیت المقدس) میں آباد ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے ماتحت آپ نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے ساتھ مل

کر خانہ کعبہ کو اس کی پہلے سے موجود بنیادوں پر دوبارہ کھڑا کیا اور اس واقعہ کے چالیس سال بعد آپؑ نے اپنے دوسرے بیٹے اسحقؑ کے لئے بیت المقدس میں خانہ کعبہ کی ظلّیت میں ایک ''بیت ایل'' (مسجد) تعمیر کی۔ چونکہ آپ نے ایسا خدا کی منشاء کے مطابق کیا اس لئے وہ جگہ ارض مقدس یا ارض حرم قرار پائی اور یہی مسجد بنی اسرائیل کے انبیاء کا قبلہ ٹھہری۔ یہی وجہ ہے کہ بیت المقدس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی قرآن اور بائیبل کے مطابق ارض حرم کا درجہ رکھتا تھا چنانچہ قرآن کے مطابق انہوں نے بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''اے میری قوم! ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ رکھی ہے....(المائدہ:۲۲)

بائیبل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ فلسطین کو ارض حرم یقین کرتے تھے چنانچہ وہ اپنی نظم میں کہتے ہیں کہ اے خدا تو نے رحم کرتے ہوئے جن کو نجات دلائی تھی اپنی طاقت سے ارض مقدس کی طرف ان کی رہنمائی کی (Exodus15:13)۔

صحیح بخاری صفحہ ۷۷ پر ایک حدیث درج ہے جس میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ مسجد حرام اور مسجد اقصےٰ کے ایّام بناء میں کس قدر فاصلہ ہے تو آپ نے فرمایا چالیس برس کا۔ لیکن دوسری طرف صحیح روایات سے ثابت ہے کہ کعبہ کے بانی حضرت ابراہیمؑ ہیں اور بیت المقدس کے بانی حضرت سلیمانؑ ہیں (جو حضرت موسیٰ کے قریباً پونے پانچ سو سال بعد میں آئے تھے) ان دونوں حدیثوں کی تطبیق اسی صورت میں ہو سکتی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ یعنی خانہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ حضرت سلیمانؑ نے تعمیر تو اسی مقام پر کی تھی۔ اس ارض مقدس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں اپنے اس وعدہ کا ذکر فرماتا ہے جو اس نے داؤد علیہ السلام کے ذریعہ زبور میں دیا تھا۔ فرمایا:

''اور یقیناً ہم نے زبور میں ذکر کے بعد یہ لکھ رکھا تھا کہ لازماً موعود زمین کو میرے صالح بندے ہی ورثہ میں پائیں گے،، (الانبیاء:۱۰۶)۔ زبور کی جس پیشگوئی کا اس آیہ کریمہ میں ذکر ہے وہ ان الفاظ میں آتی ہے:

”صالح (The Rightious) اس زمین (ارض مقدس) کے
وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے“ (Psalms 37:29)

لیکن اس زمین پر جو لوگ فساد برپا کریں گے وہ سزا پائیں گے۔ چنانچہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو واضح طور پر بتا دی تھی کہ تم زمین میں دوبارہ عظیم فساد برپا کرو گے اور اس کی پاداش میں تم تباہ برباد ہو گے۔ اسکا ذکر سورہ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں آیا ہے۔ جہاں فرمایا:

”اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کو اس قضا سے کھول کر آگاہ کر دیا تھا کہ تم ضرور زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے اور یقیناً ایک بڑی سرکشی کرتے ہوئے چھا جاؤ گے“ (بنی اسرائیل:۵) ان دو عذابوں کا ذکر قرآن مجید کی ایک اور آیت میں بھی ہے۔ جہاں فرمایا:

”جن لوگوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا وہ داؤد کی زبان سے لعنت ڈالے گئے اور عیسےٰ ابن مریم کی زبان سے بھی۔ یہ ان کے نافرمان ہو جانے کے سبب سے اور اس سبب سے ہوا کہ وہ حد سے تجاوز کیا کرتے تھے“
(المائدہ:۷۹)

اس پیشگوئی کے مطابق داؤدؑ کے ۴۰۰ سال بعد بابل کے بادشاہ Nebuchadnezzar (بخت نصر) نے ۵۸۸ تا ۵۸۶ قبل مسیح کے درمیان یروشلم کو تباہ کیا اور دوسری بار ۸۶ عیسوی میں ٹائٹس (Titus) رومی نے یروشلم کو تباہ کیا۔

پہلی تباہی کے تقریباً سو سال بعد حضرت عزیر علیہ السلام واپس بیت المقدس آئے۔ یہ واقعہ بائبل میں 2Kings,Ch25 میں بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق نبوکدنضر نے یروشلم پر چڑھائی کی اور ۵۸۸ قبل مسیح میں فلسطین کے دارالخلافہ یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کے اندر جب غلہ کم ہو گیا تو ۵۸۶ ق م میں شہر کی دیوار توڑ دی گئی۔ اس وقت یروشلم کا بادشاہ صدقیاہ تھا وہ بھاگ اٹھا مگر پکڑا گیا اس کی آنکھیں نکالی گئیں اور آنکھیں نکالنے سے پہلے اس کے بیٹوں کو اس کے سامنے ہلاک کر دیا گیا۔ پھر اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر اسے بابل لے گئے۔ (آیت ۴ تا ۷)

بابل کے بادشاہ نے خداوند کا گھر۔ بادشاہ کا محل۔ ہر رئیس کا مکان بلکہ ہر گھر جلا دیا۔ یروشلم کے اردگرد کی دیواروں کو گرادیا۔ یہودیوں کی مقدس کتابیں بھی جلا کر راکھ کر دی گئیں۔

بائبل کے مٹنے کے بعد حضرت عزیرؑ نے اپنی یادداشت کی بناء پر دوبارہ لکھا:

حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ بائبل کی تاریخ کے اس اہم ترین واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''تورات کی اندرونی شہادت سے یہ امر ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کتاب مٹ گئی تھی اور اس کے مٹنے کا باعث یہ ہوا کہ چھٹی صدی قبل مسیح یعنی چودھویں صدی ابراہیمی کے آخر میں جب بخت نصر نے بیت المقدس کو جلا دیا تو تورات کی مقدس کتابیں بھی جل گئیں اور یہود قید ہو کر بابل میں لے جائے گئے جہاں ستر سال تک قید رہے۔ اس اسیری کے بعد وہ رہا ہوئے اور حضرت عزیرؑ جن کی کتاب پرانے عہد نامہ میں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی تدوین دیگر احبار سمیت کی اور اپنی یادداشت کی بناء پر اسے لکھا۔

حضرت عزیر کے نام سے ایک اور کتاب عیزڈراس (Esdras) یونانی زبان میں موجود ہے جو حضرت عزیر کی اس کتاب کے علاوہ جو پرانے عہد نامہ میں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب موجودہ بائبل کی کتابوں میں شامل نہیں مگر بائبل سے کسی درجہ کم معتبر نہیں چنانچہ بائبل کا جو ضمیمہ بعد میں مرتب ہوا ہے اس میں عیزڈراس کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اس کتاب کی دوسری کتاب کے چودھویں باب کو پڑھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح حضرت عزیرؑ نے اپنے پانچ ساتھیوں سمیت چالیس دن تک تورات کو دوبارہ لکھا۔ کتاب مذکور کے چودھویں باب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہے۔ لکھا ہے:

> ''دیکھو اے خدا میں جاؤں گا جیسا تو نے مجھے حکم دیا ہے اور جو لوگ موجود ہیں ان کو فہمائش کروں گا۔ لیکن جو لوگ کہ بعد کو پیدا ہوں گے ان کو کون فہمائش کرے گا۔ اس طرح دنیا تاریکی میں ہے اور جو لوگ اس میں رہتے ہیں

بغیر روشنی کے ہیں کیونکہ تیرا قانون جل گیا۔ پس کوئی نہیں جانتا ان چیزوں کو جو تو کرتا ہے اور ان کاموں کو جو شروع ہونے والے ہیں ۔لیکن اگر مجھ پر تیری مہربانی ہے تو تو روح القدس کو مجھ میں بھیج اور میں لکھوں تمام جو کہ دنیا میں ابتدا سے ہوا ہے اور جو کچھ تیرے قانون میں لکھا تھا تا کہ تیری راہ کو پاویں اور وہ لوگ جو اخیر زمانہ میں ہوں گے زندہ رہیں اور اس نے مجھ کو یہ جواب دیا کہ جا اپنے راستے سے لوگوں کو اکٹھا کر اور ان سے کہہ کہ وہ چالیس دن تک تجھ کو نہ ڈھونڈیں ۔لیکن دیکھ تو بہت سے صندوق کے تختے تیار کر اور اپنے ساتھ سیریا (Saria)،ڈبریا (Dabria)، سلیمیا (Selemia)، اکانس (Echanus) اور اسیل (Esial) کو لے اور ان پانچوں کو جو بہت تیزی سے لکھنے کو تیار ہیں اور یہاں آ اور میں تیرے دل میں سمجھ کی شمع روشن کروں گا جو نہ بجھے گی تو وقتیکہ وہ چیزیں پوری نہ ہوں جو تو لکھنی شروع کرے گا‘‘

(آیت ۲۔۲۵)

غرض حضرت عزیرؑ اور پانچ زودنویس چالیس روز تک لوگوں سے الگ تھلگ اور الہامی تائید سے انہوں نے چالیس دن میں دوسو چار کتابیں لکھیں (آیت ۴۴) جن میں نہ صرف تورات بلکہ وہ سب کتابیں جو حضرت موسیٰ سے لے کر حضرت عزیر تک پیغمبروں کی طرف منسوب تھیں شامل ہیں۔

مزید برآں یہ کہ تاریخی طور پر اس بات کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا کہ یہودیوں میں تورات کو حفظ کرنے کا عام رواج ہو۔ بلکہ آج تک بھی یہود میں تورات کو حفظ کرنے کا عام رواج نہیں اور جبکہ ان میں حفظ کا رواج ہی نہیں تھا یہ کیونکر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں نے دوبارہ تورات کو لکھا تھا انہوں نے اسے صحیح طور پر ہی لکھا تھا۔تورات کی دوبارہ تدوین یہود کی جلاوطنی کے ایک لمبے عرصہ بعد ہوئی ہے۔ بخت نصر یہود کو قید کرکے بابل لے گیا تھا اور وہاں اس نے ایک مدت تک ان کو اپنی غلامی میں رکھا۔ یہ مدت تقریباً ساٹھ ستر سال بنتی ہے۔ دیکھو تاریخ بائبل مصنفہ پادری ولیم۔ جی ۔بلیکی (بارھواں باب) اس کے بعد جب سائرس فارس اور مید کے بادشاہ کا زور ہوا تو اس کے ساتھ

یہود نے خفیہ سمجھوتہ کیا اور اس کے حملہ آور ہونے پر اندر سے اس کی مدد کی جس کی وجہ سے وہ بابل پر بہت جلد قابض ہو گیا۔اس کے بعد انعام کے طور پر اس نے بنی اسرائیل کو اپنے ملک کی طرف واپس جانے کی اجازت دے دی۔اس وقت عزرا نبی کا زمانہ تھا۔اور انہی کے زمانہ میں دوبارہ تورات لکھی گئی۔یہ سارا عرصہ تقریباً سو سال کا بنتا ہے اور ہر شخص قیاس کر سکتا ہے کہ اس عرصہ میں کتنے لوگ زندہ رہے ہوں گے اور کتنے مر چکے ہوں گے۔بخت نصر کے حملے اور عزرا نبی کے زمانہ میں سو سال کا جو وقفہ ہے اس میں اگر یہود کو تورات حفظ ہوتی تب بھی اتنے لمبے عرصہ کے بعد اس کا دوبارہ لکھا جانا یقینی نہیں سمجھا جا سکتا تھا کیونکہ بہت سے لوگ مر چکے ہوں گے لیکن ان میں تو حفظ کا رواج ہی نہیں تھا اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا قیاسی اور خیالی طور پر لکھا چنانچہ اس کا ثبوت بائبل سے ہی اس رنگ میں ملتا ہے کہ پہلے تو یہ ذکر آتا ہے کہ موسیٰ سے خدا نے یہ کہا اور موسیٰ کو خدا نے یہ حکم دیا مگر اس کے بعد لکھا ہے:

”سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مر گیا اور اس نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل گاڑا پر آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا اور موسیٰ اپنے مرنے کے وقت ایک سو بیس برس کا تھا کہ نہ اس کی آنکھیں دھندلائیں اور نہ اس کی تازگی جاتی رہی“

(استثناء باب ۳۴ آیت ۵ تا ۷)

اب کیا کوئی شخص تسلیم کر سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ موسیٰ سے کہہ رہا ہے کہ پھر موسیٰ مر گیا اور اسے موآب کی ایک وادی میں گاڑا گیا مگر اب اس کی قبر کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔صاف پتہ لگتا ہے کہ موسیٰ کی وفات کے بعد کسی شخص نے یہ حالات لکھے ہیں اور اس وقت لکھے ہیں جبکہ موسیٰ کی قبر کا بھی لوگوں کو علم نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں گئی“

(تفسیر سورہ اعلیٰ۔آیت ٦۔از تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ ۴۱٦ تا ۴۱۸)

حضرت عزیرؑ جنہوں نے بائبل کو دوبارہ یادداشت کی بنا پر لکھا ان کو خود بھی بعض مقامات

کے درست ہونے کے بارہ میں شک تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایسے مقامات پر نشان لگا دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر ایلیا (Elijah) بنی ان مقامات کو درست قرار دیں تو انہیں رہنے دیں ورنہ کتابوں میں سے نکال دیں۔ اس کا ذکر Jewish Encyclopedia میں ملتا ہے جس کا حوالہ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ نے دیباچہ تفسیر القرآن انگریزی میں دیا ہے۔ آپؓ فرماتے ہیں: (ترجمہ از انگریزی)

''اسرائیل کی تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نبوکدنضر کے وقت میں اسرائیلی کتب جلا دی گئی تھیں اور ضائع کر دی گئی تھیں۔ ان کو عزرا نبی نے دوبارہ لکھا تھا اور عزرا کے متعلق ہم یہودی لٹریچر میں یہ پڑھتے ہیں: ''یہ بھول چکی تھیں اور عزرا نے انہیں دوبارہ بحال کیا۔''

(جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۵۔ صفحہ ۳۲۲)

اور پھر لکھا ہے:

''عزرا نے کتب خمسہ (Pentateuch) کے متن کو دوبارہ رائج کیا اور اس میں آشوری اور مربع رسم الخط کو داخل کیا'' (ایضاً)۔

پھر ہم پڑھتے ہیں:

''انہوں (عزرا) نے متن کے بعض الفاظ کے درست ہونے پر شک کا اظہار کرتے ہوئے ان پر نقطے ڈال دیئے تھے اور کہا تھا کہ اگر ایلیا (Elijah) ان کو منظور کر دیں تو نقطوں کو نظر انداز کر دیں اور اگر وہ نامنظور کریں تو مشکوک الفاظ کو متن سے خارج کر دیں'' (ایضاً)

ان حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ تورات جس صورت میں بھی اس وقت تھی وہ بہت غیر یقینی اور ناقابل اعتبار کتاب تھی خواہ وہ اس شکل میں ہو جو اسے عزرا نے دی یا جس صورت میں پہلے وقتوں سے چلی آتی تھی ''

(General Introduction of Holy Quran by Hazrat Musleh Maud, Page XVIII)

(دیباچہ تفسیر القرآن انگریزی صفحہ ۱۸)

حضرت عزیرؑ کی خدمت بلاشبہ عظیم تھی مگر بشری کمزوریوں سے پاک نہ تھی

حضرت عزیرؑ نے مٹی ہوئی کتابوں کو اپنے حافظہ کی مدد سے دوبارہ لکھ کر اپنی قوم کی بے بہا خدمت کی ان سے ایک صدی پہلے ایک ظالم بادشاہ نے بائبل کی سب کتابوں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا اور اب اسرائیلیوں کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ رہا تھا۔لیکن وہ بہرحال انسان تھے اور بشری کمزوریاں نسیان وغیرہ بھی ان کے ساتھ لگی ہوئی تھیں اس لئے بہت سی غلطیاں ان میں راہ پا گئیں۔ پھر موجودہ بائبل کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ یقیناً وہی ہے جو حضرت عزیر نے لکھی تھیں ہوسکتا ہے بعد میں ان میں تحریف ہوتی رہی ہو۔ان کتابوں میں غلطیاں یقیناً داخل ہوگئی ہیں جن کی وجہ سے وہ قابل اعتبار نہیں رہیں۔بطور نمونہ چند فروگزاشتوں کا ذکر یہاں مناسب ہوگا۔(حوالے King James Version سے ہیں)

(۱)ابراہیمؑ کو خدا کا نام ''یہوواہ'' معلوم نہ تھا(Exodus 6:3)ابراہیمؑ کو خدا کا یہ نام معلوم تھا اسی لئے ایک جگہ کا نام انہوں نے ''یہوواہ جیرے'' رکھا(Genesis 22:14)

(۲)ہارونؑ نے جہاں وفات پائی اس جگہ کا نام ماؤنٹ ''Hor'' تھا۔

(Numbers 33:38)

ہارونؑ نے جس جگہ وفات پائی اس کا نام ''Mosera'' تھا۔

(Deut 10:6)

(۳)جیسی(Jesse) کے بچوں کی تعداد آٹھ تھی۔

(1.Sameul 61:10.11)

جیسی کے بچوں کی تعداد سات تھی۔

(1.Chronicels 2:13.15)

(۴)مائیکل(MICHAL) کا کوئی بچہ نہ تھا۔

(2.Samuels 6:23)

مائیکل کے پانچ بیٹے تھے۔

(2.Samuels 21:8)

(۵)بن یامین (Benjamin) کے بیٹوں کی تعداد تین تھی۔

(1.Cheronicles.7:6)

بن یامین کے بیٹوں کی تعداد پانچ تھی۔

(1.Chronicels 8:1.2)

سچ تو یہ ہے کہ ہر کمزوری سے پاک علیم وخبیر ذات تو صرف خدا کی ہے۔اسی لئے قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں۔فرمایا:

''پس کیا وہ قرآن پر تدَبُّر نہیں کرتے ؟ حالانکہ اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے''(النساء:۸۳)

جو باتیں سینہ بسینہ بطور روایات آگے چلتی ہیں ان میں تضاد کا راہ پا جانا کوئی قابل تعجب امر نہیں بہرحال حضرت عزیر علیہ السلام کی خدمت قابل قدر ہے۔ اللہ انہیں اس کی جزا دے اور بوجہ بشری کمزوری جو غلطیاں ہوگئی ہیں ان سے درگزر فرمائے۔''

شُہُبِ ثاقِبہ کا ایک کام شیطانوں کو رجم کرنا بھی ہے

یہ سوال اکثر اپنے بھی پوچھتے ہیں اور غیر بھی کہ ٹوٹنے والے ستاروں کا شیطانوں کو رجم کرنے اوران کو پتھراور آگ کی سزا دینے سے کیا تعلق ہے۔شیطانوں کو گھات میں بیٹھ کر خدائی وحی کو چوری چھپے سننے کی کوشش کرنا اور ایک آدھ بات کو اچک لینے سے کیا مراد ہے اور یہ شیطان جنوں میں سے ہیں یا انسانوں میں سے؟ ہر زمانہ میں علماء وصوفیاء اپنے اپنے رنگ میں ان سوالوں کے جواب دیتے رہے ہیں۔خاکسار اپنے اس مضمون میں ان جوابات کو پیش کرنے کی کوشش کرے گا جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام۔حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ۔حضرت مصلح موعودؓ۔اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے ارشاد فرمائے۔سارے پھل ہی خوشبودار اور لذیز ہیں جو چاہیں لے لیں۔

قرآن کریم میں آسمانوں کی حفاظت اور رجوم الشّیاطین کا ذکر

حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

’’قرآن کریم میں آسمان سے شُہُب یا پتھر پڑنے کا ذکر یا آسمانوں کی حفاظت کا ذکر مندرجہ ذیل سورتوں میں ہے (۱) سورہ حجر زیرِ تفسیر آیت (یعنی ۱۵:۱۷ ناقل) (۲) سورہ ملک رکوع ۱ (یعنی ۶۷:۶ ناقل) اس میں آتا ہے وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنَا هَا رُجُوماً لِلشَّيٰطِيْن ہم نے سماء دنیا کو ستاروں سے مزین کیا ہے اور انہیں شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا ہے (۳) سورہ الصّٰفّٰت رکوع ۱ (یعنی ۳۷:۷۔۱۱) میں ہے اِنَّا زَيَّنَّا

السَّمَآءَ الدُّنْیا بِزِیْنَةِ ن الْکَوَاکِبِ وَحِفْظاً مِّنْ کُلِّ شَیْطَانٍ مآ رِدٍ لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاءِ الْاَعْلٰی وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ دُحُورًا وَّلَھُمْ عَذَابٌ واصِبٌ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةُ فَاَتْبَعَهٗ شِھَابٌ ثَاقِبٌ۔ہم نے ورلے آسمان کوستاروں سے مُزَیَّن کیااور ہر باغی شیطان سے اسے محفوظ بنایا وہ مَلاَ ءِاعلیٰ کی بات نہیں سن سکتے اور ہر طرف سے انہیں بھگانے کے لئے ان پر پتھراؤ ہوتا ہےاوراس کےعلاوہ بھی انہیں قائم رہنے والا عذاب ملے گا (وہ سن تو نہیں سکتے) لیکن اگرکوئی بات اچک لے جائے تواس کے پیچھے چمکتا ہوا شہاب جاتا ہے(اوراسے تباہ کر دیتا ہے)(۴) سورہ جن میں ہے وَّ اَنَّـا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنَاھَا مُلِئَتْ حَرَساً شَدِیْدًا وَّشُھُباً وَّ اَنَّا کُنَّا نَقْعُدُ مِنْھُا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْلَهٗ شِھَاباً رَّصَدًا رکوع ا (یعنی ۷۲:۹۔۱۰)اور ہم نے آسمان کے بارہ میں جستجو کی ہےاور یہ معلوم کیا ہے کہ اس میں سخت پہرہ لگا ہوا ہے شُہُب بھی مقرر ہیں اور اس سے پہلے تو ہم آسمان میں سننے کی جگہوں پر بیٹھا کرتے تھےمگراب جو سننے لگتا ہے وہ اپنے پر ایک شہاب کونگران پاتا ہے۔(۵) حٰمٓ السجدہ میں ہےوَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَحِفْظاً ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیزِ الْعَلِیْمِ ۔رکوع ۲ (یعنی ۴۱:۱۳)۔اور ہم نے ورلے آسمان کو چراغوں سے مزیّن کیا ہےاوران کو ذریعہ حفاظت بھی بنایا ہے۔یہ غالب اورعلم والے خدا کی تقدیر ہے‘‘

(تفسیر کبیر جلد چہارم صفحہ ۳۷۔۳۸)

پرانے مفسرین کے نزدیک رجم الشَّیاطین کی حقیقت

حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں:

’’یہ وہ پانچ مقام ہیں جن میں اس مضمون کوتفصیلاً یا اجمالاً بیان کیا گیا ہے مُفَسِّرِیْن اس کی حقیقت یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب اپنی وحی ملائکہ

پر نازل کرتا ہے تو وہ درجہ بدرجہ نیچے اترتی ہے۔ جب سماء الدّنیا تک پہنچتی ہے تو جن ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان تک پہنچتے ہیں اور اس خبر کو اڑانے کی کوشش کرتے ہیں کچھ خبریں اچک اچکا کر جب دوڑتے ہیں تو ان کے پیچھے شہب مارے جاتے ہیں۔ اس کے آگے اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی طرف یہ روایت منسوب کی جاتی ہے کہ شہب شیطانوں کو مار نہیں سکتے بلکہ زخمی کر دیتے ہیں یا بعض عضو توڑ دیتے ہیں۔ لیکن حسن بصریؒ اور ایک گروہ کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ شیطان قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ شیطان قتل کر دیئے جاتے ہیں وہ آگے پھر مختلف الخیال ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جب وہ ساحروں اور کاہنوں کو خبر پہنچا لیتے ہیں تو پھر مار دیئے جاتے ہیں اور ماوردی کا قول یہ ہے کہ خبر پہنچانے سے پہلے شُہُب ان کو جا پکڑتے اور مار دیتے ہیں۔ (تفسیر فتح البیان بحوالہ قرطبی)'' (ایضاً)

پرانے مفسرین نے بے احتیاطی سے غیر معروف روایات کو لے لیا ہے:

حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں:

''افسوس کہ ان بزرگ مُفَسِّرِیْن نے جنہوں نے قرآنی تفسیر کو بیان کرنے میں نہایت محنت اور کوشش سے کام لیا ہے اس معاملہ میں سخت بے احتیاطی برتی ہے اور غیر معروف روایات کے رعب میں آگئے ہیں حالانکہ وہ قرآن کریم کے صریح خلاف ہیں۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) شیطان آسمان کی باتوں کو سن لیتے تھے (۲) ان خبروں میں سے غیب بھی ہوتا تھا (۳) ابلیس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر ان شُہُب کی مار پیٹ سے ہوئی تھی پہلے نہ تھی۔ ان تفاسیر کے یہ تین بنیادی اصول ہیں۔ ان تینوں باتوں کو نکال دیا جائے تو روایات میں کچھ رہتا ہی نہیں۔ لیکن یہ تینوں باتیں کیسی غلط ہیں'' (ایضاً صفحہ ۳۹)

آگے حضور نے قرآن کریم کی ان آیات کو بیان فرمایا ہے جو روایات کی ان تینوں باتوں کی تردید کرتی ہیں مثلاً یہ کہ ان کے پاس ایسی کوئی سیڑھی نہیں جس کے ذریعہ یہ آسمان پر جا کر خدا کی باتیں سن سکیں۔ (الطّور۵۲:۳۹)

خدا تعالیٰ نے شیطانوں کو آسمان کی باتیں سننے سے محروم کیا ہوا ہے۔

(الشُّعراء ۲۶:۲۱۱۔۲۱۳)

غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

(یونس۱۰:۲۱)

ہاں یہ دور بیٹھے صرف رجماً بالغیب یعنی ڈھکوسلے ہی مار سکتے ہیں۔

(سبا۳۴:۵۴)

خدا اپنے مُصَفّٰی غیب کو صرف رسولوں پر ظاہر کرتا ہے (سورۃ الجنّ) پس قرآن سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے پہلے بھی اپنے اس کلام کی حفاظت فرماتا رہا ہے جو وہ انبیاء پر بھیجتا رہا ہے تا اس میں کوئی دخل نہ دے سکے اور کلام کے ساتھ یہ حفاظت اس وقت تک لگی رہتی ہے جب تک نبی اسے بندوں تک نہیں پہنچا دیتا۔ البتہ جب نبی اللہ کا کلام بندوں تک پہنچا دیتا ہے تو پھر شیطان اس کلام کو اچکنے کا کام شروع کرتا ہے اور ظاہر ہے یہ کلام شیاطین الانس ہی کرتے ہیں اور ان کوششوں کو ناکام بنانے والے بھی اللہ کے نیک بندے ہی ہوتے ہیں۔

شیطانوں کا وحی میں سے کچھ اچکنے کا مطلب:

حضرت مصلح موعودؓ تفسیر ابن کثیر میں مندرج ابن ابی حاتم کی ایک روایت نقل کر کے فرماتے ہیں:

''ابن ابی حاتم کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی جبریل کی حفاظت میں اس مقام تک پہنچا دی جاتی ہے جو وحی کے لئے مقرر ہے یعنی رسول تک۔ پس دوسری روایات جو بتاتی ہیں کہ جنّ اسے اچک لیتے ہیں ان کے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ موردِ وحی کے پاس جب وحی پہنچ جاتی ہے اور جب وہ

اس کا اعلان کر دیتا ہے اُس کے بعد شیطان اُسے اچکتے ہیں اور کئی جھوٹ ملا کر انہیں اپنے اَتْبَاع میں پھیلا دیتے ہیں''

(ایضاً صفحہ ۴۲)

شہاب ثاقب کا نجومیوں اور کاہنوں سے کوئی تعلق نہیں

حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں:

''اگر یہ معنے درست ہوں تو چاہئے کہ جب کوئی نجومی حساب لگائے اور زائچہ تجویز کرے اُسی وقت شُہُب آسمان سے گرنے لگیں۔ مگر یہ نہیں ہوتا۔ پس واقعات ان معنوں کو رد کر رہے ہیں۔ رات دن ہزاروں نجومی۔ کاہن۔ رمّال۔ جفّار۔ جوتشی۔ پنڈت۔ اسٹرانومر۔ اسٹرالوجر ان کاموں میں مشغول ہیں اور غیب کی خبریں معلوم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کا تعلق شیطانوں سے ہے اور شیطان آسمان سے اُچک کر انہیں خبریں بتاتے ہیں تو رات اور دن شہب کی بارش ہوتی رہنی چاہئے...... جو شخص ستاروں کا تھوڑا سا علم بھی جانتا ہو وہ بتا سکتا ہے کہ یہ خلاف عقل بات ہے۔ علم نجوم ورمل وغیرہ گو لغو اور فضول ہیں مگر حسابی اصول پر قائم ہیں۔ جنّات کا اس معاملہ میں کوئی بھی دخل نہیں''

(ایضاً صفحہ ۴۴)

الہامی زبان میں مذہبی نظام کو نظام شمسی سے مشابہت دی جاتی ہے

حضرت مصلح موعودؓ قرآن کریم سے یوسف علیہ السلام کی خواب جس میں چاند ستاروں کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے سے استدلال کرتے ہیں کہ:

''اس خواب اور اس کی تعبیر سے جو خود قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے ظاہر ہے کہ الہامی زبان میں خاندانی یا مذہبی نظام کو نظام شمسی سے مشابہت

دی جاتی ہے اور مرے نزدیک آیت زیر بحث (الحجر:۱۷) میں بھی یہی معنے مراد ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۳۱)

اگر ان آیات میں بجائے ظاہری نظام کے روحانی مذہبی نظام مراد لیا جائے اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ جب تک خدا کا پیغام نبی کے ذریعہ بندوں تک نہ پہنچ جائے وہ فرشتوں کی حفاظت میں ہوتا ہے اور بعد میں شیاطین الانس اُسے اُچکنے کا کام کرتے ہیں تو ان کی کوششوں کو ناکام بنانے والے بھی خدا کے نیک بندے مرسل۔ مامور۔ مصلح اور علماء ربّانی ہوتے ہیں۔

حضورؓ فرماتے ہیں:

"اس آیت میں کلام چرا لینے (استراق السَّمْعَ۔ ناقل) سے مراد یہ ہے کہ جس طرح چور ناحق دوسرے کے مال کو لیتا ہے اسی طرح وہ کلام الٰہی کو ناحق لیتے ہیں۔ یعنی اس کے معنوں کو سمجھ کر ایمان نہیں لاتے تا اس کا ناجائز استعمال کریں اور اس کے غلط معنے کر کے لوگوں کو گمراہ کریں"

(ایضاً صفحہ ۲۳)

آیات مذکورہ کا خلاصہ

حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"خلاصہ یہ کہ ان آیات میں کلام الٰہی کی حفاظت کا ذکر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نبی پر کلام نازل ہونے تک کوئی اُسے معلوم نہیں کر سکتا۔ جب وہ نازل ہو جاتا ہے تو پھر **شیاطین الانس وَالْجن** اسے مختلف ذرائع سے اچک کر اُس میں جھوٹ ملا کر لوگوں میں پھیلاتے ہیں اور نبی کے خلاف انہیں اُکساتے ہیں...... کوئی صحیح حوالہ لیا اس کے غلط معنے کئے یا ایک ٹکڑا لیا اور سیاق وسباق سے الگ کر کے اس کے مضمون سے لوگوں کو جوش دلایا۔ یہ نبیوں کے

دشمنوں کا روزمرّہ کا مشغلہ ہے اور یہی وہ اچکنا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی مشیّت نے جائز رکھا ہے اور اس سے نبی کے مشن کی حفاظت نہیں کی ....غرض جہاں کلام الٰہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حفاظت حاصل ہے کہ اس میں کوئی ظاہری یا باطنی دشمن تبدیلی نہیں کرسکتا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے شیطانی لوگوں کو اپنی مَصْلِحت سے اس امر کی اجازت دے رکھی ہے کہ اس کلام کے غلط معنے لوگوں میں پھیلائیں یا نبی کی وحی کے متعلق جھوٹ بول بول کر لوگوں کو جوش دلائیں۔ لیکن جب وہ ایسا کر چکتے ہیں تو پھر ان پر آسمان سے شہاب گرتا ہے اور نبی کے ذریعہ سے ان کے فریب کا پردہ چاک کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ استثناء ہے کہ اس سے نہ خدا تعالیٰ کی طاقت پر حرف آتا ہے نہ دین مخدوش ہوتا ہے کیونکہ اس قسم کی شرارت کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی مُستثنٰی کر دیا ہوا ہے۔ نیز اس قسم کی شرارت سے دین میں کچھ حرج نہیں آتا وہ اپنی جگہ محفوظ رہتا ہے۔ یہ جھوٹی باتیں صرف دشمنوں میں پھیلائی جاتی ہیں اور دشمن کی چند روزہ خوشی کا موجب ہوتی ہیں ......ایک بات اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ مُنَجِّمین اور نام نہاد روحانیّین کے بارہ میں ہے انبیاء کا وجود ان کے خیالات کا قلع قمع بھی کرتا رہتا ہے۔ پس ضمنی طور پر ان کے متعلق بھی یہ آیت چسپاں ہوسکتی ہے........اسلام وہم اور شرک سے روکتا ہے پس جہاں تک ان علوم کا تعلق تخمین اور وہم سے ہے وہ ناجائز ہیں اور جب ان کو مذہب کی طرح سمجھا جاتا ہے وہ شرک بن جاتے ہیں۔ ستاروں کی حرکات میں تاثیرات یقیناً ہیں لیکن وہ قانون قدرت کا ایک جزو ہیں۔ ہزاروں امور ایک وقت میں تاثیر ڈال رہے ہوتے ہیں۔ اپنی ذات میں کامل تاثیر جو دوسرے کی محتاج نہیں صرف اللہ تعالیٰ کی ہے پس ستارے کیا

کسی اور مادی سبب کے متعلق بھی اگر کوئی شخص خیال کرے کہ وہ قطعی اور یقینی تاثیر رکھتا ہے تو وہ مشرک ہے ....نجومیوں وغیرہ کے لحاظ سے اس رجم شیاطین کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جس زمانہ میں نبی نہیں ہوتے یہ لوگ خوب دعویٰ کرتے رہتے ہیں لیکن جب نبی ظاہر ہوتے ہیں تو ان کو خوب مار پڑتی ہے یعنی فریب کھل جاتا ہے اور لوگ مصفّیٰ غیب اور تک بندی میں فرق معلوم کر لیتے ہیں۔''

(ایضاً صفحہ:۴۴۔۴۵)

پھر فرماتے ہیں:

''یہ امر واقعات اور احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کے ظہور کی علامت کے طور پر اللہ تعالیٰ نے شہب کا گرنا سنت کے طور پر مقرر کر رکھا ہے۔ اسکی ظاہری وجہ تو جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں یہ ہے کہ تا اس آسمانی نشان کو دیکھ کر لوگ اس وسوسہ سے نجات پائیں کہ شاید اُسکے معجزات کسی انسانی تدبیر کا نتیجہ ہوتے ہوں مگر کوئی تعجب نہیں کہ اسکے علاوہ بھی کوئی مخفی وجہ نبی کے زمانہ میں شہب گرنے کی ہو اور اُس میں کوئی روحانی تاثیرات بھی ہوں جو گو انسانی نگاہ سے مخفی ہوں لیکن ان شیطانی تدابیر کا ازالہ کرنے میں مُمد ہوتی ہوں جو انبیاء کے دشمن کرتے رہتے ہیں۔''

(ایضاً صفحہ:۴۷)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی تشریح

خاکسار نے ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ سے سوال کیا کہ شیاطین تو روحانی وجود ہوتے ہیں وہ اگر گھات میں بیٹھ کر خدائی وحی کو چوری چھپے سننے کی کوشش کریں تو ان کو دور کرنے کے لئے ان پر آگ اور پتھروں کی بارش کیسے مُؤثر ہو سکتی ہے؟

حضورؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

''(مفہوم) آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ان آیات میں مذکور شیاطین روحانی وجود ہی ہیں۔شیاطین الانس بھی تو ہوتے ہیں اور اگر وہ مراد لئے جائیں تو وحی الٰہی کی حفاظت کو تمثیلاً بیان کیا گیا ہے۔نبیوں کے مخالفین نبی کے پاس آ کر اپنے شکوک دور کرنے کی بجائے پیچھے اپنی کمین گاہوں میں بیٹھ کر ان کی وحی پر اعتراض کر کے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔تو ان کے مقابلہ کیلئے خدا ایسے روحانی وجود یعنی عارف باللہ افراد کھڑے کر دیتا ہے جو خداداد نور سے ان شیطانوں کی پھیلائی ہوئی تاریکیوں کو پاش پاش کر دیتے ہیں۔''

حضور نے وحی الٰہی کی حفاظت کے اسی طریق کا ذکر قرآن کریم (اردو ترجمہ) کے سورۃ الحجر کے تعارف میں یوں بیان فرمایا ہے:

''اسکے علاوہ اللہ تعالیٰ بڑی تحدی سے یہ اعلان فرماتا ہے کہ دشمن خواہ کچھ بھی کہے یقیناً ہم نے ہی اس کتاب کو نازل فرمایا ہے اور آئندہ بھی اسکی حفاظت کرتے چلے جائیں گے اسکے بعد کی آیات میں بروج کا ذکر فرمایا گیا ہے جو سورۃ البروج کی یاد دلاتا ہے اور ''ہم ہی اس کلام کی حفاظت کریں گے'' کے مضمون پر سے پردہ اٹھاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی غلامی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے لوگ مامور ہوتے رہیں گے جو قرآن کریم کی حفاظت کیلئے ہمہ وقت مستعد رہیں گے۔ یہاں بروج میں اسطرف بھی اشارہ ہے کہ جو مجددین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بارہ برجوں کے طور پر آتے رہے وہ بھی اسی کام پر مامور تھے''

(قرآن کریم اردو ترجمہ تعارف مضامین سورۃ الحجر صفحہ ۴۲۳)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے شہاب ثاقب کے نظارہ کو ایک عارف باللہ سائنس دان کی نظر سے بھی دیکھا ہے چنانچہ قرآن کریم اردو ترجمہ میں سورۃ الصافات کی آیات ۶ تا ۱۱

کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''ان آیات میں کائنات کے ظاہری نظام کا بھی ذکر ہے کہ کس طرح زمین کی فضا زمین پر ہمیشہ برسنے والے Meteors کو فضا ہی میں جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور اسکے جلنے سے پیچھے ایک شعلہ دور تک لپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا گیا کہ ایک زمانے میں انسان کائنات کی خبریں لینے کی کوشش کرے گا جسکا کوئی واہمہ بھی اُس زمانہ میں نہیں ہوسکتا تھا لیکن محفوظ راکٹوں میں سفر کرنے والے ان انسانوں پر ہر طرف سے پتھراؤ کیا جائیگا اور یہ سماء الدنیا سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ صرف نزدیک کے آسمان تک پہنچنے میں کسی حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں۔''

(ایضاً صفحہ ۷۸۵)

یہی پیشگوئی سورہ رحمٰن میں بھی ہے کہ جن وانس اقطار السموات والارض سے آگے نکلنے کی جب کوشش کریں گے تو وہ ایسا نہیں کر سکیں گے اور ان پر شعلے گرائے جائیں گے۔ حضور نے اپنے ترجمہ قرآن میں وحی کا پیچھا کرنے والوں کو شیاطین الانس ہی قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

''روحانی طور پر اس سے مراد بدنیتی سے وحی کا تَتَبُّع کرنے والے اور اندازہ لگانے والے انسانی شیاطین ہیں۔ شیطان تو نزول وحی کے قریب تک نہیں پہنچ سکتا لیکن انسانی شیطان جیسے سامری تھا کچھ اندازہ لگا سکا کہ وحی کی وجہ سے لوگوں پر کیوں رعب پڑتا ہے۔''

(قرآن کریم اردو ترجمہ صفحہ ۷۸۵)

حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ مطالب

حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ نے فرمایا ہے کہ شہب ثاقبہ کے نظاروں کو ہر شخص اپنے ذوق اور معرفت کے مطابق دیکھتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا زاویہ نگاہ ہے اور یہ بھی کہ کس گہرائی میں ڈوب کر اُسے دیکھتا ہے۔ آپ اپنی تصنیف ''نورالدین'' میں ان آیات کی تشریح کی تمہید کے طور پر فرماتے ہیں:

''مناظر قدرت کو دیکھنے والے مختلف الاستعداد لوگ ہوا کرتے ہیں مثلاً دوسرے کی آنکھ کو ایک بچہ بھی دیکھتا ہے جو مصنوعی اور اصلی آنکھ میں تمیز نہیں کر سکتا۔ پھر ایک عقلمند بھی دیکھتا ہے گو وہ اصلی اور مصنوعی میں فرق کر لیتا ہے مگر آنکھ کے امراض سے واقف نہیں ہو سکتا اور نہ اُسکی خوبیوں اور نقصانوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ پھر شاعر دیکھتا ہے جو اسکے حسن و قبح پر سینکڑوں شعر لکھ مارتا ہے پھر طبیب ڈاکٹر دیکھتا ہے جو اُسکی بناوٹ اور امراض پر صدہا ورق لکھ دیتا ہے۔ پھر موجدین لکھتے ہیں جیسے فوٹو گرافی کے موجد نے دیکھا اور دیکھ کر فوٹو گرافی جیسی مفید ایجادیں کیں۔ پھر اُسکے اور بھائی دیکھتے ہیں جنہوں نے عجیب در عجیب ٹیلی سکوپ ایجاد کیئے۔ پھر اُن سے بالاتر صوفی دیکھتا ہے اور اُس سے بھی اوپر انبیاء و رسل دیکھتے ہیں اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر اللہ کریم دیکھتا ہے غرض اسی طرح پر ہزاروں ہزار نظارہ ہائے قدرت ہیں اور ان کے دیکھنے والے الگ الگ نتیجے نکالتے ہیں۔''

(نورالدین بحوالہ درس القرآن فرمودہ حضرت مولانا مولوی حکیم نورالدین خلیفۃ المسیح اوّل مطبوعہ کتاب گھر قادیان اکتوبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۶۰۷۔۶۰۸)

حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کی تشریح

''**سماء الدنیا** سے مراد دنیا کا آسمان ہے وہ آسمان جو نزدیک ہے۔ **حفظاً**: ایک کام تو ستاروں کا زنیت ہے۔ دوسرا حفاظت یعنی مخلوقات کی جو زمین میں ہے اپنی تاثیر سے اُسکے زہریلے موادوں کو دور کرتے ہیں۔ **شیطانٍ مَّارِدٍ**: یہ ایک مخلوق ہے جو ناپاک اور مخلوق سے دور رہتی ہے۔ عرب اُسے کاہن کہتے ہیں۔ شانہ بین بھی انہی میں داخل ہیں۔ وہ انبیاء کی اتباع نہیں کرتے اور غیب کی باتوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ **لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاِ الْاَعْلٰی**: (ان کاہنوں کی ناقل)

جبرئیل اور اُسکے قرب والے ملائکہ تک رسائی نہیں مگر وہ زمین کے ملائکہ یا ادھر اُدھر سے کچھ اڑا لیتے ہیں کچھ جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ شِھَابٌ ثَاقِبٌ: چمکتا ہو شعلہ پڑتا ہے اور وہ جھوٹے ثابت ہوتے ہیں رَجُوْماً لِلْشّیٰطِیْن: منجمین اور کاہن بھی انہیں میں سے ہیں کہ جو رَجْماً بِالْغَیْبَ (تیر تکّہ۔ناقل) کرتے ہیں آئندہ کی باتیں بیان کرتے ہیں اور ستاروں کو دیکھ کر تکّہ بازیاں کرتے ہیں۔ یہ ستارے ان کے واسطے تکہ بازی کا ایک ذریعہ بن گئے ہیں۔''

(ایضاً صفحہ ۶۷۴ پارہ ۲۳ رکوع ۵)

حضرت خلیفۃ المسیح اولؓ کی اس تشریح کے مطابق نجومی کاہن جو لوگوں کو اپنے جھوٹے غیب دانی کے رعب سے نبیوں کے ماننے سے دور رکھتے ہیں وہ ستاروں کے ذریعہ تخمینے لگاتے ہیں لیکن جب زمانہ میں کوئی نبی۔ مامور یا مصلح موجود ہوا اور وہ خدا سے علم پا کر ان کے مقابلہ میں پیشگوئی کرتا ہے تو وہ ان پر چمکتے ہوئے شعلہ کی طرح گرتی ہے اور ان کو جھوٹا ثابت کر دیتی ہے وہ حسد سے جل بُھن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو ایسے شیطانوں سے محفوظ کیا ہوا ہے یعنی منجموں اور کاہنوں کو ان ستاروں سے غیب کا کوئی سچا علم حاصل نہیں ہو سکتا وہ صرف تیر تکّے ہی مار سکتے ہیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کی دوسری تشریح

آپؓ فرماتے ہیں کہ:

''تمام عُقلاء میں یہ امر مُسَلَّم ہے کہ اس زمین کا کوئی واقعہ بدوں کسی سبب کے ظہور پذیر نہیں ہوتا بلکہ صوفیائے کرام اور حکماء عظام اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی امر حقیقت میں اتفاقی نہیں ہوا کرتا۔ تمام امور علل اور حکم سے وابستہ ہیں۔''

(ایضاً صفحہ:۶۱۱)

اور پھر فرماتے ہیں:

''اورشہابوں کے بارے میں لکھاہے کہ دیکھو ایوب ۳۸ باب ۳۶ آیت میں ہے''یا کس نے شہابوں کوفہمید عطا کی''اس سے اتنا پتہ لگتا ہے کہ شہابوں کوبھی فہمید (سمجھ۔ناقل) ہے۔ پرآگے بیان نہیں کیا گیا کہ کیا فہمید ہے اوراس فہمید سے کیا کام لیتے ہیں۔ اورزبور میں ہے۔''وہ اپنے فرشتوں کو روحیں بناتا ہےاوراپنے خدمت گذاروں کو آگ کا شعلہ''اب تک ہم نے یہ باتیں بیان کی ہیں کہ Meteors۔ایکاپات ۔شہاب ثاقب اورشعلہ ہائے نارآسمان سے گرتے نظر آتے ہیں اورکتب یہوداورمسیحیوں نے بھی نہیں بتایا کہ کیوں گرتے ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ فعل الٰہی ہے اسلئے لغوبھی نہیں بلکہ ضرور ہے کہ عادت اللہ کے مطابق اس میں بڑی حکمتیں ہوں''

(ایضاً صفحہ:۶۱۰)

ہرامر کیلئے جہاں طبعی واسطے ہوتے ہیں وہیں روحانی واسطے بھی ہوتے ہیں:

حضرت خلیفۃ المسیح اولؓ فرماتے ہیں:

''اب جبکہ تم ان (مادی وطبعی۔ناقل) وسائط کے قائل ہواوراضطراراً ا قائل ہونا پڑتا ہےتوروحانی امور میں کیوں وسائط کے منکر ہو۔خداتعالیٰ کے ہستی کو مان کر بھی تم ملک اورشیاطین کے وجود پر کیوں ہنسی کرتے ہو۔افسوس اسکا معقول جواب آج تک کسی نے نہیں دیا۔ناظرین جس طرح سچے وسائط ہمارے مشاہدات میں ہیں اسی طرح سچے وسائط مکشوفات میں بھی ہیں جس طرح مشاہدات میں الٰہی ذات وراء الواراء ہےاور یہ ضرور ہے اسی طرح الٰہی ذات روحانیات میں بھی وراءالوراء ہے۔''

(ایضاً صفحہ:۶۱۴)

یعنی جسطرح عِلّت ومعلوم (Cause and Effects) کا سلسلہ ہرامر میں طبعی طور پرقوانین قدرت کے تحت موجودہوتا ہے ایسے ہی اس امر کے لئے ایک روحانی واسطہ یاباعث بھی

وہیں موجود ہوتا اور کام کر رہا ہوتا ہے چنانچہ آپؒ فرماتے ہیں:

''فرشتے آسمان اور آسمانی اجرام اور ان کی ارواح کے لئے بطور جان کے ہیں۔ شیطان بھی ہلاکت، ظلمت اور جناب الٰہی سے دوری اور دکھوں کے پیدا کرنے کے لئے بمنزلہ اسٹیم (Steam) کے اسٹیم انجن کے لئے ہیں۔''

(ایضاً صفحہ: ۵۱۶)

یعنی زمین وآسمان کی ہر شے میں جو بھی صفات اور قوتیں ودیعت کی گئی ہیں اور جو وہ کام کر رہی ہے اُسکو چلانے کے لئے جو انجن یا Motive Power ہے وہ دراصل ملائکہ ہیں۔ لیکن جسطرح گاڑیوں کو زمین پر چلنے کیلئے زمین کی مزاحمت (Friction) درکار ہے۔ ہوائی جہازوں کو ہوا کی مزاحمت اور کشتی کو تیرنے کے لئے پانی کی مزاحمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقناطیس کے ایک پول کو قائم رکھنے کے لئے بالمقابل کے پول کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح شیطانوں کا کام بھی فرشتوں کو آگے بڑھنے کے خلاف مزاحمت مہیا کرنا ہے۔ اسلئے جہاں فرشتے ہوتے ہیں وہاں ساتھ ہی شیاطین الجن بھی ہوتے ہیں۔ جب کوئی نبی مبعوث ہونے والا ہوتا ہے تو جہاں فرشتوں میں اسکی مدد کیلئے حرکت پیدا ہوتی ہے۔ وہیں جنات بھی لنگر لنگوٹے کس کر میدان میں آجاتے ہیں۔ نیکی اور بدی کی تحریک کرنیوالی دونوں قوتیں فعال ہوجاتی ہیں جیسے جب آسمان سے بارش آتی ہے تو تمام اچھے برے نباتات پر ایک نئی رونق آجاتی ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح اول فرماتے ہیں:۔

''خداتعالیٰ کی عادت ہے کہ مصلح کے تولّد۔ ظہور اور اسکی فتح مندی پر حزب الرحمٰن اور حزب الشیطان کی جنگ پہلے اوپر ہوتی ہے پھر زمین پر۔ (ایضاصفحہ: ۶۱۷)

فرشتے تمام ستاروں اور اشیاء وغیرہ پر اپنا روحانی اثر ڈالتے ہیں۔ شہب پر بھی اثر ڈالتے ہیں اور پھر یہ اثر ان سے متعلقہ دیگر اشیاء پر پڑتا ہے۔ پس فرشتے جو شہب کو اپنے اثر سے چلاتے ہیں ان کا اثر مزاحمت پیدا کرنے والے شیاطین الجن پر کیوں نہیں پڑتا ہوگا آپ فرماتے ہیں:۔

''آیت اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (الطارق) کے نیچے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے مفصّل لکھا ہے کہ فرشتے بروج پر اثر ڈالتے

ہیں اوران سے ایک اثر ہوااور دیگر اشیاء پر پڑتا ہے اور ملائکہ کا اثر شہب میں بھی نفوذ کرتا ہے۔۲۸نومبر ۱۸۸۵ء میں ۲۷اور۲۸نومبر کی درمیانی رات میں غیر معمولی کثرت سے شہب گرے اور اس وقت ہمارے امام علیہ السلام کو اس نظارہ پر یہ وحی بکثرت ہوئی دیکھو صفحہ 238 براہین یَـا اَحْـمَدُ بَـارَکَ اللّٰـہ فِیْکَ مَارَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللہ رَمٰی اور اسی کے بعد مدار ذُوالسنین نظر آیا۔ اور ۲۷ ۱۸ء کی رمی شُہب غیر معمولی تھی۔ الحمدللّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پس یہ اور کل کواکب زینت سماء الدنیا ہیں اور روحانی عجائبات کی علامات ہیں اور نیز ان سے راہ نمائی حاصل ہوتی ہے۔ یہی تین فائدے بخاری صاحب نے اپنی صحیح میں بیان فرمائے ہیں۔''

(ایضاً صفحہ:۶۱۷)

مادی اشیاء کی روحانی تاثیرات کی قرآن وحدیث سے بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً غذا کا جہاں مادی اثر (Physical Effects) ہوتا ہے وہیں روحانی اثر (Spiritual Effect) بھی ہوتا ہے۔ (دیکھیں اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۶)۔ سؤر کے گوشت کا روح پر پلید اثر (ایضاً صفحہ ۲۹)۔ رات کے اندھیرے کا نینداور آرام سے تعلق جو سائنس سے ثابت ہے اور اسکا روحانی اثر نفس کو کچلنے اور استغفار کرنے پر (الذاریات ۵۱: ۲۰۔ مزمل ۷۳: ۷) وغیرہ۔ پس اسی طرح رمی شہب سے شیطان سوزی کوئی قابل تعجب امر نہیں ۔ خدا نے جو ایسا فرمایا ہے تو لفظاً لفظاً (Literally) ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ خواہ سمجھ نہ بھی آئے۔ البتہ اشیاء کی طبعی وروحانی صفات واثر ذاتی نہیں بلکہ خدا کے حکم سے ان کو قائم رکھنے والے فرشتے ہیں اسلئے تمام طاقت وقوت خدا ہی کی ہے۔ یعنی لاحول ولاقوۃ الاباللہ ۔

ستاروں کے گرنے اور رجم شیاطین کے تعلق کی وضاحت از حضرت مسیح موعود علیہ السلام

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس تساقط شہب کو جسکے اسباب بتمامہا

بظاہر مادی معلوم ہوتے ہیں رجم شیاطین سے کیا تعلق ہے اور کیونکر معلوم ہو کہ درحقیقت اس حادثہ سے شیاطین آسمان سے رفع اور دور کئے جاتے ہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسے اعتراض درحقیقت اُس وقت پیدا ہوتے ہیں کہ جب روحانی سلسلہ کی یادداشت سے خیال ذہول کر جاتا ہے یا اس سلسلہ کے وجود پر یقین نہیں ہوتا ورنہ جس شخص کی دونوں سلسلوں پر نظر ہے وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اجرام علوی اور اجسام سفلی اور تمام کائنات الجو میں جو کچھ تغیر اور تحول اور کوئی امر مستحدث ظہور میں آتا ہے اُسکے حدوث کی درحقیقت دو علتیں یا موجب ہیں:

اوّل: پہلے تو یہی سلسلہ علل نظام جسمانی جس سے ظاہری فلسفی اور طبعی بحث اور سروکار رکھتا ہے اور جسکی نسبت ظاہربین حکماء کی نظر یہ خیال رکھتی ہے کہ وہ جسمانی علل اور معلولات اور موثرات اور متاثرات سے منضبط اور ترتیب یافتہ ہے۔

دوم: دوسرے وہ سلسلہ جو ان ظاہر بین حکماء کی نظر قاصر سے مخفی ہے اور وہ خدا کے ملائک کا سلسلہ ہے جو اندر ہی اندر اس ظاہری سلسلہ کو مدد دیتا ہے اور اس ظاہری کاروبار کو انجام تک پہنچا دیتا ہے اور بالغ نظر لوگ بخوبی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ بغیر تائید اس سلسلہ کے جو روحانی ہے ظاہری سلسلہ کا کام ہرگز چل ہی نہیں سکتا.....

بہرحال یہ ثابت ہے کہ قادر مطلق نے دنیا کے حوادث کو صرف اسی ظاہری سلسلہ تک محصور اور محدود نہیں کیا بلکہ ایک باطنی سلسلہ ساتھ ساتھ جاری ہے۔ اگر آفتاب ہے یا ماہتاب یا زمین یا وہ بخارات جن سے پانی برستا ہے یا وہ آندھیاں جو زور سے آتی ہیں یا وہ اُولے جو زمین پر گرتے ہیں یا وہ شہب ثاقبہ جو ٹوٹتے ہیں اگرچہ یہ تمام چیزیں اپنے کاموں اور تمام تغیرات اور تحولات

اورحدوثات میں ظاہری اسباب بھی رکھتی ہیں جن کے بیان میں ہیئت اور طبعی کے دفتر بھرے پڑے ہیں لیکن بایں ہمہ عارف لوگ جانتے ہیں کہ ان اسباب کے نیچے اور اسباب بھی ہیں جو مدبر بالا رادہ ہیں جن کا دوسرے لفظوں میں نام ملائک ہے وہ جس چیز سے تعلق رکھتے ہیں اُسکے تمام کاروبار کوانجام تک پہنچاتے ہیں اور اپنے کاموں میں اکثر ان روحانی اغراض کو مدنظر رکھتے ہیں جو مولیٰ کریم نے اُنکو سپرد کی ہیں اور ان کے کام بیہودہ نہیں بلکہ ہر ایک کام میں بڑے بڑے مقاصد ان کو مدنظر رہتے ہیں...

شُہب ثاقبہ کے تساقط کا ظاہری نظام جن عِلَل اور اسباب پر مبنی ہے وہ علل اور اسباب روحانی نظام کے کچھ مزاحم اور سدّ راہ نہیں۔ اور روحانی نظام یہ ہے کہ ہر یک شہاب جو ٹوٹتا ہے دراصل اسپر ایک فرشتہ مؤکل ہوتا ہے جو اسکو جس طرف چاہتا ہے حرکت دیتا ہے چنانچہ شہب کی طرز حرکات ہی اسپر شاہد ہے اور یہ بات صاف ظاہر ہے کہ فرشتہ کا کام عبث نہیں ہوسکتا اُسکی تہ میں ضرور کوئی نہ کوئی غرض ہوگی جو مصالح دین اور دنیا کیلئے مفید ہو۔ سو بتوسط ملائک یعنی جبرائیل علیہ السلام آخر الرسل صلی اللہ علیہ وسلم پر یہی ظاہر ہوا کہ ملائک کے اس فعل رمی شہب سے علت نمائی رجم شیاطین ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام۔ روحانی خزائن جلد۵۔ حاشیہ صفحہ ۱۲۲۔۱۲۶ حاشیہ)

پس ہر واقعہ جو کائنات میں وقوع پذیر ہوتا ہے اسکی دو وجوہات (Causes) ہوتی ہیں ایک تو جسمانی اور طبعی (Physical Cause Under Law of Nature) اور دوسری روحانی (Sprititul Laws of Cause and Effects) اسلئے ہر واقعہ کا جہاں ایک طبعی اثر ہوتا ہے وہیں ایک روحانی اثر بھی ہوتا ہے۔ یہ دونوں سلسلے متوازی چلتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر پذیر بھی ہوتے ہیں۔

اسلئے ستاروں کے گرنے کی جو بھی طبعی اور سائنسی وجہ اور اثر ہو اسکی روحانی وجہ بھی ہوتی ہے۔

اور اسکی آخری غرض شیطانوں کو رجم کرنا ہے جو کہ خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف فرمائی۔

اب دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ستاروں کے ٹوٹنے سے شیاطین کیونکر بھاگ جاتے ہیں؟ اس کے جواب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اور یہ بھید کہ شہب کے ٹوٹنے سے کیونکر شیاطین بھاگ جاتے ہیں اسکا سر روحانی سلسلہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین اور ملائک کی عداوت ذاتی ہے۔ پس ملائک ان شہب کے چھوڑنے کے وقت جن پر وہ ستاروں کی حرارت کا بھی اثر ڈالتے ہیں اپنی ایک نورانی طاقت جو ؔمیں پھیلاتے ہیں اور ہر یک شہاب جو حرکت کرتا ہے اپنے ساتھ ایک ملکی نور رکھتا ہے کیونکہ فرشتوں کے ہاتھ سے برکت پا کر آتا ہے اور شیطان سوزی کا اس میں مادہ ہوتا ہے۔ پس یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ جنات تو آگ سے مخلوق ہیں وہ آگ سے کیا ضرر اُٹھائیں گے کیونکہ در حقیقت جسقدر رمی شہب سے جنات کو ضرر پہنچتا ہے اسکا یہ ظاہری موجب آگ نہیں بلکہ وہ روشنی موجب ہے جو فرشتہ کے نور سے شہب کے ساتھ شامل ہوتی ہے جو بالخاصیت مُحرِق شیاطین ہے۔''

(ایضاً حاشیہ صفحہ ۱۲۶۔۱۲۷)

جسطرح تمام آسمان فرشتوں سے بھرا پڑا ہے وہیں ان کے ساتھ شیاطین بھی موجود ہوتے ہیں اور ان کی باہم مخالفت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام لکھتے ہیں:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آسمان پر ایک قدم بھی ایسی جگہ خالی نہیں جس میں کوئی فرشتہ ساجد یا قائم نہ ہو۔''

(ایضاً حاشیہ صفحہ:۸۹)

جب شیطان وحی لانے والے فرشتوں کے کام میں مداخلت کرتے ہیں تو شہب کو چلانے والے فرشتے اپنے نور سے جو شہب کے ساتھ شامل ہوتا ہے ایسے شیاطین کو جلاتے ہیں۔ شیاطین کو سزا ظاہری پتھروں اور آگ سے نہیں بلکہ ملائک کے اس نور کے ذریعہ ملتی ہے جو ان کے ساتھ شامل ہوتی

ہے اور جسکی خاصیت یہ ہے کہ وہ شیطانوں کو جلاتی ہے۔

الغرض جیسا حضرت خلیفۃ المسیح اول رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ہر شخص کی آنکھ شہاب ثاقب کو اپنے اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق دیکھتی ہے۔

صحائف قمران کی مرکزی شخصیت

''نیک استاذ'' کو پہچانئے

فلسطین اور شرق اردن کی سرحد پر واقع وادئ قمران کے کھنڈرات سے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۶ء کے دوران جو صحائف دریافت ہوئے تھے (جنہیں Dead Sea Scrolls یا صحائف قمران کہا جاتا ہے) ان کی مرکزی شخصیت کوئی ایسے بزرگ تھے جن کا نام کا ذکر عمداً چھپایا گیا ہے۔ اور انہیں ہر جگہ 'نیک استاذ' یا 'نیکی کا استاذ' کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ایسا غالباً ان کی حفاظت کے پیش نظر کیا گیا تھا کیونکہ بوقت تحریر وہ زندہ ہوں گے۔

وہ بزرگ کون تھے؟ ہر ایک محقق نے اپنے اپنے خیال اور عقیدہ کے مطابق اندازے لگائے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ وہ عیسیٰ بن مریمؑ (Jusus) تھے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ ''نیک استاذ'' کے پردہ میں یوحنا بپتسمہ دینے والے تھے۔ تیسرا خیال یہ ہے کہ وہ عیسیٰ کے بھائی جیمز تھے۔

صحائف قمران میں جو کچھ نیک استاد کے بارہ میں بیان کیا گیا یا جو تعلیم انہوں نے اپنے پیروکاروں کو دی یا اپنی نظموں میں خدا کا شکر بجالاتے ہوئے جو کچھ خود اپنے بارہ میں کہا ان پر مبنی کچھ حوالوں کا اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے تا وہ انصاف سے خود ہی فیصلہ کر سکیں، 'نیکی کے استاذ' کی شناخت کچھ مشکل نہیں بشرطیکہ مذہبی تعصب کو اس راہ میں حائل نہ ہونے دیا جائے۔

ان حوالہ جات میں سوائے حوالہ (۲) کے باقی سارے حوالے مندرجہ ذیل کتاب سے اخذ کئے گئے ہیں۔

"The Complete Dead Sea Scrolls in English" by Geza Vermes,published by the Penguin Book Ltd, 27 Wrights Lane W8 5TZ London, in 1998."

یہ کتاب ۶۴۸ باریک پرنٹ کے صفحات پر مشتمل ہے جس میں تمام دریافت شدہ صحائف کا تعارف اورانگریزی ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

مندرجہ ذیل اقتباسات کے مطابق 'نیک استاد(The Righteous Teacher) یا 'نیکی کا استاذ' (The Teacher of Righteousness)اسرائیلی قوم سے تعلق رکھتے تھے. ان کا زمانہ عیسائیت کے ابتدائی زمانہ پر منطبق(Overlap) ہے۔وہ بن باپ پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ نے بچپن ہی کی عمر سے انہیں خدمت دین کے لئے وقف کر کے (غالباً تعلیم وتربیت کی غرض سے) کہیں علیحدہ چھوڑ رکھا تھا۔ جب وہ جوان ہوئے تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ خدا نے انہیں بنی اسرائیل کی ہدایت اور بائبل کی صحیح تشریح کرنے کے لئے مبعوث کیا ہے۔ان کا دعویٰ مسیح ہونے کا تھا۔انہوں نے ایک نئے مذہبی فرقہ کی بنیاد رکھی۔ وہ تشبیہات واستعارات میں کلام فرماتے۔نثر کے علاوہ انہوں نے منظوم کلام بھی لکھا جس میں انہوں نے بار بار اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کیا ہے۔ یہودی علماء ان کی جان کے درپے ہو گئے بالخصوص بڑا پادری جسکا حکومت سے بھی تعلق تھا جسے صحائف میں Wicked Priest کہا گیا ہے۔

اپنی نظموں میں وہ خدا کا شکر بجالاتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اے خدا تو نے مجھے دشمنوں سے اس طرح بچایا جس طرح جال میں پھنسے ہوئے ایک پرندہ کو یا شیروں کے منہ میں آئے ہوئے ایک شکار کو بچایا جائے۔ پھر وہ خدا کا شکر کرتے ہیں کہ انہیں ایک ایسے دور دراز کے ملک میں پناہ دی جہاں پانی کے چشمے بہتے تھے اور باغات تھے۔انہوں نے یہ بھی پیشگوئی کی کہ اپنے ظلموں کی وجہ سے یہود قیامت تک مغضوب رہیں گے اور میرے ماننے والے ہمیشہ ان پر غالب رہیں گے۔

جن اقتباسات میں مذکورہ بالا باتیں بیان کی گئی ہیں یا جن میں محققین نے صحائف قمران کا تعارف وتبصرہ پیش کیا ہے ان کا اردو ترجمہ اور اصل انگریزی عبارت درج ذیل ہے۔

صحائف قمران کب لکھے گئے؟

پروفیسر گیزا ورمز (Geza Vermes) کہتے ہیں:

(1) "An almost unanimous agreement soon emerged,dating the discovery, on the basis of palaeography and archeaology, to the last centuries of the second Temple, I.e. Second century BCE to first century CE" (Page 3)

یعنی ''جلد ہی قدیم تحریروں کے پڑھنے کے علم اور آثار قدیمہ کے علم کی مدد سے تقریباً سب کا اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ ان کا زمانہ دوسرے ٹمپل کی آخری صدیوں کا تھا یعنی دوسری صدی قبل مسیح اور پہلی صدی عیسوی کا درمیانہ عرصہ۔''

صحائف کے لکھنے والے کون تھے:

پروفیسر ڈاکٹر وِل وارنر (Dr.WILL VARNER) لکھتے ہیں:

(2) "The contents of the Dead Sea Scrolls indicate that their authors were a group of priests and laymen pursuing a communal life of strict dedication to God. Their leader was called "The Righteous Teacher" They viewed themselves the true elect of Israel..... They opposed the "Wicked priest" the jewish High Priest in Jerusalem Who represented the establishment and who had persecuted them in some way."

(Dr Will Varner, Professor of Old Testament at "The Master's College," Israel quoted by The Christian Answers

Network, Associates For Biblical Research, Israel.")

یعنی ''ڈیڈسی سکرولز میں بیان کردہ مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے کچھ پادری یا غیر پادری گروپ تھے جو بڑی سختی سے خدا کے لئے وقف تھے اور علیحدہ جماعتی حیثیت میں رہتے تھے۔ وہ اپنے امام کو ''نیک استاذ'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور اپنے آپ کو حقیقی منتخب اسرائیلی سمجھتے تھے۔ وہ ''فاسق پادری''(Wiked Priest) کے مخالف تھے جو یروشلم کا سب سے بڑا مذہبی رہنما تھا اور حکومت کا نمائندہ تھا اور کئی طور پر ان کو اذیتیں پہنچایا کرتا تھا۔''

صحائف قمران اور انجیل کی زبان میں مشابہت پائی جاتی ہے

صحائف قمران اور انجیل کی زبان میں بعض مشابہتیں پائی جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے لکھنے والے ابتدائی عیسائی تھے۔ پروفیسر گیزا اورمز لکھتے ہیں:

(3)"We note(a)fundamental Similarities of language (both in the Scrolls and in the New Testament the faithful are called Sons of light')(b) ideology (both communities considered themselves as the true Israel, governed by twelve leaders and expected the imminent arrival of the Kingdom of God):(c) attitude to Bible (both considered their own history as a fulfilment of the words of the prorphets" (p:22)

یعنی ایک چیز جو نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ (ا) صحائف اور انجیل دونوں کی زبان میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ (مثلاً دونوں میں مومنوں کو روشنی کے فرزند لکھا گیا (ب) نظریاتی بنیاد مشابہ ہے (صحائف اور انجیل دونوں کی مصنف جماعتیں اپنے آپ کو حقیقی اسرائیلی سمجھتے تھے جن پر بارہ سردار فرمانروائی کرتے تھے۔ نیز دونوں گروہ یقین رکھتے تھے کہ خدا کی حکومت اب آنے والی ہے) (ج) دونوں کا بائبل کے متعلق اندازنظر یکساں تھا (مثلاً دونوں ہی یہ

سمجھتے تھے کہ نبیوں کی پیشگوئیاں ان کے متعلق تھیں)۔''

نیک استاد ایک نئی مذہبی جماعت کے بانی تھے جس کو سخت اذیتیں دی گئیں

پروفیسر گیزا ورمز لکھتے ہیں:

(4) "The principal novelty by the manuscripts consists of cryptic allusions to the historical origins of the community, launched by a priest called "The Teacher of Righteousness" who was persecuted by a Jewish ruler, designated as the "Wicked Priest." The Teacher and his followers were compelled to withdraw into desert, where they awaited the impending manifestation fo God's triumph over evil and darkness in the end of days, which had already begun."(P3)

یعنی''صحائف کی سب سے انوکھی بات یہ ہے کہ ان میں اشاروں کنایوں میں ایک ایسی مذہبی جماعت کے آغاز کی تاریخ بیان کی گئی ہے جو اس منادنے قائم کی تھی جس کو 'نیکی کا استاد' کہہ کر پکارا جاتا تھا اور جس کو ایک یہودی حکمران جس کو 'فاسق یا شریر پادری' کہہ کر پکارا گیا ہے مسلسل اذیتیں پہنچاتا رہتا تھا۔ جس کے نتیجہ میں استاد اور اس کے پیروکار کسی بیابان علاقے کی طرف ہٹنے پر مجبور کردیئے گئے تھے۔ جہاں وہ خدا سے جلد آنے والے غلبہ کی تجلی کا انتظار کرنے لگے جو آخری زمانہ میں برائی اور تاریکی پر غلبہ پائے گی جس کا کہ آغاز ہو چکا تھا۔

پروفیسر گیزا ورمز مزید لکھتے ہیں:

(5)"Since Qumran and early Christianity overlap, it is not surprising that from the very beginning of the 'Dead Sea Scrolls' research, some scholars endeavoured "to

identify the two." (p21)....JL Teicher thought the Teacher was Jesus. For Barbara Theiring Jesus was the 'Wicked Priest; R.H Eisenman rejects both, and prefers James the Just'the brother of the lord, as the Teacher of Righteousness. Only the sensation-seeking media have been taken in by their theorie....Admittedly, the various fragments of information gleaned through the Dead Sea Scrolls results in an unavoidably patchy story, but it is fundamentally sound, and the continuing anonymity of the Teacher does not impair it... in my opinion all these theories fail the basic credibility test; they do not spring from, but are foisted on, the text."

(Page:71& 72)

یعنی ''چونکہ قمران اورابتدائی عیسائیت کا زمانہ ایک دوسرے پر منطبق ہوتا ہے اس لئے یہ بات کوئی موجب حیرت نہیں کہ صحائف قمران کی تحقیق کے آغاز ہی سے کئی سکالرز دونوں کو ایک ہی قرار دینے کی بہت کوشش کرتے رہے ہیں....جے۔ایل۔ٹیشر (J.L Tiecher) کا خیال تھا کہ استاد دراصل JESUS (عیسٰی علیہ السلام) تھے۔باربراتھیرنگ (Barbara Theiring) کا خیال تھا کہ Wicked Priest عیسٰی (Jesus) کو کہا گیا ہے اور استاد کا لفظ یوحنا بپتسمہ دینے والے کے لئے ہے۔آر۔ایچ آئیزنمین (R.H. Eisenman) ان دونوں اندازوں کو درست نہیں سمجھتا۔اس کا خیال تھا کہ نیک استاد سے مراد لارڈ (یعنی یسوع مسیح) کے بھائی جیمز منصف (James The Just) تھے۔ان سب تھیوریوں کو صرف سنسنی خیز خبروں کے متلاشی میڈیا ہی سے پذیرائی ملی......ان سب کے باوجود اس بات میں کوئی شک نہیں کہ صحائف قمران سے معلومات چن کر ایک ایسی پیوند شدہ تصویر ضرور ابھرتی ہے جس سے گریز ممکن نہیں اور یہ تصویر بنیادی طور پر حقیقی

ہے اور باوجودیکہ استاد کی شناخت کو مسلسل مخفی رکھا گیا ہے اس کا کچھ نہیں بگڑتا.....میری رائے میں یہ ساری تھیوریاں اعتبار کے اس بنیادی اصول پر اس لئے پوری نہیں اترتیں کہ یہ صحائف کے مضامین سے ازخود ابھرنے کی بجائے اس کے سر پر منڈھی جاتی ہیں۔''

خاکسار عرض کرتا ہے کہ پروفیسر صاحب درست فرماتے ہیں۔خدا کے ماموروں کی شناخت خدا سے آنے والی روشنی ہی کی مدد سے ہوسکتی ہے۔

نیکی کے استاد نے اپنے آپ کو کرم خاکی، عاجز، بن باپ اور خدا کا برگزیدہ کہا

نیکی کے استاد نے نثر کے علاوہ منظوم کلام بھی کافی لکھا۔ان کی نظموں میں خدا کی محبت اور اس کے احسانات پر شکرگزاری کا بہت دلنشین انداز میں ذکر ملتا ہے۔ان نظموں کو متعارف کراتے ہوئے پروفیسر گیز اورمز لکھتے ہیں:

(6)"The poems contained in the Scrolls are similar to the biblical psalms. They are mostly hymns of thanksgiving, individual prayers as opposed to those intended for communal worship, expressing a rich variety of spiritual and doctrinal detail.But two fundamental themes running through the whole collection are those of salvation and Knowledge.The sectary thanks God continually for having been saved from the 'lot' of the wicked, and for his gifts of insight into the divine mysteries. He, a creature of clay' has been singled out by his maker to receive favours of which he feels unworth, and alludes again and again to his frailty and total dependence of God. Whereas some of the Hymns give

impression to thoughts and sentiments common to all members of the sect, others particularly nos.1,2,7-11, appear to refer to the experience of a Teacher abandoned by his friends and persecuted by his enemies .Several scholars tend to ascribe the authorship of these to the Teacher of Righteousness and even cosider that he may be responsible for all the Hymns. But although this hypotesis is not impossible, no conclusion can yet be reached. Nor are we in a position to date any particular composition."(P243-244)

یعنی ''صحائف میں شامل نظمیں بائبل کے حمدیہ گیتوں (Hymns) سے ملتی جلتی ہیں۔ان گیتوں میں زیادہ تر خدا کے شکر کا مضمون پایا جاتا ہے۔ یہ نظمیں انفرادی مناجات پر مبنی ہیں اوران نظموں سے مختلف ہیں جو اجتماعی عبادت کی غرض سے لکھی جاتی ہیں اور جن میں مختلف انداز میں بکثرت روحانی باتیں اور عقائد کی تفصیلات بیان کی گئی ہوتی ہیں۔تاہم صحائف کے مجموعہ میں دو بنیادی مضامین جابجا ملتے ہیں یعنی نجات اور علم۔نظموں کو کہنے والا شخص عام دھارے سے الگ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔وہ مسلسل خدا کا شکر بجالاتا نظر آتا ہے کہ اس نے اسے شریروں کے ٹولے سے نجات بخشی ،اسے روحانی اسرار کی معرفت عطا کی اور وہ جو محض کرم خاکی (A Creature of Clay) ہے اس کے مالک نے باوجود نالائق ہونے کے اسے اپنے ایسے فضلوں کے لئے مخصوص کرلیا جن کا وہ ہرگز حقدار نہ تھا۔وہ جابجا اپنی عاجزی اور بے بسی اور خدا پر ایسے کامل توکل کا اظہار کرتا ہے اگرچہ بعض نظمیں ایسی ہیں جن میں ایسے جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہے جو اس کے فرقہ کے سبھی ارکان کے ساتھ مشترک ہیں وہاں بعض نظمیں ایسی بھی ہیں بالخصوص نمبر ا۔۲۔۷ تا ۱۱ جن میں ایک ایسے استاد کے ذاتی تجربات کا ذکر ملتا ہے جس کو اس کے اپنوں نے بھی چھوڑ دیا اور دشمنوں نے مسلسل اذیتیں پہنچائیں۔بہت سے سکالرز کا میلان طبع اس طرف ہے کہ ان نظموں کا لکھنے والا خود نیکی کا

استاذ ہے۔ بلکہ وہ تو یہ خیال کرتے ہیں کہ ساری ہی نظموں کا مصنف وہ خود ہی ہے۔اگر چہ ایسا دعویٰ ناممکن تو نہیں ہے لیکن ہم کسی نتیجہ پر فی الحال نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ کسی خاص نظم کے لکھے جانے کا وقت متعین کرسکیں۔"

نیک استاد اپنی ایک نظم میں اپنے آپ کو بن باپ اور عاجز بیان کرتے ہیں جس کو اس کی ماں نے بھی علیحدہ چھوڑ کر خدا کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ وہ اپنی نظم نمبر ۱۴ (سابقہ نمبر ۹) اور نظم نمبر ۱۸ (سابقہ نمبر ۱۴) میں خدا کے حضور عرض کرتے ہیں:

(7) "I thank Thee(corrected:Blessed art Thou) O Lord, for Thou hast not abandoned the fatherless or despised the poor." (p268)...."Until I am old Thou wilt care for me: for my father Knew me not and my mother abandoned me to Thee, for Thou art the father to all the sons of Thy truth,and as a woman tenderly loves her babe, so dost Thou rejoice in them, and as foster father bearing a child in his lap, So carest Thou for all Thy creatures."(Page:284)

یعنی "اے خدا تیرا شکر ہے (سبحان اللہ) کہ تو نے ایک بن باپ شخص کو نہ تو چھوڑا اور نہ اس عاجز کو ذلیل ہونے دیا...تو ہی میرے بڑھاپے تک میری حفاظت فرمائے گا کیونکہ میرا باپ مجھے جانتا نہ تھا اور میری ماں نے مجھے تیرے سپرد کر دیا تھا۔ پس تو ہی ہے جو ایسوں کے لئے بمنزلہ باپ ہوتا ہے جو تیری سچائی کے فرزند ہوتے ہیں اور تو ان پر اسی طرح راضی ہوتا ہے جس طرح ایک عورت اپنے بچہ سے پر شفقت محبت کرتی ہے اور جس طرح ایک پالنے پوسنے والا باپ ایک بچہ کی اپنی گود میں اٹھاتا ہے تو بھی اپنی مخلوق کی ایسی ہی نگہداشت کرتا ہے۔"

استاد کو خدا تعالیٰ کی توحید خالص پر یقین کامل تھا

استاد اپنی نظم نمبر ۱۶ (سابق نمبر ۱۲) خدا سے عرض کرتے ہوئے کہتے ہیں:

(8)" For Thou art an Eternal God,all Thy ways are determined for {and ever} and there is none other baside Thee."(Page: 277)

یعنی' اے خدا تو ازلی ابدی ہے۔ تیرے طریقے (یا تیری سنت) ازلی ابدی ہے اور تیرے سوا کوئی اور نہیں۔

استاد نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا: نیک استاد کا دعویٰ مسیح ہونے کا تھا چنانچہ ایک صحیفہ کا عنوان ہی A Messianic Apocalypse یعنی 'مسیح کا الہام' رکھا گیا ہے۔ اس میں مسیح اپنی کامیابی کی پیشگوئی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(9) According to the Scroll which has been provided the heading.A Messianic Apocalypse'(I.e.Massiah's Revelation)", the Teacher prophesied :{the Heavens and the earth will listen to His Messiah and none therein will stray away from the commandments of the holy ones."(P391)

یعنی آسمان اور زمین مسیح کی آواز کو سنیں گے (یعنی قبول کریں گے) اور کوئی مقدس وجودوں کے احکام سے دور نہیں رہے گا۔

خدا نے استاد کی تائید روح القدس سے کی

نظم نمبر ۱۵ (سابقہ نمبر ۱۱) میں استاد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کی روح القدس سے تائید کی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

(10) Thanking God the Teacher said: "I thank Thee O Lord, for Thou hast upheld me by Thy strength. Thou hast shed Thy Holy spirit and {Hast opened my heart} till this day."(Page:284)

یعنی' اے میرے رب میں تیرا شکرادا کرتا ہوں کہ تو نے اپنی طاقت سے میری تائید کی۔ تو نے اپنا روح القدس (Holy spirit) مجھ پر نازل فرمایا تا میرے پاؤں ڈگمگانے نہ پائیں۔

خدا سے رہنمائی پا کر استاد نے تورات کی نئی تشریح کی جس سے علماء بھڑک اٹھے:

استاد اپنی نظم نمبر۶ (سابقہ ا) میں فرماتے ہیں:

(11) Addressing God the Teacher Said: These thing I know by the wisdom which comes from Thee, for Thou hast unstopped my ears to marvellous mysteries."(P 254 "But to the elect of righteousness Thou hast made me a banner, To the interpreters of error I have been an opponent, {but a man of peace} to all those who see true things." (P 257)

یعنی میرے سارے علم کی بنیاد اس حکمت پر ہے جو تو نے مجھے عطا کی کیونکہ تو ہی ہے جس نے میرے کانوں کو معجزنما اسرار کے لئے کھول دیا ہے.... تو نے متقیوں کے لئے مجھے ایک پرچم بنا دیا ہے اور حیران کن اسرار کی ایسی تفسیر سے نوازا ہے جو معرفت سے پر ہے تا ان کو آزمائے جو حق پر چلنے والے ہیں اور اصلاح پسندوں کا امتحان لے۔ لیکن وہ جو غلط تفسیریں کرتے ہیں میں ان کا مخالف ہوں پر میں ان تمام لوگوں کو امن دینے والا ہوں جو حق کو سمجھتے ہیں۔'

نیک استاد کو مارنے کی ناکام کوشش ہوئی۔ اس کا خون بہا پر خدا نے اسے بچالیا اور چشموں والی زمین میں جگہ دی

استاد اپنی نظم نمبر ۷ (سابقہ نمبر۲) میں خدا کے حضور عرض پرداز ہیں:

(12) Thanking God for protecting his life from his enemies the Teacher said: " I thank Thee O Lord, for Thou hast placed my soul in the bundle of the living, and

has hedged me about all snares of the Pit. Violent men have sought after my life because I have clung to Thy Covenant.For they, an assembly of deceit, and a horde of belial, Know not that my stand is maintained by Thee and that in Thy mercy Thou wilt save my soul, since my steps proceed from Thee."(P257)...."I thank Thee O Lord,for Thou hast {fastened} Thy eyes upon me from the zeal of lying interpreters , and from the congregation of those who seek smooth things.Thou hast redeemed the soul of the poor one whom they planned to destroy by spilling his blood, because he served Thee."(P258-259....."I thank Thee O lord, for Thou hast not abandoned me while I sojourned among a people {burdened with sin}...For Thou, O God, has sheltered me from the children of men, and hast hidden Thy Law {within me} against the time when Thou shouldst reveal Thy salvation to me. For Thou hast not forsaken me in my soul's distress, and Thou has heard my cry in the bitterness of my soul; and when I groaned Thou didst consider my sorrowful complaint.... The Wicked and fierce have stormed against me with their afflictions;they have pounded my soul all day. But Thou O my God, has changed the tempest to a breeze ; Thou hast delivered the soul of the poor one like {a bird

from the net and like} prey from the mouth of lions."(P267-268).... "I (thank Thee, O Lord, for) Thou hast placed me beside a fountain of streams in an arid land, and close to a spring of waters in a dry land, and beside a watered garden (in a wilderness)(Page:278)

یعنی ''اے میرے رب میں تیرا شکرادا کرتا ہوں کہ تو نے میری جان کو زندوں کی پوٹلی میں رکھا اور گڑھے میں پھینکنے کے لئے جو پھندے تیار کئے گئے تھے تو نے ان سے بچانے کے لئے میرے اردگرد حفاظتی باڑ لگا دی۔متشدد لوگ میری جان کے پیچھے صرف اس لئے پڑ گئے تھے کہ میں تیرے عہد سے چمٹا رہا۔یہ دھوکہ بازوں کا گروہ اور شیطانی ہجوم نہیں جانتے کہ تو نے ہی مجھے کھڑا کیا ہے اور تو ہی اپنے رحم سے میری جان بچائے گا کیونکہ میرے سارے قدم تیری منشاء کے مطابق اٹھتے ہیں۔''

پھر استاد نظم نمبر ۸ (سابقہ نمبر ۳) میں عرض کرتا ہے: ''اے میرے خالق میں تیرا شکرادا کرتا ہوں کہ تو نے ہمیشہ مجھ پر نظر رکھی ۔تو نے ہی مجھے جھوٹے مفسرین کے تعصب سے بچایا اور نیز خوشامد پسند گروہ سے۔تو نے اس عاجز کی جان ان سے چھڑائی جنہوں نے تدبیر کی تھی کہ اس کا خون بہا کر اسے تباہ کر دیا جائے اور یہ صرف اس لئے کہ وہ تیری خدمت میں لگا تھا۔''

نیز استاد اپنی نظم نمبر ۳۱ (سابقہ نمبر ۸) میں عرض گزار ہیں: ''اے خدا میں تیرا شکرادا کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں جب کچھ عرصہ میں نے ان سخت نافرمانوں کے درمیان گزارا تو نے مجھے چھوڑا نہیں......اے خدا تو نے مجھے آدم زادوں سے پناہ دی اور اپنی باتوں (یا قانون) کو اس وقت تک میرے دل میں پوشیدہ رکھا جب تک میرے بچائے جانے کو ظاہر کر دے۔تو نے میری جان کو رنج والم کی گھڑیوں میں نہیں چھوڑا اور روح کی تلخی کے وقت جب میں درد سے کراہ رہا تھا تو تو نے میری آہ وزاری کو سنا اور میری غم بھری فریادوں کو بپایہ قبولیت جگہ دی.....شریر ظالموں نے میرے خلاف دکھوں کے طوفان کھڑے کر دیئے۔وہ سارا دن میری جان پر ہتھوڑے چلاتے رہے۔پر اے خدا تو نے اس شدید طوفان کو ہوا کے نرم جھونکوں سے بدل دیا۔تو نے اس عاجز کی جان کو اس طرح رہائی دلائی جس طرح جال میں پھنسے ہوئے پرندہ یا شیروں کے منہ میں آئے ہوئے شکار کو چھٹکارا دلایا جائے۔''

پھر نظم نمبر ۱۸ (سابقہ نمبر ۴۱) میں استاد خدا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: ''اے خدا میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے ایک غیر آباد زمین کے اندر ندیوں کے چشمہ کے پہلو میں جگہ دی جو خشک زمین کے اندر پانیوں کے چشمہ کے قریب والے باغ کے نزدیک واقع ہے۔''

استاد نے پیشگوئی کی کہ میرے دشمن قیامت تک مغضوب رہیں گے

نیک استاد اپنی نظم نمبر ۵ (سابقہ نمبر ۲۲) میں یہ پیشگوئی فرماتے ہیں:

(13) The Teacher prophesied that his persecutors would incur the wrath of God till eternity. He said: " But the wicked Thou didst create for {the time} of Thy {wrath} Thou didst vow, from the womb to the Day of Massacre, for the walk in the way which is not good. They have despised{Thy Covenant} and their souls have loathed Thy {truth}; they have taken no delight in all Thy commandments and have chosen that which Thou hatest {For according to the mysteries}of Thy wisdom, Thou hast ordained them for great chastisements before the eyes of all Thy creature, that {for eternity} they may serve as a sign{and a wonder} and that {all men} may know Thy glory and Thy tremendous power."

(Page:250-251)

''یعنی'' لیکن یہ تیری شریر مخلوق ہمیشہ خدا کے غضب کے نیچے رہے گی۔ یہ تیرا ایسا فیصلہ ہے جو رحم مادر سے لے کر قیامت تک چلتا چلا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ان راہوں پر چلتے ہیں جو اچھی نہیں۔ انہوں نے تیرے عہد کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہے اور حق سے سخت کراہت سے پیش

آتے ہیں۔ وہ تیرے احکام پر ہرگز راضی نہیں اور انہوں نے وہ طریق اختیار کیا ہے جسے تو ناپسند کرتا ہے۔ تیری پوشیدہ حکمت نے ان کے لئے سخت عذاب مقدر کر دیا ہے جس کو تیری ساری مخلوق مشاہدہ کرے گی تا ہمیشہ کے لئے یہ ایک عظیم نشان بن جائے اور تمام لوگ تیری شان اور مہیب طاقت کو جان لیں۔''

استاد نے پیشگوئی کی کہ میرے ماننے والے ہمیشہ دوسروں پر غالب رہیں گے

نیک استاد نے اپنی جماعت کے لئے اپنی تعلیم پر مبنی کچھ نصائح لکھیں جو THE EXHORTATION کے عنوان کے تحت مذکورہ بالا کتاب کے صفحات ۱۲۷ تا ۱۳۶ پر درج ہیں۔ ان میں وہ لکھتے ہیں:

(14) Exhorting his followers the Teacher said:"And God observed their deeds, that they sought Him with a whole heart, and He raised for them a Teacher of Righteousness to guide them in the way of His heart. And He made known to the latter generation, that which God had done to the latter generation,the congregation of traitors, to those who departed from the way."(P 127)..... "But all those who hold fast to these precepts, going and coming in accordance with the Law, who heed the voice of the Teacher and confess before God, (saying) Truly we have sinned, we and our father, by walking counter to the precepts of His righteous statutes or His true testimonies; who have learned from the former judgements by which the members of the community were judged; who have

listened to the voice of the Teacher of Righteousness and have not despised the precepts of righteousness when they heard them; they shall rejoice and hearts shall be strong, and they shall prevail over all sons of the earth. God will forgive them and they shall see His salvation because they took refuge in His holy Name."(P135-136)

یعنی'' خدا نے ان کے کاموں کو دیکھا کہ پورے دل کے ساتھ خدا کو تلاش کرتے ہیں تو نے ان کے لئے'' نیکی کا استاد'' مبعوث کیا تا وہ ان کو خدا کے منشاء کے مطابق چلائے.....پس وہ تمام جو ان ہدایات کو مضبوطی سے پکڑیں گے اور ان کا چلنا پھرنا شریعت کے مطابق ہوگا۔ جو استاد کی آواز پر لبیک کہیں گے اور خدا کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہوئے کہیں گے کہ اے خدا ہم نے اور ہمارے باپ دادوں نے تیرے عہد کی خلاف ورزی کر کے سخت گناہ کیا ہے۔ ہمارے متعلق تیرے فیصلے حق و حکمت پر مبنی ہیں۔

نیز جو لوگ خدا کے مقدس احکام کے خلاف ہاتھ نہیں اٹھاتے جو اس کے سچے قوانین اور عہدوں کے مطابق ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نیکی کے استاد کو آواز کی سنا ہے۔ اور وہ جنہوں نے جب تقویٰ پر مبنی احکام سنے تو ان کو تخفیف کی نظر سے نہیں دیکھا وہ خوش ہوں گے اور ان کے دل مضبوط ہوں گے اور وہ تمام زمینی لوگوں پر غالب آئیں گے۔ اللہ ان کے قصور معاف فرمائے گا اور وہ نجات پائیں گے کیونکہ وہ خدا کے مقدس نام کی پناہ میں آ گئے ہیں۔''

بھلا بوجھئے کہ'' نیک استاد'' کے پردہ میں خدا کے کون سے فرستادہ ہیں؟

ایک یہودی جب مذکورہ بالا نشانیوں کو پڑھے گا تو وہ کہے گا کہ نیک استاد کے لبادہ میں مریم کے بیٹے عیسیٰ تو نہیں ہو سکتے ان کو تو ہم نے صلیب پر مار دیا تھا اور یوں لعنتی قرار پا کر جھوٹے مسیح ٹھہرے تھے۔ نعوذ باللہ نہ وہ بچ نکلے تھے، نہ دور کہیں چشموں والی زمین میں چلے گئے تھے۔

ایک عیسائی جب ان علامتوں کو دیکھے گا تو وہ کہے گا کہ یہ' نیک استاد' مسیح کیسے ہو سکتا ہے۔

مسیح تو مر کر جی اٹھے تھے اور اپنے زخمی بدن کے ساتھ بادلوں میں ہو کر آسمان پر چلے گئے تھے۔ اگر وہ بچ گئے تھے اور بجائے آسمان کے کسی اور چشموں والے علاقہ میں چلے گئے تھے تو پھر وہ خدا کے بیٹے کیسے ہوئے اور کفارہ کیا ہوا؟

ایک غیر احمدی مسلمان بھی 'نیک استاذ' کے لباس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں پہچان سکے گا۔ اس لئے کہ اس کے عقیدہ کے مطابق تو وہ صلیب پر چڑھے ہی نہیں، وہ تو کوئی چور تھا جس کی شکل قدرت خداوندی سے عیسیٰ جیسی ہو بہو بنادی گئی تھی اور وہ چور صلیب دیا گیا جب کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نے بجسد عنصری چوتھے آسمان پر اٹھالیا۔ نہ ان کا خون بہا، نہ خدا کو اسے شیروں کے منہ میں آئے ہوئے شکار کی طرح بچانے کی ضرورت پڑی اور نہ وہ کسی دور کی زمین میں ہجرت کر گئے تھے۔ اس لئے یہ 'نیک استاذ' عیسیٰ نہیں ہو سکتے وہ کوئی اور خدا کا نیک بندہ ہوگا۔

لیکن ایک احمدی مسلمان کے لئے 'نیک استاذ' کے پردہ میں چھپے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہچان لینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ ساری باتیں جو صحائف قمران میں لکھی ہوئی ہیں اور اوپر بیان ہوئی ہیں خدا سے علم پا کر بہت پہلے حضرت مسیح موعود علیہ السلام صاف صاف بیان فرما چکے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتاب ازالہ اوہام میں جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی لکھا کہ مجھے خدا نے بذریعہ الہام بتایا ہے کہ "مسیح ابن مریم فوت ہو چکا ہے اور اس کے رنگ میں ہو کر وعدہ کے موافق تو آیا ہے۔"

(ازالہ اوہام صفحہ ۵۶۱۔۵۶۲)

پھر ۱۸۹۹ء میں آپ نے کتاب "مسیح ہندوستان" میں تحریر فرمائی اور اس میں قرآن، بائبل تاریخ اور حکمت کی کتابوں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں ثابت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مخالفوں کی تدبیروں کو ناکام کیا اور صلیب پر موت سے بچا کر انہیں کشمیر کی چشموں والی زمین میں پناہ دی۔

پس صحائف قمران کی شکل میں خدا کا ایک عظیم نشان ظاہر ہوا ہے جس سے آنحضرت ﷺ قرآن کریم اور حضرت مسیح موعودؑ کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔ یہ صحائف پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اے یہود! جس مسیح کا تمہیں انتظار تھا وہ تو کب کا آچکا اور اے عیسائیو! حضرت مسیح علیہ السلام نہ خدا کے بیٹے تھے، نہ وہ تمہارے گناہوں کا کفارہ ہوئے اور جس خدا کی بادشاہت کا تمہیں انتظار ہے وہ تو

۱۴۰۰ سال پہلے آ چکی۔ اور اے مسلمانو! تم آسمان سے کسی عیسیٰ کو اترتے نہ دیکھو گے۔ جو مسیح آنا تھا وہ تو آ چکا۔ آؤ اور سبھی اس کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔

(الفضل انٹرنیشنل)

سچی خوشحالی اور اطمینان قلب کا راز

کہتے ہیں کہ کسی ملک کا بادشاہ ہر وقت کسی نہ کسی فکر وغم اور پریشانی کا شکار رہا کرتا تھا۔اس نے اس بارے میں اپنے دانا مشیروں اور لائق حکیموں سے مشورہ طلب کیا۔ان کے مشوروں پر بادشاہ کے لئے ہر قسم کے دنیاوی لہو ولعب اور عیش وعشرت کے سامان مہیا کئے گئے مگر ولی اطمینان نصیب نہ ہوا۔

ایک درویش تک یہ سارا ماجرا پہنچا تو اس نے کہا بادشاہ سے کہو کہ اپنی سلطنت میں کوئی ایسا شخص ڈھونڈے جسے کوئی غم اور فکر لاحق نہ ہو۔اس کا قمیص حاصل کیا جائے اور بادشاہ کو پہنایا جائے اس کی برکت سے بادشاہ کے فکر وغم دور ہو جائینگے۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ساری سلطنت میں ہر طرف آدمی دوڑائے گئے کہ ایسے آدمی کو تلاش کیا جائے لیکن جس سے بھی پوچھا جاتا وہ اپنے کسی نہ کسی غم یا پریشانی کا ذکر کر دیتا۔ بالآخر بادشاہ کے وزیر کو ایک پہاڑ کے دامن میں ایک شخص بکریاں چراتا ہوا ملا جو خدا کی محبت کے گیت گا رہا تھا۔اس سے جب پوچھا گیا کہ کیا تمہیں بھی کوئی پریشانی لاحق ہے تو اس نے جواب دیا کہ الحمداللہ کوئی نہیں، وزیر نے درویش سے کہا کہ ہمیں تمہارا قمیص درکار ہے۔ہم نے اسے بطور علاج بادشاہ کو پہنانا ہے تا اس کے بھی ہموم وغموم دور ہوں۔اس مردِ درویش نے تعجب سے کہا کہ قمیص؟ وہ تو میرے پاس ہے ہی نہیں۔میرے پاس تو یہی لنگوٹی ہے جو پہنے ہوئے ہوں۔ وزیر نے حیرت سے پوچھا۔اے درویش اگر تمہارا دامن دنیا کی نعمتوں سے اتنا ہی تہی ہے کہ تمہارے پاس قمیص بھی نہیں تو پھر تم خوش کیسے رہتے ہو؟ اس نے جواب دیا خدا نے میری ساری کی ساری خواہشات پوری کر دی ہیں اور میری ساری مرادیں مجھے عطا کر دی ہیں۔اس کے ہر چھوٹے بڑے انعام پر دل اس کے شکر سے بھر جاتا ہے اور زبان اس کی حمد کے ترانے گاتی ہے۔ایک طرف میری

خواہشات اور ضروریات نہایت محدود مختصر اور اس کی رضا کے تابع ہیں تو دوسری طرف اس کے ذکر وشکر اور تعلق کی بے انتہاء لذت نے دنیا کی ساری تلخیاں اور محرومیاں اپنے دامن میں سمیٹ لی ہیں اور ان کے وجود کا احساس مٹا دیا ہے۔ جاؤ اپنے بادشاہ کو بتاؤ کہ اطمینانِ قلب صرف دنیوی لذتوں، راحتوں اور نعمتوں میں نہیں بلکہ خدا کے ذکر وشکر اور تعلق میں ملتا ہے جس چیز کی اس کو ظاہر میں تلاش ہے وہ تو اس کے باطن میں پنہاں ہے۔

مذکورہ بالا حکایت میں ایک گراں قدر صداقت بیان کی گئی ہے اور خدا تعالیٰ کا پاک کلام اس کا سرچشمہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ یعنی سنو دلوں کو اطمینان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے۔ جوں جوں زمانہ مادی ترقی کرتا جا رہا ہے زندگی کی گھما گھمی آسائشوں اور ضروریات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ذہنی سکون دلوں سے رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ انسان کی ہر آن بڑھتی ہوئی خواہشات کا گویا ایک سیلاب ہے جو امنڈتا چلا آ رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ذکر وشکر، صبر وتوکل اور قناعت کی مضبوط دیواریں ہی ہیں جو اس طوفان کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اور جب یہ بند ٹوٹ جائے تو خواہشات کا سیلاب اپنے ساتھ اطمینان قلب کو بھی بہا کر لے جاتا ہے۔ اور کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

ؔ
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے
(غالبؔ)

خواہشات کا دامن پھیلتا جاتا ہے اور انسان اپنی ہی خواہشات کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے، ہوا و ہوس کا بندہ بن جاتا ہے، گویا ایک بت ہے جس کو سینے میں چھپائے پھرتا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَرَأَيْتَ الَّذِيْ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (الفرقان:۴۴) کہ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔

دنیا اور اس کی فانی اشیاء سے انسان کی محبت اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ اگر وہ اس سے چھن جائیں تو ناقابل برداشت صدمہ اور رنج مبتلائے جان ہو جائے۔ دنیا کی محرومی کی یہی وہ آگ ہے جو دنیا میں ہی دوزخ کا ایک نمونہ دکھا دیتی ہے۔

اسی تعلق میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

’’مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص کا ایک دوست مر گیا جس کے غم میں وہ رو رہا تھا۔ اس سے پوچھا گیا تو کیوں روتا ہے تو اس نے کہا کہ میرا ایک نہایت ہی عزیز مر گیا۔ اس نے کہا کہ تو نے مرنے والے سے دوستی ہی کیوں کی۔ اصل بات یہ ہے کہ مفارقت تو ضروری ہے اور جدائی ضرور ہوگی۔ یا یہ خود جائے گا یا وہ جس سے دوستی اور محبت کی ہے پس وہ مفارقت عذاب کا موجب ہو جائے گی لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتے ہیں اور ان فانی اشیاء کے دلدادہ اور گرویدہ نہیں ہوتے وہ ان عذاب سے بچا لئے جاتے ہیں۔‘‘

(ملفوظات جلد ہشتم صفحہ ۵۴۔۵۵)

(’’خالد‘‘ ربوہ شہادت ۱۳۴۹)

مونگ پھلی کھانے سے خطرناک الرجی

مونگ پھلی لوگ شوق سے کھاتے ہیں اور اس کا تیل بھی کھانے پکانے میں استعمال ہوتا ہے اس کے کھانے سے ایک خطرناک الرجی جس سے موت واقع ہو جائے پہلے نہیں سنی تھی ۔لیکن اب اس طرح کے واقعات خبروں میں آنے لگے ہیں ۔آسٹریلیا میں ایک پندرہ سالہ لڑکے نے مونگ پھلی کھائی تو اس کے جگر میں ایسی خوفناک الرجی ہوئی کہ اس کی موت واقع ہوگئی ۔

اس کا جگر سڈنی کے ایک ہسپتال میں ایک ساٹھ سالہ مریض کو لگایا (Transplant) کیا گیا۔ڈاکٹر کہتے ہیں کہ عموماً پیوند شدہ عضو کی الرجی دوسرے شخص کو منتقل نہیں ہوتی ۔صرف ۱۹۹۷ء میں فرانس میں ایک واقعہ رپورٹ کیا گیا تھا لیکن سڈنی کا مریض جب تندرست ہوکر گھر آیا تو اس نے کاجو (Cashew Nut) کھالئے جس سے اس کو سخت الرجی ہوگئی ۔فوراً علاج میسر آنے سے جان تو بچ گئی لیکن اب آئندہ کے لئے کسی عضو کی پیوند کاری سے پہلے یہ پتہ کرنا پڑے گا کہ عضو کا عطیہ دینے والے کو کن کن چیزوں سے الرجی تھی ۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ذرہ ذرہ میں کچھ صفات اور یادداشتیں (Memories) لکھ رکھی ہیں جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہیں ۔حضور انور ایدہ اللہ نے ہومیوپیتھی کے ایک لیکچر میں یہ دلچسپ نکتہ بیان فرمایا تھا مثلاً سلفر کی کچھ صفات ہیں ۔وہ ہر حال میں اس کے اندر پوشیدہ رہیں گی خواہ اس کا ایک قطرہ دنیا کے سارے سمندروں میں ملا دیا جائے ،اس کی یادداشت تقسیم در تقسیم ہونے سے

بڑھتی جائے گی، ختم نہیں ہوگی۔ روح کی یادداشتوں کا بھی اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ جو قلب و روح پر گزرتا ہے اپنی یادداشتوں کے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔

(سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۹/جنوری ۲۰۰۳ء)

(الفضل انٹرنیشنل 21.3.03)

حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر

خاکسار اس مختصر نوٹ کے ذریعہ حضرت شیخ محمد احمد مظہر امیر جماعت احمدیہ فیصل آباد کی بعض ایسی یادوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے جن کو وہ اپنے لئے مشعل راہ سمجھتا ہے۔

کوئی پچیس سال پہلے مجھے حضرت شیخ صاحب کی ماتحتی میں بطور جنرل سیکرٹری جماعت احمدیہ فیصل آباد کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ خدا کا فضل تھا۔ پھر بعد میں بطور ممبر سٹینڈنگ کمیٹی صد سالہ جوبلی فنڈ (جس کے آپ صدر تھے) آپ کی رفاقت کا اعزاز حاصل رہا۔ جب میں جنرل سیکرٹری مقرر ہوا تو ارشاد فرمایا کہ اب روزانہ شام کو جماعتی امور کی انجام دہی کے لئے ملا کرنا۔ جاتے تو ہم پہلے بھی تھے لیکن ناغوں کے ساتھ اب تو روزانہ کی حاضری پکی ہوگئی۔ آپ شام کو ملفوظات کا درس دیتے۔ کئی بار ایسے ہوا کہ راستہ میں آتے آتے دل میں کوئی سوال پیدا ہوا یا کسی بات کی وضاحت کی خواہش پیدا ہوئی تو اسی روز کے درس میں اس کا جواب موجود ہوتا۔ دل نے کہا یہ اتفاقات نہیں ہیں بلکہ درس دینے والے کو جو صاحب ملفوظات سے روحانی مناسبت ہے اس کا نتیجہ ہے۔

ایک بار آپ نے میرے تلفظ کی تصحیح فرمائی۔ میں نے اشارہ سمجھا اور تلفظ کی صحت پر مزید توجہ کی اور فائدہ اٹھایا۔

حضرت شیخ صاحب نے باتوں باتوں میں اپنی تحقیق ام الالسنہ سے بھی مجھے متعارف کیا مجھے شوق ہوا اور میں نے آپ کے کتاب English Traced to Arabic کا مطالعہ کیا اور اس کا اردو میں خلاصہ تیار کیا جسے ماہنامہ انصار اللہ نے اپنے اگست ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں شامل اشاعت کیا۔ اس کے پندرہ سال بعد جب میں لیبیا بغرض ملازمت گیا تو یہ کتاب میرے سامان میں تھی جس

کا میرے بعض عرب دوستوں نے بھی مطالعہ کیا اور بہت ہی پسند کیا۔ اور اپنے حلقہ احباب میں اس کا ذکر کیا۔

ابھی دو سال پہلے ہی آسٹریلیا سے انگلینڈ گیا اور وہاں سے پاکستان آیا۔ حضرت شیخ صاحب کی ملاقات کے لئے فیصل آباد ان کے مکان پر حاضر ہوا بہت ضعیف اور بیمار تھے لیکن ذہن ہمیشہ کی طرح چاک وچوبند میری حاضری کی اطلاع ہوئی ایک لاٹھی کے سہارے چلتے ہوئے ملنے کے لئے تشریف لائے بہت خوشی کا اظہار فرمایا۔ حال احوال کے بعد میں نے بتایا کہ آتے ہوئے حضور سے لنڈن میں شرف ملاقات حاصل ہوا۔ حضور کے ذکر پر مٹھی بند کر کے فرمانے لگے ’’حضرت صاحب نے جماعت کو خوب سنبھالا ہے حضرت صاحب نے بہت دکھ اٹھایا ہے۔‘‘ شیخ صاحب کے قلبی تاثرات چہرے پر نمایاں تھے پھر خود ہی میرے اس ۲۳ سال پرانے ام الالسنہ والے مضمون کا ذکر فرمایا اور فرمانے لگے آپ نے میری تحقیق کو متعارف کرانے میں اچھا کام کیا ہے میں دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ محض حوصلہ افزائی فرما رہے ہیں ورنہ من آنم کہ من دانم۔

ایک بار حضرت شیخ صاحب نے مجھے فرمایا کہ صاحب ایمان ہر لغو اور بے مقصد چیز یا کام سے اعراض کرتا ہے۔ محض زیب وزیبائش کے لئے ڈرائنگ روم پر خرچ کرنا بھی لغو میں داخل ہے۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ حضرت شیخ صاحب کی ساری زندگی اس حکم الٰہی کی مجسم تصویر تھی۔ آپ کا اپنا مکان اور ڈرائینگ روم صرف ضرورت پوری کرنے کی حد تک تھا۔ آپ کی رہائش گاہ فیصل آباد کے کسی چوٹی کے وکیل کا گھر نہیں تھا بلکہ ایک خدا دوست درویش کا ڈیرہ تھا آپ کا کلام مختصر اور بامعنی اور اوقات مصروفیات سے معمور ہوتے تھے۔ وقت کو خدا کی امانت سمجھتے تھے کوئی لمحہ ضائع نہیں کرتے تھے ربوہ کسی میٹنگ کے لئے جا رہے ہیں کار میں بیٹھے اور بیٹھتے ہی اپنا بستہ کھولا اور ام الالسنہ پر کام کرنا شروع کر دیا۔ آپ کا ذہن بطور کمپیوٹر کے کام کرتا تھا۔ لگتا تھا پوری عربی لغت اس میں محفوظ ہے۔ کسی زبان کا کوئی لفظ دیکھتے اپنے فارمولے لگاتے اور فوراً اس لفظ کی عربی ماں تک پہنچ جاتے۔

آپ خشک عالم نہ تھے بلکہ آپ کی مجلس میں پاک مزاح کی چاشنی بھی ہوتی۔ جب خدام الاحمدیہ ربوہ کے وسیع ہال کو دیکھا تو مسکراتے ہوئے کہا ’’یہ حال ہے کہ مستقبل‘‘ فارسی کے بلند پایہ

شاعر تھے اور حضرت مولانا عبیداللہ بسمل صاحب کا ذکر کئی باران کی زبان سے سنا۔ غالباً اوائل میں شعروں میں ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ خدا ان کے اخلاص اور خدمات دینیہ کا بہترین رنگ میں صلہ دے۔

(الفضل ربوہ 6.12.93)

حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب کی کچھ یادیں

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اللہ سے خبر پا کر یہ پیشگوئی فرمائی تھی کہ میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کی رو سے سب کا منہ بند کر دیں گے۔ ہم نے اس پیشگوئی کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھا ہے۔ ہم نے خلفاء مسیح موعود علیہ السلام کے ارد گرد ایسے عظیم علماء اور فضلاء کو حصار کی طرح کھڑے دیکھا ہے جو جماعت کے خلاف اٹھنے والے اعتراضات کے تیروں کو اس شان سے اپنے سینوں پر لیتے تھے اور ان کو یوں لوٹاتے تھے کہ دل عش عش کر اٹھتا تھا۔ وہ دنیا دار مناظر نہ تھے بلکہ اولیاء الرحمٰن میں سے تھے اور خدا ان کی دعائیں عرش پر سنتا تھا۔ ایسے ہی وجودوں میں ایک حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب بھی تھے۔ خاکسار کو ان سے محبت تھی اور جب بھی موقع ملتا ان کی ملاقات سے شاد کام ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ مشکل سے مشکل مسائل کو علماء و عوام دونوں کے لئے عام فہم اور مسکت انداز میں حل فرما دیتے۔ ان کی تحریر سے باریک بینی اور ذہانت پھوٹتی تھی اور مخالفوں کے اعتراضات کے جواب میں بعض اوقات چلتے چلتے ایسی بات کہہ جاتے جو متن ہونے کے باوجود ایسی دلچسپ ہوتی کہ پڑھتے ہوئے بے اختیار مسکراہٹ بکھیر جاتی۔ ماہنامہ ''الفرقان'' کے مضامین گواہ ہیں کہ پرانے مسائل کو نئے انداز میں پیش کرنا گویا آپ پر ختم تھا ''الفرقان'' کے ٹھوس علمی مضامین ایک خاص شان کے حامل ہوتے تھے۔ لیکن اب تو لگتا ہے کہ دنیا کا علمی ذوق بھی ایسا بدل چکا ہے کہ وہ فصل اسی موسم کے ساتھ خاص تھی۔ اللہ کی حکمت ہے کہ بدلتی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایک نئی نسل میدان میں آ چکی ہے گویا موسم کے ساتھ ساتھ بادہ و ساقی بھی بدلتے

رہتے ہیں۔لیکن دل کا کیا علاج وہ تو اب بھی کبھی چپکے چپکے پکارتا ہے:

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں ؎

کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

حضرت ابو العطاء صاحب نے ۱۹۳۰ء میں تفہیمات ربانیہ تصنیف فرمائی تھی جو بلا شبہ ایک بیش بہا علمی خزانہ ہے اور آپ کے علم وفضل پر دال ہے۔ جب آپ نے یہ کتاب تصنیف فرمائی تو اس وقت آپ ایک ابھرتے ہوئے نوجوان عالم تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ ۲۶ سالہ نوجوان کس پایہ کا محقق اور ذہین وفطین عالم ہوگا جس کے قلم سے ایسی عظیم کتاب منصۂ شہود پر آئی۔ پھر لوگ جب کتابیں لکھتے ہیں تو ساتھ نوٹ دے دیتے ہیں کہ کتاب کا کوئی حصہ مصنف کی اجازت کے بغیر شائع نہیں کیا جاسکتا۔ ایک نمایاں چوکھنے کے اندر کاپی رائٹ کی صورت میں مصنف کا یہ حق دنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے۔مگر حضرت مولانا نے کتاب کے آخر میں ''ضروری اعلان'' کے عنوان سے لکھا:

''تفہیمات ربانیہ سلسلہ کی امانت ہے بے شک یہ میری تصنیف ہے مگر میں خود سلسلہ کا ادنیٰ خادم ہوں۔تفہیمات ربانیہ کو کوئی جماعت، کوئی فرد بلکہ میری اولاد بھی خلیفہ وقت کے مقررہ کردہ نظام کی اجازت سے طبع کر سکتی ہے۔
واللہ الموفق۔(مصنف)''۔

یقیناً جب تک ہدایت کے متلاشی اس کتاب سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے صدقہ جاریہ کے طور پر اس کا ثواب آپ کو بھی پہنچتا رہے گا جو جنت میں آپ کے درجات کو بلند کرنے کا موجب ہوگا انشاءاللہ۔

حضرت مولانا ابو العطاء صاحب سے ملنے کا مجھے بارہا موقع ملا۔ ایک دفعہ مجھے ان کی میزبانی کا شرف بھی حاصل ہوا۔خدا تعالیٰ نے ظاہری اور باطنی حسن آپ کو وافر عطا فرمایا ہوا تھا۔نیکی تقویٰ اور علم وفضل کے ساتھ ساتھ آپ بہت ہمدرد اور منکسر المزاج انسان تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ اپنے ملنے والوں میں ذاتی دلچسپی لیتے تھے اور تعلقات محبت خوب نبھاتے تھے۔زاہد و عابد تو بہت تھے لیکن خشک اور تنگ نظر ہرگز نہ تھے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابہ اور آگے ان سے اکتساب فیض کرنے والے تقریباً

سبھی تہجد گزار تھے۔حتی کہ وہ سفروں میں بھی تہجد کو نہیں چھوڑا کرتے تھے جب کہ سفروں میں فرض نماز بھی قصر کی جاتی ہے ۔ ۱۹۶۰ء میں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب ؒ حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب اور حضرت گیانی واحد حسین صاحب ؒ دورہ پر سیالکوٹ تشریف لائے ۔رات کا کھانا محترم چوہدری نذیر احمد باجوہ صاحب ایڈوکیٹ مرحوم کے ہاں تھا۔ جنہوں نے بہت سے معززین شہر کو کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا کھانے کے دوران بہت دلچسپ گفتگو ہوتی رہی ۔ بعد میں حضرت صاحبزادہ صاحب نے تو محترم باجوہ صاحب کے ہاں قیام فرمایا اور حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب اور حضرت گیانی صاحب کی میزبانی کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ (میں اس زمانہ میں ایس ڈی او الیکٹرانک سٹی واپڈا سیالکوٹ تھا) ان دونوں بزرگوں کی طبیعت میں پاک مزاح بھی بہت تھا۔ خاکسار ان کی گفتگو سے بہت محظوظ ہوا۔ رات کے آخری حصہ میں جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ دونوں بزرگ تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے۔اس سے پہلے ۱۹۵۸ء میں جب خاکسار ایس ڈی او اوکاڑہ تھا تو حضرت مولانا جلال الدین شمس صاحب ؓ کی میزبانی کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا تھا۔ان کے ساتھ بھی میرا ایسا ہی تجربہ ہوا گرمیوں کا موسم تھا رات کے پچھلے پہر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا صاحب کوٹھی کے لان میں ایک چادر بچھا کر تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے۔

یہ واقعات میں نے اس لئے عرض کئے ہیں کہ ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کو پتہ لگے کہ ہمارے بزرگ کتنے عبادت گزار تھے ۔ ہم نے اپنے والدین کو بھی بچپن سے تہجد پڑھتے دیکھا اور بزرگوں کو بھی ۔حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب کے متعلق یہی سنا ہے کہ رات کے آخری حصہ میں اپنے مولا کے حضور اپنی حاجتیں پیش کرتے اور وہ بارہا معجزانہ طور پر پوری فرما دیتا۔

حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب میں دلجوئی کا رنگ بھی بہت نمایاں تھا۔ایک بار میرے ایک عزیز ربوہ نکاح کی غرض سے آئے ہوئے تھے اتفاق سے اس روز مجلس مشاورت کا آغاز ہو رہا تھا اور سبھی بزرگ اس سلسلہ میں بہت مصروف تھے ۔مصروف تو حضرت مولوی صاحب بھی بہت ہوں گے ۔مگر جب میں نے جمعہ کی نماز کے بعد اعلان نکاح کی درخواست کی تو آپ فوراً تیار ہو گئے اور مسجد مبارک کے جنوبی کونہ میں جتنے دوست بھی وہاں اکٹھے ہو سکے ان کی موجودگی میں نکاح کا اعلان فرما دیا اور اس طرح میرے عزیز کی دلجوئی فرمائی۔

جس روز میرے نانا جان حضرت میاں مہر اللہ صاحبؒ کی وفات ہوئی حضرت مولوی صاحب کو علم ہوا تو نماز جنازہ اور تدفین میں شریک ہوئے اور آخر وقت تک ہمارے ساتھ رہے۔اس دوران میں نے انہیں بتایا کہ کل میرے نانا نے کشف میں دیکھا تھا کہ آسمان پر بہت سے لوگ اکٹھے ہوئے ہوئے ہیں دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کچھ جنت کی طرف اڑتے جا رہے ہیں اور کچھ جہنم کی طرف۔اور پوچھنے پر بتایا کہ میں ان لوگوں میں شامل تھا جو جنت کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ (جیسے پتنگے روشنی کی طرف بھاگتے ہیں) جب ان کا یہ کشف جو وفات سے ایک روز قبل انہوں نے دیکھا تھا میں نے حضرت مولوی صاحب کو بتایا تو فرمانے لگے کہ حدیث میں بھی آتا ہے کہ اَلْاَ رْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ یعنی روحیں جمع کئے ہوئے لشکروں کی طرح ہیں۔

جب خاکسار ایگزیکٹو انجینئر تھا تو بہت سے غریب نوجوان ملازمت کے حصول کے لئے میرے پاس حضرت مولوی صاحب کے تعارفی رقعوں کے ساتھ آیا کرتے تھے کہ ملازمت کے سلسلہ میں ان کی مناسب امداد کی جائے۔اس سلسلہ میں ربوہ سے زیادہ خطوط مجھے غالباً حضرت مولوی صاحب کے ہی آیا کرتے تھے۔مجھ سے جو ہو سکتا تھا کرتا تھا۔اس زمانہ میں افسروں کو اختیار بھی بہت ہوتے تھے۔لیکن میں سوچتا تھا کہ مولوی صاحب غریب اور بے کار نوجوانوں کے لئے کس قدر ہمدردی رکھتے تھے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولوی صاحب کے قائم مقام جماعت میں ہمیشہ پیدا کرتا چلا جائے اور ہماری جماعت میں ایسے علم و فضل کے اہل اللہ ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں۔آمین

(الفضل انٹرنیشنل 16.7.2004)

حضرت چوہدری محمد خان صاحب

حضرت چوہدری محمد خان صاحب موضع گل منج گورداسپور کے رہنے والے تھے جو قادیان سے پانچ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے۔ بہشتی مقبرہ قادیان کتبہ ۳۶۲ پر لکھا ہے:

''چوہدری محمد خان ولد چوہدری ملنگ خان نمبردار موضع گل منج وفات ۳۶۔۱۔۱۶ عمر ۶۵ سال''

اس حساب سے آپ کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۱ء بنتی ہے۔ آپ نے نوجوانی میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے ہاتھ پر بیعت کا شرف حاصل کیا۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ آپ کو احمدیت کا پیغام حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے خود ذاتی طور پر دیا تھا۔ اس کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ ایک بار آپ اپنے ایک ہم عمر عزیز چوہدری رانجھے کے ساتھ اپنی منج راجپوت برادری کے ایک گاؤں موضع کھبے ضلع امرتسر گئے ہوئے تھے۔ قادیان کے رستے پیدل اپنے گاؤں کو واپس آرہے تھے کہ بیت اقصیٰ کے پاس سے گزر ہوا۔ عصر کا وقت تھا چوہدری محمد خان اپنے ہمراہی سے کہنے لگے کہ آؤ یہاں عصر پڑھ لیتے ہیں ورنہ وقت جاتا رہے گا۔ چنانچہ وہ دونوں بیت الاقصیٰ میں داخل ہوئے۔ عبادت ہو چکی تھی اور حضرت بانی سلسلہ احمدیہ گھر واپس جانے کے لئے اپنا جوتا پہن رہے تھے۔ چوہدری محمد خان نے حضرت صاحب کو سلام عرض کیا جس کے جواب میں بڑی عمدگی سے انہوں نے جواب دیا اور جوتا اتار کر پھر صف پر تشریف فرما ہو گئے۔ ان دونوں نے وضو کیا۔ اس زمانہ میں وضو کی ٹوٹیاں بیت اقصیٰ کے صحن کے اوپر ہی ہوا کرتی تھیں۔ جب ان دونوں نے عبادت کر لی تو حضرت صاحب نے چوہدری محمد خان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا آپ کے ہاں میرے اشتہار پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے

عرض کیا کہ نہیں جس پر حضرت صاحب نے فرمایا کہ میرے اشتہار تو دور دراز کے جزیروں میں پہنچ چکے ہیں آپ کا گاؤں کتنی دور ہے ۔ چوہدری صاحب نے عرض کیا کہ یہی کوئی چار کوس کے فاصلہ پر ہے ۔تو حضرت صاحب نے فرمایا کہ اچھا میرے ساتھ چلو میں آپ کو اشتہار دیتا ہوں چنانچہ آپ ان دونوں کو ساتھ لے کر اپنے گھر (الدار.....) میں لے آئے ۔ بیت المبارک کے ساتھ والے کمرہ میں صف بچھی ہوئی تھی اور اس پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ حضرت صاحب نے کمرہ کی الماری کھول کر فرمایا کہ تمہارے گاؤں میں جتنے پڑھے لکھے ہوئے ہیں اتنے اشتہار لے لو۔ چوہدری صاحب کہا کرتے تھے کہ ہمارے گاؤں میں پڑھے لکھے تو دو تین ہی تھے لیکن میں نے پندرہ اشتہار اٹھا لئے اور واپس اپنے گاؤں آ گیا۔ ان کے والد چوہدری ملنگ خان گاؤں کے نمبر دار اور معزز زمیندار تھے ۔ رواج کے مطابق شام کو کام کاج سے فارغ ہو کر لوگ ان کے ہاں آ کر بیٹھا کرتے تھے ۔ چوہدری محمد خان نے اپنے والد صاحب کو کہا کہ مجھے مرزا صاحب نے یہ اشتہار دیئے ہیں ۔ میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں چنانچہ ایک آدمی نے دیا پکڑا اور چوہدری صاحب نے اپنے والد اور موجود حاضرین کو وہ اشتہار پڑھ کر سنایا جسے سن کر ان کے والد صاحب خاموش رہے اور کسی مخالف یا موافق ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ موضع گل منج سے کوئی چار کوس کے فاصلہ پر ہی سیکھواں نامی گاؤں تھا جہاں حضرت میاں جمال دین ۔ حضرت میاں خیر دین اور حضرت میاں امام دین رہا کرتے تھے (حضرت مولانا جلال الدین شمس کے والد۔ تایا اور چاچا) چوہدری صاحب کی ان سے واقفیت تھی اور بٹالہ میں ان سے کئی بار مل چکے تھے اور ان کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ احمدی ہو چکے ہوئے ہیں حضرت صاحب کی ملاقات اور اشتہار نے چوہدری محمد خان کے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہ اگلی ہی صبح سیکھواں میاں صاحبان کے پاس پہنچ گئے ۔ یہ تینوں بھائی بہت مخلص احمدی تھے (حضرت صاحب کے خصوصی رفقاء میں شامل تھے) اور ان سے حضرت صاحب سے ملاقات اور اشتہار کا تذکرہ کر کے ان کی رائے طلب کی ۔ انہوں نے حضرت صاحب کے دعویٰ کی وضاحت کی اور بتایا کہ ہم تو احمدی ہو چکے ہوئے ہیں آپ بھی بیعت کر کے جماعت میں داخل ہو جائیں ۔ چنانچہ چوہدری صاحب سیکھواں سے سیدھے قادیان چلے گئے ۔ قادیان پہنچ کر آپ نے بیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور یوں بیعت کر کے آپ جماعت احمدیہ میں داخل ہو گئے ۔

چوہدری محمد خان صاحب نے جس روز بیعت کی وہ جمعہ کا روز تھا۔ بیعت کے بعد آپ نے گاؤں واپس جانے کی اجازت طلب کی تو حضرت صاحب نے فرمایا ابھی ٹھہرو۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں آپ اگلے جمعہ تک ٹھہرے اور جمعہ پڑھ کر اجازت لے کر گاؤں واپس چلے آئے۔ اس کے بعد تو یہ معمول بن گیا کہ ہر جمعہ قادیان میں پڑھا کرتے تھے اور عیدوں جلسوں وغیرہ میں شامل ہوتے تھے۔

بیعت کے بعد ایک روز جب چوہدری محمد خان حضرت صاحب کے پاؤں دبا رہے تھے تو جھجکتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میری دین و دنیا دونوں سنور جائیں۔ حضرت صاحب نے فرمایا کہ ہمارا وظیفہ یہی ہے کہ نماز سنوار کر ادا کیا کرو اور استغفار کثرت سے کیا کرو بعد میں ایک مرتبہ پھر جب آپ ایسے ہی پاؤں دبا رہے تھے تو پھر یہی عرض کیا تو حضرت صاحب نے فرمایا کہ استغفار اور درود شریف کثرت سے پڑھا کریں چنانچہ وہ اس پر عمر بھر عمل پیرا رہے آپ کی روایات حضرت میرزا بشیر احمد صاحبؓ نے سیرۃ المہدی میں درج فرمائیں۔

۱۹۰۵ء میں حضرت مولوی عبدالکریم سیالکوٹی صاحب وفات پا گئے۔ اسی زمانہ میں حضرت مولوی برہان الدین جہلمی صاحب بھی فوت ہو گئے۔ خود حضرت صاحب کو بھی قرب وفات کے الہامات متواتر ہو رہے تھے۔ حضرت صاحب کو اس بات کا بڑا فکر تھا کہ علماء کی جماعت فوت ہو رہی ہے لیکن ان کے قائم مقام سامنے نہیں آ رہے۔ حضرت صاحب نے ۱۸۹۸ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول اسی غرض کے لئے جاری فرمایا تھا کہ بچے دنیا کے علوم خدمت دین کے لئے سیکھیں۔ ۱۹۰۵ء کے اواخر میں قادیان کے ایک جلسہ میں حضرت صاحب نے ان باتوں کو بیان فرمایا۔ اس جلسہ میں چوہدری محمد خان بھی موجود تھے آپ بتایا کرتے تھے کہ حضرت صاحب کی باتیں سن کر میرا دل رقت سے بھر گیا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس وقت ان کی شادی ہو چکی تھی لیکن ابھی اولاد کوئی نہ تھی۔ آپ نے اشکبار آنکھوں سے اپنے دل میں دعا کی اور خدا سے وعدہ کیا کہ اے خدا اگر تو مجھے دو بیٹے دے دے تو میں ایک کو تو تعلیم دلواؤں اور دوسرے کو تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھاؤں۔ اللہ کی قدرت کہ اس کے بعد ان کے ہاں پانچ بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے تین نوعمری میں فوت ہو گئے اور دو مانگے تھے تو عمر پانے والے دو بیٹے ہی ملے۔ مدرسہ احمدیہ ۱۹۰۹ء میں دینی علوم سکھانے کے لئے جاری ہوا تو بیٹا اس میں داخل کرایا اور چھوٹے بیٹے کو تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں داخل کرایا۔

چوہدری محمد خان صاحب خاکسار راقم الحروف کے دادا تھے۔ مذکورہ بالا واقعات وحالات انہوں نے میرے والد صاحب سے کئی بار بیان کئے اور انہوں نے مجھ سے متعدد بار زبانی اور تحریری طور پر بیان کئے میرے تایا جنہوں نے مدرسہ احمدیہ سے دینی علم حاصل کیا۔ زندگی وقف کی اور تادم آخر خدمت دین میں زندگی گزاری ان کا نام چوہدری محمد طفیل خان تھا۔ آپ کو خدا کے فضل سے دعوت الی اللہ کا بہت اچھا موقع ملا وہ انسپکٹر مال کے طور پر بھی کام کرتے رہے اور زندگی کے آخری ایام میں لالیاں میں بطور معلم وقف جدید کام کر رہے تھے۔ کام کے دوران ہی دل کی تکلیف ہوئی فضل عمر ہسپتال میں پندرہ روز زیر علاج رہے پھر آرام کی غرض سے میرے والد صاحب کے ہاں لائل پور (فیصل آباد) آ گئے اور ابھی ایک ہفتہ بھی آئے ہوئے نہ گزرا تھا کہ دل کا پھر دورہ پڑا اور علاج میسر آنے سے پہلے جان جان آفریں کے سپرد کر دی ان کے بیٹے رانا محمد بشیر یحیٰی خان اور رانا محمد موسیٰ خان اور بیٹیاں اور ان کی اولاد کراچی میں ہوتی ہے میرے والد صاحب چوہدری محمد یعقوب خان صاحب ماشاءاللہ ۹۰ برس کے ہیں میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد طارق رانا ڈینٹل سرجن اسلام آباد کے پاس ہوتے ہیں۔ میٹرک کر کے وہ محکمہ کواپریٹو سوسائٹیز میں سب انسپکٹر بھرتی ہوئے اور وہاں سے ریٹائرڈ ہو کر کئی سال تک بطور انسپکٹر انصاراللہ مرکزیہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ میرے دوسرے بھائی ڈاکٹر محمد زبیر خان رانا بون متھ (انگلینڈ) کی جماعت کے پریذیڈنٹ ہیں۔ تیسرے محمد عثمان خان سیکرٹری مال جماعت آسٹریلیا اور چوتھے رشیدالدین خان وینکوور کینیڈا میں دعوت الی اللہ کے کام میں ذوق وشوق سے حصہ لیتے ہیں۔ ہمشیرہ امینہ مبارکہ اہلیہ پروفیسر چوہدری عبدالحمید بھٹی امیر حلقہ فاروق آباد لجنہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ خاکسار بھی عمر بھر ملازمت میں جہاں جہاں رہا ہے حسب توفیق جماعت کے کاموں میں حصہ لیتا رہا ہے۔ آج کل جماعت احمدیہ آسٹریلیا کا نیشنل وائس پریذیڈنٹ اور نمائندہ الفضل انٹرنیشنل ہے۔ قبل ازیں خاکسار کو جن عہدوں پر کام کرنے کی عزت وسعادت حاصل رہی ہے ان میں ممبر سٹینڈنگ کمیٹی صد سالہ جوبلی فنڈ۔ دو سالوں میں ربوہ کی مرکزی شوریٰ کی ''سب کمیٹی تحریک جدید'' کا صدر خدام الاحمدیہ کی مرکزی شوریٰ کی ''دستور کمیٹی'' کا صدر۔ جنرل سیکرٹری جماعت احمدیہ فیصل آباد، مرکزی فنانشل سیکرٹری احمدیہ انجینئرز ایسوسی ایشن ربوہ صدر انصاراللہ آسٹریلیا، صدر حلقہ سول لائن لاہور و تربیلہ و امیر بن غازی لیبیا وغیرہ

شامل ہیں۔خدمت کی کوئی بھی توفیق ملنا سب خدا کے فضل پر موقوف ہے اور اس میں ہمارے دادا جی کی دعاؤں کا بھی بڑا دخل ہے۔اگر کوئی خدمت کرنے کی ان کی اولاد میں سے کسی کو توفیق ملتی ہے تو خدا کرے اس کا اجران کو بھی پہنچتا رہے اور ان کا بسیرا ہمیشہ ہمیش خدا کی رضا کے سایہ تلے ہو۔آمین

(الفضل ربوہ 9.10.97)

دجال کا گدھا

اگرکسی اجنبی شخص کی آمد کا انتظار ہو جس کو پہلے کبھی دیکھا نہ گیا ہو لیکن اسنے کسی عجیب وغریب صفات والی سواری پر سوار ہوکر آنا ہو جس کا ہمیں پہلے سے علم دے دیا گیا ہو تو سواری کو دیکھ کر ہم اس کے مالک کو پہچان سکتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی واقعہ دجال کے ساتھ پیش آنے والا تھا۔ مسلمانوں کو صدیوں سے امام مہدی و مسیح کی آمد کا انتظار تھا اور اس کی آمد سے پہلے دجال اور یاجوج ماجوج کا ظہور مقدر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دجال کے گدھے یعنی اس کی سواری کی علامات خدا سے علم پا کر تفصیل سے بیان فرمادی تھیں۔ اس میں بہت بڑی حکمت پوشیدہ تھی کہ مسلمان جب ان علامتوں سے دجال کے گدھے کو پہچان لیں گے تو اس کے موجد و سوار کو پہچان کر دجالی فتنہ سے ہوشیار ہو جائیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ اب اس کے روحانی مقابلہ کے لئے مسیح و مہدی بھی آنے والے ہیں۔ کیونکہ وہی وقت مسیحا کا ہونا مقدر تھا۔

پس یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ دجال کا گدھا مع اپنی تمام علامتیں دجال اور یاجوج ماجوج کی بتائی تھیں وہ سبھی کب کی پوری ہو چکی ہیں لیکن لوگ ظاہر کو پکڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان میں مستور پیغام پر غور نہیں کرتے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ رؤیا و کشوف تعبیر طلب ہوتے ہیں اور ان کے اصل معنے اپنے وقت پر کھلتے ہیں۔

دجال کے معنے ہیں بہت بڑا دجل (دھوکہ) دینے والا۔ خدا کے ایک عاجز بندے کو خدا کے بیٹے کے طور پر دنیا سے منوانے سے بڑا دھوکہ اور کیا ہوسکتا ہے اور اسی قوم کے فلسفیوں نے اپنے فلسفہ کے زور پر دنیا کو خدا اور مذہب سے دور کر کے دہریت کے گڑھے میں گرا کر بہت بڑے دجل کا

ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ دجال کی حقیقت کے بارہ میں حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں:

''دراصل یہی لوگ دجال ہیں جن کو پادری یا یورپین فلاسفر کہا جاتا ہے یہ پادری اور یورپین فلاسفر دجال معہود کے دو جبڑے ہیں جن سے وہ ایک اژدہا کی طرح لوگوں کے ایمانوں کو کھا جاتا ہے اول تو احمق اور نادان لوگ پادریوں کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں اور اگر کوئی شخص ان کے ذلیل اور جھوٹے خیالات سے کراہت کر کے ان کے پنجے سے بچا رہتا ہے تو وہ یورپین فلاسفروں کے پنجے میں ضرور آ جاتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کے عوام کو پادریوں کے دجل کا زیادہ خطرہ ہے اور خواص کو فلاسفروں کے دجل کا زیادہ خطرہ ہے۔''

(کتاب البریّہ حاشیہ صفحہ۲۵۲)

یاجوج ماجوج قوم کے بارہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''خدا نے مجھے سمجھایا ہے یاجوج ماجوج وہ قوم ہے جو تمام قوموں سے زیادہ دنیا میں آگ سے کام لینے میں استاد بلکہ اس کام کی موجد ہیں اور ان ناموں میں یہ اشارہ ہے کہ ان کے جہاز۔ ان کی ریلیں۔ ان کی کلیں آگ کے ذریعہ سے چلیں گی اور ان کی لڑائیاں آگ کے ساتھ ہوں گی اور وہ آگ سے خدمت لینے کے فن میں تمام دنیا کی قوموں سے فائق ہوں گی اور اسی وجہ سے وہ یاجوج ماجوج کہلائیں گے .... سو مقرر ہو چکا تھا کہ مسیح موعود یاجوج ماجوج کے وقت ظاہر ہوگا۔''

(ایام الصلح۔ روحانی خزائن جلد۱۴ صفحہ۴۲۴۔۴۲۵)

پس دجال اور یاجوج ماجوج دو مختلف حیثیتوں سے ایک ہی قوم کے نام ہیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہُ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب Revelation, Retionality, Knowledge and Truth میں صفحہ ۶۰۶ تا ۶۰۹ میں دجال کے گدھے کی جو مختلف نشانیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمائی تھیں اور احادیث کی مختلف کتب میں مذکور ہیں ان کو مع

حوالہ جات جمع فرما دیا ہے جن سے اس گدھے کی ایک دلچسپ تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔آپ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دجال کے اس انوکھے گدھے کی علامتیں بیان فرمائی ہوں گی تو وہ باتیں اس زمانہ کے لوگوں کو بہت عجیب لگی ہوں گی کیونکہ باوجود اسے بار بار گدھا کہہ کر پکارنے کے عام گدھے کی کوئی بات بھی اس میں نہیں پائی جاتی۔لیکن آج کل کے زمانہ کی سواریوں مثلاً ریل، ہوائی جہاز، کار، بس، بحری جہاز وغیرہ پر وہ سب باتیں ہو بہو پوری اترتی ہیں۔ ان سبھی سواریوں میں ایک بات مشترک ہے کہ وہ سبھی آگ کی طاقت سے کام کرتی ہیں۔حضور رحمہ اللہ نے اس علامتی گدھے کی جو نشانیاں مختلف کتابوں سے اپنی کتاب میں نقل کی ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔دجال خود بھی اپنے گدھے کی طرح ایک دیو ہیکل وجود ہوگا۔اس کا قد اتنا لمبا ہوگا کہ اس کا سر بادلوں میں چھپ جائے گا اور اتنا طاقتور ہوگا کہ اکیلے ساری دنیا کو فتح کر لے گا۔

(کَنْزُ الْعُمَّال)

۲۔دجال کی دائیں آنکھ اندھی ہوگی (صحیح مسلم)

۳۔اس گدھے پر صرف دجال ہی سواری نہیں کرے گا بلکہ بطور پبلک ٹرانسپورٹ کام کرے گا۔اس کی ایک سائیڈ میں کھلی جگہ رکھی جائے جہاں سے سواریاں اس کے پیٹ کے اندر داخل ہوں گی (بِحَار الْاَنوَار)

۴۔گدھے کے پیٹ کے اندر خوب روشنیاں ہوں گی اور ان پر بیٹھنے کے لئے آرام دہ سیٹیں ہوں گی (بِحَارُ الْاَنْوَار)

۵۔یہ گدھا غیر معمولی تیز رفتار سے چلے گا اور ایسے لمبے فاصلے جو عام حیوانی سواریاں مہینوں میں طے کرتی ہیں وہ دنوں بلکہ گھنٹوں میں طے کر لے گا۔ (نُزْهَتُ الْمَجَالِس)

۶۔سفر کے دوران اس گدھے کے لئے باقاعدہ سٹاپ مقرر ہوں گے۔اور ہر سٹاپ سے دوبارہ روانگی کے وقت سواریوں کو بلایا جائے گا کہ وہ اپنی سیٹوں پر بیٹھیں۔یوں یہ گدھا عام لوگوں کے لئے تیز اور آرام دہ سواری کے طور پر کام کرے گا (بِحَارُ الانوار)

۷۔جو مسافر اس گدھے کے پیٹ میں بیٹھیں گے وہ اس آگ سے نہیں جلیں گے جو وہ

بطور خوراک کھائے گا جس کا مطلب ہے کہ اس کا آگ والا کمپارٹمنٹ بیٹھنے والے کمپارٹمنٹ سے علیحدہ ہوگا (بحارالانوار)

۸۔ یہ گدھا سمندر پر بھی سفر کرے گا اور اس کی لہروں پر سوار ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پہنچے گا (نزہت المجالس)

۹۔ جب یہ گدھا سمندروں پر سفر کرے گا تو کچھ ایسا ہوگا کہ اس کا سائیز پھیل جائے گا اور کھانے پینے کی اشیاء کے پہاڑ اپنی پشت پر لادے سمندروں کے پار جائے گا۔ کئی دفعہ دجال اس گدھے کے ذریعہ خوراک کے بڑے بڑے ڈھیر ایسی غریب اقوام کو بھیجے گا جو اس کی ماتحی قبول کرتی ہوئی اس کی مرضی کے مطابق چلیں گی (صحیح بخاری)

۱۰۔ یہ عجیب وغریب گدھا آسمان میں بھی پرواز کرے گا اور اتنی لمبی لمبی چھلانگیں لگائے گا کہ مشرق سے مغرب تک جا پہنچے گا۔ اس کا ایک قدم اگر مشرق میں ہوگا تو دوسرا مغرب میں گویا ایک براعظم سے Take off کرے گا تو دوسرے براعظم میں Land کرے گا۔

(نزہت المجالس)

۱۱۔ جب یہ گدھا ہوا میں اڑے گا تو بادلوں سے بھی اوپر پرواز کرے گا۔

(کنز العمال)

۲۱۔ اس کے ماتھے پر چاند ہوگا۔ بظاہر چاند سے یہاں مراد Head Light ہیں جو آج کل کی سواریوں کے آگے لگی ہوتی ہیں (کنز العمال)

سبحان اللہ۔ مسیح موعود کے زمانہ کے واقعات کس تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھا دیئے تھے حضور رحمہُ اللہ تعالیٰ احادیث سے اخذ کردہ نشانیوں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جس وضاحت کے ساتھ اس گدھے کے متعلق بیان کیا گیا ہے جس کو بروئے کار لا کر دجال دنیوی فتوحات حاصل کرے گا ہم حیران ہیں کہ کیا قاری کو اس کے پہچاننے کے لئے کوئی مزید مدد درکار رہے۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں دجل کا نام انہیں عظیم عیسائی طاقتوں کو دیا گیا ہے جن کے لئے مقدر تھا کہ وہ ایک روز تمام دنیا پر حکومت کریں گی۔ ہوائی جہاز۔ بحری جہاز اور مختلف گاڑیاں دجال

کے گدھے ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہی ہیں جن کی غیر معمولی تیز رفتاری نے عیسائی اقوام کو دنیا پر غلبہ حاصل ہونے میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔

پس جب دجال کے گدھے کو شناخت کرلیا تو اس کے مالک کو پہچاننے میں کیا مشکل رہی۔ یہی وہ طاقتیں ہیں جن کے روحانی مقابلہ کے لئے خدا نے مسیح موعود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہے جب دجال کی فوجیں صف آرا ہو چکیں تو ضروری تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق مسیح موعود بھی اپنی فوجوں کے ساتھ ان کے بالمقابل اتارا جاتا۔

مردوں اورعورتوں کی غیر طبعی مساوات کے خوفناک نتائج

اللہ تعالیٰ نے مرد وعورت کو بطور ''زوجین'' بنایا ہے یعنی ایک دوسرے کا جوڑا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔یعنی باہم Complementary ہیں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہے۔بعض باتوں میں مرد افضل ہیں اور بعض میں عورتیں لیکن مجموعی طور پر مرد کو زیادہ قوی بنایا گیا ہے ۔ چنانچہ بعض کاموں کے لئے مرد موزوں ہیں اور بعض کے لئے عورتیں۔اسی طرح بعض کام مرد نہیں کرسکتے اور بعض کام عورتیں نہیں کرسکتیں ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ایک کی خوبیاں دوسرے کی خامیوں کو ڈھانپتی ہیں گویا وہ ایک دوسرے کے لباس کے طور پر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کا دائرہ کار (Role) ایک دوسرے سے مختلف رکھا ہے۔ یہ جو ایک دوسرے پر انحصار (Interdependence) ہے اس میں گہری حکمت ہے۔اسی سے گھریلو زندگی کو استحکام (Stability) ملتا ہے۔ یہ فطرت اور نظام قدرت کے مطابق ہے جس کے نظارے ایک ایٹم سے لے کر پوری کائنات میں جاری وساری نظر آتے ہیں۔اس لئے جیسے ہی مساوات کے جذباتی نعرہ سے متاثر یا مرعوب ہوکر مرد یا عورت اپنا وہ رول چھوڑ کر جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر کیا ہے دوسرے کا رول ادا کرنا شروع کرتے ہیں تو گھریلو زندگی میں عدم استحکام آنا شروع ہوجاتا ہے ۔ پھر چونکہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی تو باہم جھگڑے

شروع ہوجاتے ہیں جو گھروں کا سکون برباد کر دیتے ہیں اور اکثر طلاقوں تک نوبت پہنچتی ہے۔ بچوں کو بوجھ سمجھ کر ان سے بچتے ہیں اور اگر ہوں تو ان کی نفسیات اور تربیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ بعض صورتوں میں تو ایسے لوگ بے اولاد ہی گزر جاتے ہیں۔

مغربی معاشرہ جو مساواتِ مرد وزن کا علمبردار ہے اب اس میں اس مسئلہ نے شدت سے اپنا سر اٹھایا ہے۔حکومت آسٹریلیا نے اس مسئلہ کے تجزیہ کے لئے ایک تحقیق کروائی ہے جس کے نتائج چند روز قبل شائع ہوئے ہیں۔اس کے مطابق بچوں کی پیدائش میں خطرناک حد تک کمی واقع ہوگئی ہے کئی خاندانوں کی نسل ختم ہوگئی ہے۔آج کل ۲۶ فیصد مرد اور ۴۰ فیصد عورتیں ایسی ہیں جن کی کوئی اولاد نہیں ہے۔پورا وقت ملازمت کرنے والی عورتوں کے ماں بننے کا امکان بہت کم ہے بہ نسبت ان عورتوں کے جو کام نہیں کرتیں یا جز وقتی ملازمت کرتی ہیں۔۲۰ تا ۳۹ سال کی عمر کے افراد (مرد وعورت) نے کہا ہے کہ مثالی خاندان دو یا تین بچوں پر مشتمل ہونا چاہیے لیکن عملاً تعداد اس سے کم ہوتی ہے۔ایسے گھر دن بدن زیادہ ہوتے جارہے ہیں جن میں صرف ایک فرد (مرد یا عورت) رہتا ہے۔ اس رفتار سے ۲۰۲۵ء میں آسٹریلیا کا ہر تیسرا گھر ایسا ہوگا جس میں صرف ایک شخص اکیلا رہتا ہوگا۔ آگے پیچھے کوئی رشتہ دار اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوگا اور اس کی وفات کے ساتھ اس کے خاندان کا چراغ گل ہوجائے گا۔جب لوگوں سے اس صورتحال کی وجہ دریافت کی گئی تو جوانہوں نے بتایا وہ خالصتہً یہ تھا کہ:۔

> ''بچوں کی پرورش کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ایک مضبوط و مستحکم گھر ہو یعنی ایک Secure and Stable Home ہو۔میاں بیوی (قانونی یا ڈی فیکٹو) کے باہمی تعلقات مستحکم ہوں۔پھر دونوں کی آمدن بھی معقول اور مستحکم ہو۔

(ماخوذ از سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۸ جنوری ۲۰۰۵ء)

یہ تو وہی بات ہوئی نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

اسلام نے مردوں اور عورتوں کے رول متعین کر دیئے ہیں۔مرد کو عورت کے لئے قوام بنایا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ اس کے لئے روزی مہیا کرنے والا، اس کے سارے معاملات کا نگران

اور متکفل اور محافظ۔ اسلام نے مرد کو خاندان کا سربراہ بنایا ہے بوجہ اس کی بہتر جسمانی و دماغی صلاحیتوں کے اور خاندان کے نان ونفقہ اور دیگر ضروریات کی ذمہ داری کی وجہ سے۔اس طرح ایک رنگ میں مرد کو عورت کا خادم اور نوکر بنایا گیا ہے۔

لیکن بعض صورتوں میں عورتوں کو بھی گھر سے باہر کام کرنا پڑتا ہے اس لئے عورت کو بھی کمانے کی اجازت ہے۔چنانچہ فرمایا:

''مردوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لئے اس میں حصہ ہے جو وہ کمائیں۔''

(النساء:۳۳)

چونکہ روٹی کمانے کی ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی ہے نہ کہ عورت پر اس لئے عورت کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔نہ ہی مرد کو بوجہ قوام ہونے کے عورت سے ایسی توقعات وابستہ کرنی چاہئیں۔ البتہ اگر عورت اپنی خوشی سے اپنی کمائی میں سے اپنے خاوند کی مدد کرنا چاہے تو وہ ایسا کرسکتی ہے اور خاوند کو بیوی سے بطور عطیہ لینے کی اجازت ہے اور چونکہ بیوی کے لئے گھر پر خرچ کرنا فرض نہیں اس لئے خاوند کو اس کے لئے بیوی کا ممنون ہونا چاہئے خواہ وہ رقم خود اس پر یا اس کے بچوں پر ہی خرچ ہوتی ہو۔عورت کو اپنے مال میں سے جس پر اس کا قبضہ ہو (جیسے وصول شدہ حق مہر) اپنے خاوند کو دے سکتی ہے۔جیسے خدا نے فرمایا:

''اور عورتوں کو ان کے مہر دلی خوشی سے ادا کرو۔ پھر اگر وہ اپنی دلی خوشی سے اس میں سے کچھ تمہیں دینے میں راضی ہوں تو اسے بلاتردد شوق سے کھاؤ۔''

(النساء:۵)

عورت کا دلی خوشی سے دینا ضروری ہے۔ جبراً اس کا مال نہیں لیا جاسکتا۔اگر چہ خاوند کے مال میں بیوی کا حق ہے لیکن خاوند بیوی کے مال سے تبھی لے سکتا ہے جب وہ دلی خوشی سے دے۔

قرآن مجید کے مطابق اگر چہ عورت کو خاوند کی مرضی سے کام کرنے کی اجازت ہے لیکن اس کا عمومی دائرہ کار اس کا گھر ہی ہے۔جیسے اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کو ارشاد فرمایا:

''اپنے گھروں میں ہی رہا کرو اور گزری ہوئی جاہلیت کے سنگھار جیسے سنگھار کی نمائش نہ کیا کرو۔''

(الاحزاب:۳۴)

اس حصہ آیت پر حضرت مصلح موعودؓ کے تفسیری نوٹس کے مطابق انگریزی ترجمہ قرآن میں مندرجہ ذیل تشریح کی گئی ہے(انگریزی سے ترجمہ):۔

''ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا دائرہ کار زیادہ تر اس کا گھر ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ گھر کی چار دیواری کو چھوڑ نہیں سکتی۔وہ جتنی بار بھی اپنے جائز کام کاج کے لئے ادھر ادھر جانا چاہے جاسکتی ہے۔لیکن مخلوط سوسائٹی میں گھومنا پھرنا یا ہرطرح کے چھوٹے موٹے کاموں یا پیشوں (Profession) وغیرہ کے لئے مرد کے شانہ بشانہ کام کرنا اور یوں بطور گھر کی مالکن کے جو مخصوص گھریلو کام اس کے ذمہ ہیں ان سے غفلت برت کر یا ان کو نقصان پہنچا کر ایسا کرنا اسلام جس مثالی عورت کا تصور پیش کرتا ہے اس کے مطابق نہیں۔

آنحضرت ﷺ کی ازواج کو بالخصوص گھروں کے اندر رہنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ بوجہ امہات المومنین ہونے کے ان کی اعلیٰ حیثیت کا وقار اس کا متقاضی تھا۔نیز اس لئے بھی کہ مسلمان اکثر ان کے پاس احتراماً حاضر ہوتے تھے اور کئی اہم دینی معاملات میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔لیکن یہ حکم سبھی دیگر مسلمانوں عورتوں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔قرآن کریم کا یہ طرز کلام ہے کہ اگرچہ بظاہر وہ خصوصی طور پر آنحضرت ﷺ سے مخاطب ہوتا ہے لیکن وہ خطاب اسی طرح سب مسلمانوں کے لئے بھی ہوتا ہے۔اسی طرح یہ حکم اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کو مخاطب ہو کر دیا گیا ہے پر سبھی مسلمان عورتیں اس میں شامل ہیں۔''

پس اسلام جس کلچر کو فروغ دینا چاہتا ہے اس میں پیشوں کو اختیار کرنا یا ان کی تعلیم حاصل

کرنا مردوں کے دائرہ کار میں آتا ہے۔عورتیں ضرور تعلیم حاصل کریں لیکن وہ تعلیم ایسی ہو جوان کے دائرہ کار اور بچوں کی تعلیم و تربیت یا جماعتی وقومی ضرورت کے مناسب حال ہو۔مردوں والے پیشے اختیار کرنا اور مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا ایک صالحہ مسلمان عورت کی شان کے خلاف ہے۔خدا کا قانون سب کے لئے یکساں ہے۔غیر طبعی مساوات کے جو نتائج مغربی قومیں بھگت رہی ہیں ان کی اندھی تقلید کرنے والے بھی ان ہولناک نتائج سے بچ نہیں سکتے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

’’اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَعَلَى الْمَوْلُوْدِلَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ (البقرہ:۲۳۴)یعنی یہ بات سب مردوں کے ذمہ ہے کہ جو عورتوں کو کھانے کے لئے ضرورتیں ہوں یا پہننے کے لئے ضرورتیں ہوں وہ سب ان کے لئے مہیا کریں۔اس سے ظاہر ہے کہ مرد عورت کا مربی اور محسن اور ذمہ دار آسائش کا ٹھہرایا گیا ہے۔اور وہ عورت کے لئے بطور آقا اور خداوندِ نعمت کے ہے۔اسی طرح مرد کو بہ نسبت عورت کے فطرتی قویٰ زبردست دیئے گئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے مرد عورت پر حکومت کرتا چلا آیا ہے۔‘‘

(چشمہ معرفت روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۸۸)

پھر فرماتے ہیں:

’’خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ اور اسی لئے مردوں کو عورتوں کی نسبت قویٰ زیادہ دیئے گئے ہیں۔اس وقت جو نئی روشنی کے لوگ مساوات پر زور دے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کے حقوق مساوی ہیں ان کی عقلوں پر تعجب آتا ہے۔وہ ذرا مردوں کی جگہ عورتوں کی فوجیں بنا کر جنگوں میں بھیج کر دیکھیں تو سہی کہ کیا نتیجہ مساوی نکلتا ہے یا مختلف؟‘‘

(ملفوظات جلد ہفتم صفحہ ۱۳۴ مطبوعہ لندن)

اللہ تعالیٰ نے مرد کو جو رول (Role) تفویض کیا ہے۔ وہ حضرت مسیح موعودؑ کی اس تحریر سے ظاہر ہے:

''اسلام میں عورتوں کی کس قدر عزت کی گئی ہے۔ ایک طور سے تو مردوں کو عورتوں کا نوکر ٹھہرایا گیا ہے۔ اور بہر حال مردوں کے لئے قرآن شریف میں حکم ہے کہ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ یعنی تم اپنی عورتوں سے ایسے حسن سلوک سے معاشرت کرو کہ ہر ایک عقلمند معلوم کر سکے کہ تم اپنی بیوی سے احسان اور مروت سے پیش آتے ہو۔'' (ایضاً)

اگر دنیا اپنے گھروں کو امن کا گہوارہ بنانا چاہتی ہے تو اسے اسی تعلیم پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔

(الفضل انٹرنیشنل 11.3.2005)

خدائے رحمٰن کا ایک انعام۔ اونٹ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اونٹوں کی پیدائش پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔

چنانچہ سورہ غاشیہ میں ارشاد ہوا کہ اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ کہ کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح تخلیق کئے گئے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ خدا تعالیٰ کے حسن واحسان اور صفات کاملہ وحسنہ کا آئینہ دار ہے اور چونکہ ہر چیز کو خلعتِ وجود اس غیر محدود طاقتوں والی ہستی کے ہاتھوں پہنایا گیا۔ لہٰذا اس کے راز قیامت تک کھلتے جائیں گے۔ اور یہ سلسلہ غیر محدود اور غیر مختتم ہوگا۔

اونٹ پر ایک اچٹتی نظر

سرسری نگاہ سے دیکھیں تو یہ جانور بے ڈھنگا عجیب وغریب موٹے موٹے لٹکتے ہونٹوں والا غیر متناسب لمبی گردن۔ پتلی ٹانگوں۔ چوڑے چوڑے پاؤں۔ ناخوشگوار بو اور کھنکھناتے گھٹنوں والا نظر آئے گا۔ یوں لگتا ہے جیسے فرشتوں کی ایک کمیٹی نے مل کر بنایا ہو دیکھنے والوں نے کہا اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ اور کسی کو یہ فکر کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس کا شتر کینہ ضرب المثل اس کو سدھانا کار دشوار اور اس پر سواری بہت مشکل ہے۔ گو چہرے سے بڑا متین وسنجیدہ دکھائی دیتا ہے۔

تخلیقی معجزہ

لیکن اونٹ کی خصوصیات پر ذرا غور سے نگاہ ڈالیں تو یہ اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم انعام دکھائی

دیتا ہے ۔ یہ ایک تخلیقی معجزہ ہے ۔ اور بجا طور پر صحرا کا جہاز کہلاتا ہے ۔ صحرا ہماری زمین کے چھٹے حصہ پر پھیلا ہوا ہے ۔ جہاں بار برداری کے لئے اونٹ ہی ایک کارگر ذریعہ ہے ۔ کل دنیا میں تقریباً ڈیڑھ دو کروڑ اونٹ خدمت انسان میں مشغول ہیں ۔ پاکستان اور بھارت کے علاوہ براعظم افریقہ ۔ مشرق وسطیٰ روس ۔ چین ۔ منگولیا ۔ افغانستان اور ایران کے ممالک بالخصوص اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ راجستھان سیکٹر میں جو پاکستان اور بھارت کی جنگ ہوئی اس میں دونوں ممالک کی فوجوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ۔

عجیب خواص کا حامل

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کے جو اعضاء زیادہ بے ڈھنگے نظر آتے ہیں وہی سب سے زیادہ قیمتی صفات کے حامل ہیں ۔ آنکھوں کی بناوٹ ایسی غلاف دار اور جھالر والی کہ صحرا میں اڑنے والی ریت کے لئے بطور چھلنی کے کام آتی ہیں اور ریت آنکھوں تک نہیں پہنچ پاتی اس کے کان اور نتھنے ایسے کہ جب ارد گرد ریت اڑے تو انہیں بند کر لیتا ہے ۔ پاؤں جو غیر متناسب طور پر بڑے نظر آتے ہیں وہ چونکہ چوڑے ۔ باہر کو پھیلے ہوئے اور گدی دار ہیں ریت میں نہیں دھنستے ۔

لمبی گردن کے ذریعہ اسے صحراؤں کی جھاڑیاں چننے میں آسانی ہوتی ہے ۔ اور جب بوجھ لے کر اٹھتا ہے تو گردن کا زور استعمال کرتا ہے ۔ اس کے ہونٹ بڑے موٹے موٹے اور سخت ربڑ جیسے ہوتے ہیں ۔ اور سخت نوکیلے کانٹوں کو بھی کتر لیتے ہیں ۔ ایسے سخت کانٹے بھی جو جوتوں کے تلووں سے بھی گذر جائیں ۔ جھاڑیاں توڑنے کے لئے اونٹ کو زبان باہر نہیں نکالنی پڑتی اور اس طرح جسم کا پانی زبان کے ذریعہ ضائع نہیں ہوتا ۔

اونٹ کا معدہ بھی خوب ہے اس کے چار حصے ہوتے ہیں ۔ جس میں کھائی ہوئی اشیاء بار بار چکر لگاتی رہتی ہیں ۔ اونٹ اگر بھوکا ہو تو کسی جھونپڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے چھت کا خشک گھاس پھونس بھی کھا جائے گا پلاسٹک اور تانبہ کی چیزیں بھی نگل جائے گا ۔ اور معدہ کے اس عمل میں ایسی چیزوں سے بھی طاقت حاصل کر لیتا ہے جن میں بظاہر غذائیت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا فضلہ بہت خشک اور تھوڑا ہوتا ہے ۔ اور اس کی مینگنیاں خوب جلتی ہیں ۔

اونٹ کی کوہان بھی بہت کام کی چیز ہے اس میں اونٹ کے پورے جسم کے وزن کے

پانچویں حصہ کے برابر چربی جمع ہوتی ہے۔ دواڑھائی من سے کم کیا ہوگی۔ جب اونٹ کو غذا نہ ملے تو یہی چربی گھلتی اور طاقت بہم پہنچاتی ہے۔اونٹ کی ساری چربی کوہان میں جمع ہوتی ہے۔لہٰذا باقی جسم چربی سے خالی ہوتا ہے۔اسی لئے اونٹ کے گوشت میں چربی نہیں ہوتی۔جسم کی گرمی کوہان کے علاوہ باقی جسم سے خارج ہوتی رہتی ہے۔لیکن اس کے جسم سے پسینہ خارج نہیں ہوتا۔ یوں پانی کی ضرورت کم ہوجاتی ہے۔

سب سے اہم خصوصیت

اونٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی پانی کی ضرورت کم از کم ہوتی ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اونٹ کی ساخت میں درجنوں ایسے عوامل ہیں۔ جو پانی کے ضیاع کو روکتے اور اس کی ضرورت کو قلیل ترین حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ باقی جانوروں کے جسم سے اگر پیشاب کے ذریعہ یوریا خارج نہ ہو تو ان کے جسموں میں زہر پھیل جائے۔لیکن اُونٹ کا بدنی نظام ایسا ہے کہ پیشاب جگر میں بار بار چکر لگاتا رہتا ہے اور جگر یوریا کو لحمیات (Protein) میں تبدیل کردیتا ہے اور پیشاب میں سے طاقت مہیا کرنے والے اجزا اچھی طرح نچوڑ لئے جاتے ہیں۔اس طرح غذا اور پانی دونوں کی بچت ہوجاتی ہے اور پیشاب کی مقدار بہت قلیل رہ جاتی ہے۔(اس جگہ مراد جی ڈیسائی یاد آتے ہیں جو اپنے ہی شربت قارورہ کا ایک جام ہر صبح نوش فرماتے ہیں لیکن اونٹ کے طبعی نظام سے کیا مقابلہ ''کجا رام رام کجا ٹیں ٹیں'') پھر باہر کی گرمی روکنے کے لئے اسے قدرت کی طرف سے بالوں کی موٹی تہہ عطا کردی گئی ہے۔ اگر اونٹ زیادہ پر مشقت کام نہ کر رہا ہو اور اسے چرنے کا موقع ملتا رہے تو یہ اپنی ضرورت کا سارا پانی اپنے چارہ کی نمی سے حاصل کرلیتا ہے اور دس ماہ تک بغیر پانی پیئے گزارہ کرسکتا ہے۔ اگر کبھی پانی کی نایابی کی مشکل دقت آن پڑے تو اپنے ہی جسم کے پٹھوں سے پانی حاصل کرنا شروع کردیتا ہے جسم گھلتا جاتا ہے یہاں تک کہ بغیر خطرناک کمزوری کے پورے جسم کے چوتھے حصہ کے وزن کے برابر پانی حاصل کرلیتا ہے۔

اونٹ اور گھوڑے کا مقابلہ

ایک جوان اونٹ گھوڑے کے مقابلہ میں زیادہ سفر کرسکتا ہے اونٹ چھ من وزن اٹھا کر ۲۵

میل یومیہ کے حساب سے مسلسل تین دن سفر کرسکتا ہے وزن کے بغیر دس میل فی گھنٹہ کے حساب سے ۱۸ گھنٹے مسلسل دوڑ سکتا ہے۔ایک بار آسٹریلیا میں اونٹ اور گھوڑے کی دوڑ کا مقابلہ ہوا۔۱۱۰ میل کا سفر طے کرنا تھا۔گھوڑا معمولی فاصلہ سے مقابلہ جیت گیا لیکن منزل پر پہنچ کر گرا اور مر گیا۔

اس کے مقابلہ میں اونٹ ایک رات سویا اور اگلے روز پھر ۱۱۰ میل اتنے ہی وقت میں طے کر گیا۔

سنجیدہ طبع ۔مشقت پسند

اونٹ ایک باوقار سنجیدہ طبع ۔مشقت پسند۔پابند نظم جانور ہے۔قطار میں چلتا ہے اور اپنے قائد کے نقش قدم پر چلتا ہے۔اگر صبر کا لفظ جانوروں کے لئے استعمال ہوسکتا ہو۔تو اونٹ بے انتہا صبر کا مادہ رکھتا ہے شاید خدا نے اسی لئے قرآن کریم میں مثال دی ہے کہ

وہ چاہتا ہے کہ انفرادی اور قومی ترقی کے جویاں اس سے سبق حاصل کریں۔

اونٹ نافع الناس جانور ہے اپنی چالیس سالہ زندگی میں دو نسلوں کی خدمت کرتا ہے۔ہل چلاتا ہے۔کنوئیں سے پانی نکالتا ہے وزن اٹھاتا ہے۔اونٹنی بچہ کی پیدائش کے بعد تین سال تک چار پانچ سیر دودھ روزانہ دیتی ہے۔اس کے بال بہت مضبوط اور گرم ہوتے ہیں جس سے کمبل اور کپڑے بنائے جاتے ہیں۔گوشت کھانے کے کام آتا ہے۔یہ زندگی میں ہی نہیں مرنے کے بعد بھی بنی نوع انسان کے کام آتا ہے۔اس کے چمڑے سے صحرا نشین خیمے بناتے ہیں۔

قرآنی دعوت غور وفکر

یہ مضمون تشنہ ہے اور تشنہ رہے گا۔قرآن کریم اونٹ کی تخلیق پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ہر بار غور وفکر سے تحقیق کے نئے میدان سامنے آتے رہیں گے۔یہ دعوت ہم سب کے لئے ہے۔قیامت تک کے لئے ہے۔اور حقیقت یہی ہے کہ

ے تیری قدرت کا کوئی بھی انتہاء پاتا نہیں
کون پڑھ سکتا ہے سارا دفتران اسرار کا

(''لاہور'' 8.11.81)

آسمان میں کتنے سیارے ایسے ہوں گے جن میں چلنے پھرنے والی مخلوق بستی ہے؟

صحیح علم تو صرف خدا ہی کو ہے البتہ سائنسدان اندازے ضرور لگا رہے ہیں۔ان کو سننا بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔اس لئے کہ قرآن واضح طور پر بتا تا ہے کہ خدا کی نشانیوں میں زمین و آسمان کی تخلیق اوران دونوں کے درمیان زندہ چلنے پھرنے والی مخلوق کا وجود ہے جواس نے وہاں پھیلا رکھے ہیں اوروہ اس بات پر بھی خوب قادر ہے کہ جب وہ چاہے انہیں اکٹھا کر دے۔

(الشوریٰ ۳۰)

اس سوال کے دو حصے ہیں ایک یہ کہ کائنات میں کل ستارے کتنے ہیں اور دوسرا یہ کہ کتنے سیارے ایسے ہیں جو زندہ مخلوق کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔سوال کے پہلے حصہ پر آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی نے سٹڈی کی ہے اور دوسرے حصہ پر ملبورن کی Swinburne University اور سڈنی کی نیوساؤتھ ویلز یونیورسٹی نے مل کر تحقیق کی ہے۔

ان تحقیقات کا نچوڑ پیش کرنے کے سے پہلے کائنات کی وسعت کا ایک اندازہ پیش کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔کائنات جن انتہائی چھوٹے ذرات سے بنی ہے (یعنی ایٹم) ان کا نظام بھی ہمارے نظام شمسی سے مشابہ ہے۔جس طرح ہمارے سورج کے گرد مختلف دائروں میں سیارے محو گردش ہیں ایسے ہی ایٹم کے مرکز (Nucleus) کے ارد گرد مختلف دائروں میں الیکٹران گھومتے ہیں۔ہمارا نظام شمسی ایک خاندان کی طرح ہے جو اپنی کہکشاؤں کے اندر چکر بھی لگا تا ہے اور ساتھ آگے بھی کسی سمت

بڑھ رہا ہے۔ ہمارے نظام شمسی کی طرح کے ایک سوارب نظام اس کہکشاں کا حصہ ہیں۔ ہر نظام میں کچھ ستارے (Stars) ہوتے ہیں جو ذاتی طور پر روشن ہوتے ہیں اور ان سے حرارت اور روشنی خارج ہوتی ہے یعنی سورج۔ پھر ہر ستارے کے گرد گھومنے والے سیارے (Planets) ہوتے ہیں جیسے ہماری زمین اور پھر ہر سیارے کے گرد گھومنے والے اپنے اپنے ''تابع سیارے (Satelites ہوتے ہیں جیسے ہمارا چاند۔ جس کہکشاں (Milky way(Galaxy کا حصہ ہمارا نظام شمسی ہے (اور اس میں اس طرح کے سوارب اور نظام بھی ہیں) اس کہکشاں جیسی کوئی سوارب مزید کہکشائیں ہماری کائنات میں چکر لگاتی لگاتی اپنے مستقر کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ہماری کائنات کوئی ۱۳.۷ بلین (ارب) سال پہلے بگ بینگ (دھماکہ) کے ساتھ ایک ایسے نقطہ سے پھوٹی تھی جس کی کثافت (Density) کہتے ہیں لامحدود (Infinity) تھی لیکن حجم (طول ،عرض ، گہرائی) صفر تھا۔ سائنسدان نیست (Nothingness) یا عدم وجود کو اسی طرح بیان کر سکتے ہیں کہ جس نقطہ سے کائنات پھوٹی تھی (Singularity) نہ اس کی لمبائی تھی نہ چوڑائی نہ موٹائی اور نہ ہی اس پر فزکس کے قوانین لاگو ہوتے تھے۔

سیدھی بات یہ ہے کہ اس کو ہم نیست سے ہست کرنا یا عدم وجود سے حیز وجود میں لانا کہتے ہیں اور یہ کام اسی خالق ،قادر اور علیم ہستی کا ہوسکتا ہے جو خود مکاں اور زماں (Space and Time) اور مخلوق کی دوسری کمزوریوں سے پاک ہو اور اس کی صفات اور طاقتیں لامحدود ہوں۔

کائنات چونکہ اتنی وسیع ہے کہ عام میلوں کے پیمانہ سے اسے ماپنا ممکن نہیں اس لئے فاصلے ظاہر کرنے کے لئے نوری سال (Light year Distance) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے یعنی یہ وہ فاصلہ ہے جو روشنی یا بجلی ۳ لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہوئی ایک سال میں طے کرتی ہے۔ ایک نوری سال ۹۴۶۷.۲۸ بلین (ارب) کلومیٹر کا ہوتا ہے۔ سورج زمین سے ۱۵۰ ملین (۱۵ کروڑ) کلومیٹر دور ہے اور روشنی وہاں سے زمین تک پہنچنے میں ۹ منٹ لیتی ہے۔ ہمارے نظام شمسی کا سب سے دور سیارہ پلوٹو ہے جو سورج سے ۵۹۰۰ ملین کلومیٹر دور ہے اور روشنی وہاں تک پہنچنے کے لئے پانچ گھنٹے اور ۵۴ منٹ لیتی ہے۔ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔ سٹیفن ہاکنگ کا اندازہ ہے کہ ہر ہزار ملین سالوں میں کائنات پانچ تا دس فیصد تک پھیل جاتی ہے۔ کائنات میں کہیں نہ کہیں

ستارے جل جل کر راکھ بھی ہورہے ہیں اور کہیں نئے بھی پیدا ہورہے ہیں۔ (گویا ستاروں میں بھی حیات وممات کا سلسلہ جاری ہے۔ گویا ہر چیز فانی ہے ہمیشہ رہنے والا صرف خالق مطلق ہی ہے)

کائنات میں اس قدر مادہ بکھرا پڑا ہے کہ تمام کروں کے مجموعی مادہ (Matter) سے نو گنا زیادہ ہے اس کو سیاہ مادہ (Dark Matter) کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ نظر نہیں آسکتا اس لئے اس کو سیاہ مادہ کہتے ہیں۔ کسی چیز کے نظر آنے کے لئے ضروری ہے کہ روشنی اس سے ٹکرا کر دیکھنے والے تک واپس پہنچے۔ لیکن یہ سیاہ مادہ اتنا زیادہ کثیف (Dense) ہے اور اس کی وجہ سے اس کی کشش ثقل (Gravity) اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ جو چیز اس کے قریب آئے اسے کھینچ کر اپنے اندر ہڑپ کر لیتی ہے۔ روشنی جیسی ہلکی چیز بھی اس کو چھو کر واپس نہیں آسکتی اسی میں جذب ہو جاتی ہے اس لئے اسے کبھی دیکھا نہیں جا سکتا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں زمین وآسمان کے درمیان پائے جانے والے اس مادہ کا بھی ذکر ہے جیسے فرمایا لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (المائدہ:۱۸) اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے اور اسکی بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے۔ وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر جسے وہ چاہے دائمی قدرت رکھتا ہے۔ (دونوں کے درمیان ۹۰ فیصد سیاہ مادہ ہے)

ستاروں کی تعداد کے بارہ میں تحقیق کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر سائمن ڈرائیور (Dr Simon Driver) آف آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی کہتے ہیں کہ دنیا میں پہلی بار ہم نے ہی آسمان کے تاروں کو گننے کی کوشش کی ہے۔ (شاید ان کو علم نہیں کہ اگلے وقتوں میں عاشق بھی ہجر کی طویل راتوں میں تارے ہی گنا کرتے تھے) جو تارے ہم کمپیوٹروں کی مدد سے گن سکے ہیں ان کی تعداد ستر ہزار ملین ملین ملین (سات عدد کے دائیں طرف بائیس صفر) نکلتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ تعداد کائنات کے صرف نظر آنے والے حصہ کے ستاروں کی ہے۔ وہ حصہ جو نظروں سے اوجھل ہے اس کے بارہ میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے نہ ہی ابھی تک کوئی ایسی دوربین بنی ہے جو ساری کائنات کا احاطہ کر سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا بھر کے بحر و بر میں پائی جانے والی ریت کے کل جتنے ذرے ہیں یہ تعداد اس سے بھی دس گنا زیادہ ہے۔

ستاروں کی تعداد کا پہلا اندازہ جیسا اوپر بیان ہوا وہ دس ہزار ملین ملین ملین (۱۰۰ بلین × ۱۰۰ بلین)

تھا جبکہ جدید اندازہ ستر ہزار ملین ملین ملین یعنی سات گناہ زیادہ ہے اور یہ اندازہ بھی کائنات کے صرف نظر آنے والے حصہ کا ہے۔ علاوہ ازیں وہ کہتے ہیں کہ بے شمار ستارے ایسے ہیں جن کی روشنی ابھی تک ہم تک پہنچی ہی نہیں لہٰذا وہ نظر نہیں آسکتے۔ بگ بینگ (یعنی کن فیکون) کا واقعہ اگر چہ ۱۳.۷ ارب سال (۱۳.۷ بلین سال) پہلے گزرا ہماری زمین کوئی ساڑھے چار ارب سال پہلے اپنی ماں (سورج) کے بطن سے علیحدہ ہوئی۔ ڈاکٹر ڈرائیور سے جب پوچھا گیا کہ کیا وہ یقین رکھتے ہیں کہ زمین سے باہر بھی زندگی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ستر ہزار ملین ملین ملین ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ کہیں نہ کہیں زندگی کا پایا جانا ناگزیر (Inevitable) ہے۔

(ماخوذ سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۲ جولائی ۲۰۰۳ء)

سوال کے دوسرے حصہ پر تحقیق ملبورن کی SwinBurne University of Tecnology اور سڈنی کی NSW یونیورسٹی نے مل کر کی ہے۔ لیکن ان کی سٹڈی صرف ہماری اپنی کہکشاں تک ہی محدود ہے جس کا حصہ ہمارا نظام شمسی اور ہماری زمین ہے۔ ہمیں دلچسپی بھی زیادہ اسی میں ہے۔ دوسری اربوں کہکشائیں تو ہم سے بہت ہی دور ہیں۔ یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ زندگی کتنے سیاروں میں پائی جاسکتی ہے انہوں نے پہلے یہ طے کیا کہ زندگی کے قیام کے لئے کن حالات اور چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے اور پھر ایسے سیاروں کا اندازہ لگایا جائے جن میں مناسب حالات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ کہکشاں بھی ایک شہر کی طرح ہوتی ہے۔ شہر کے جس علاقہ میں گھر قریب قریب ہوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہاں آبادی زیادہ ہوگی۔ اسی طریق پر ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ جس علاقہ میں ستاروں کے جھرمٹ ہوں گے وہاں زندگی کے قابل سیاروں کے پائے جانے کا زیادہ امکان ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب تک بعض عناصر (Elements) سیاروں میں نہ پائے جائیں زندگی نہیں ہوگی مثلاً کاربن، آکسیجن، نائٹروجن اور بھاری دھاتیں (Metals) وغیرہ۔ لیکن یہ دھاتیں بھی ایک خاص حد کے اندر ہونی چاہئیں۔ نہ بہت زیادہ ہونی چاہئیں نہ بہت کم تیسری بات یہ کہ زندگی کے قیام کے مناسب حال سیارے نہ تو کہکشاں کے مرکز سے بہت دور ہونے چاہئیں۔ نہ بہت زیادہ ہونی چاہئیں نہ بہت کم۔ تیسری بات یہ کہ زندگی کے قیام کے مناسب حال سیارے نہ تو کہکشاں کے مرکز سے بہت دور ہونے چاہئیں نہ بہت نزدیک۔ چوتھی بات یہ کہ وہی

سیارے زندگی کی پیدائش کے لئے مناسب ہیں جو اپنی عمر کے اعتبار سے بچے ہوں نہ بوڑھے۔ دونوں صورتوں میں حالات زندگی کے لئے مناسب نہیں رہیں گے۔ایسے سیاروں کی عمر تین تا پانچ ارب سال ہونی چاہئے۔(جیسے ہماری زمین کی عمر ساڑھے چار ارب سال ہے)NSW یونیورسٹی کے پروفیسر Dr. Lineweaver نے بتایا کہ اس موضوع پر سب سے پہلی سٹڈی ہم نے کی ہے اس سے پہلے کسی نے حیات کے قابل سیاروں کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا تھا۔ ہمارا اندازہ ہے کہ ہماری کہکشاؤں میں کوئی دس فیصد سیارے ایسے ہیں جن میں زندگی وجود میں آ کر قائم رہ سکتی ہے۔ ایسے سیاروں کی تعداد صرف ہماری کہکشاں میں ۳۰ بلین (ارب) تک پہنچتی ہے۔لہٰذا بہت سے سیارے ایسے ہوں گے جن میں زندگی کسی نہ کسی شکل میں ضرور پائی جاتی ہوگی۔

(سڈنی ہیرلڈ ۳،۴ جنوری ۲۰۰۴ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے اپنی مخزن علوم کتاب ''Revelation, Rationality Knowledge and Truth" کے صفحہ ۳۲۹،۳۳۴ پر قرآن کریم کی رو سے زمین و آسمان کے درمیان چلنے پھرنے والی مخلوق کے وجود اور ان کے باہم اجتماع کا ذکر فرمایا ہے۔نیز تخلیق کائنات، کائنات کا ایک نقطہ سے سفر کا آغاز، حیات و ممات کا سلسلہ، کائنات کا وسعت پذیر ہونا، سورج کا (اپنے نظام اور کہکشاں سمیت) اپنے مستقر کی طرف سفر کرتے کرتے ایک بار پھر ایک نقطہ پر مرکوز ہو جانا، کائنات کی صف کا لپیٹا جانا اور تخلیق کے عمل کا دہرایا جانا جیسے علوم کو قرآن کریم سے نکال کر پیش فرمایا ہے یہ مضمون بہت دلچسپ اور ایمان افروز ہے اور مذکورہ کتاب کے کوئی تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

زمین کے باسیوں کا آسمانی کروں میں رہنے والوں کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں رابطہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ بس اتنے ہی دور ہوں کہ چند دنوں، مہینوں یا سالوں میں پیغام ان تک پہنچ کر واپس بھی آ سکے۔ ہمارے نظام شمسی سے باہر ہماری کہکشاں (Galaxy) میں جو قریب ترین نظام شمسی ہے جس کے سورج کو (Proxima Centauri) کہتے ہیں وہ چار نوری سال دور ہے۔ دوسرے نظام ہائے شمسی اس سے زیادہ ہوں گے۔ ہماری کہکشاں کوئی ایک لاکھ نوری سال لمبی چوڑی ہے۔

A Brief History of Time By Stephen Hawking(P39)

اس لئے ہماری کہکشاں کے قریب ترین کہکشاں ظاہر ہے ایک لاکھ نوری سال سے زیادہ فاصلہ پر ہوگی اوران میں اگر کوئی زندہ مخلوق ہواورانہیں بجلی کی رفتار سے کوئی پیغام بھیجا جائے تو اس کے آنے جانے میں کم ازکم دولاکھ سال گذر جائیں گے اوربعض کہکشائیں تو اتنی دور ہیں کہ وہاں پیغام کے آنے جانے میں اربوں سال تک لگ جائیں گے اوراتنی عمر تو خود ہماری زمین کی بھی نہیں ہوگی اوراگر ہوگی بھی تو پتہ نہیں کس قسم کی مخلوق اسپر اسوقت بستی ہوگی۔خدا فرماتا ہے کہ ہم اس چیز پر قادر ہیں کہ ہم انسانوں کی جگہ کوئی ان سے بہتر مخلوق لے آئیں۔

(المعارج:۴۲)

جب پیغام بھیجنے اوروصول کرنے والے ہی نہ رہے تو رابطہ تو قائم نہ ہوسکا۔اس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی کروں کی زندگی ہماری اپنے کہکشاں میں ہی کہیں قریب قریب مل جائے ۔اس سلسلہ میں ایک دلچسپ خبر امریکہ سے آئی ہے انہوں نے وہاں کسی لیبارٹری میں ایسے کامیاب تجربے کئے ہیں جن سے روشنی کی رفتار کئی گنا بڑھائی جاسکتی ہے ۔(مادہ کی رفتار روشنی سے زیادہ نہیں بڑھ سکتی لیکن الیکٹرانک سگنلز کی بڑھائی جاسکتی ہے)۔ان کا اندازہ ہے کہ روشنی کی رفتار ۳۰۰ گنا تک بڑھائی جاسکتی ہے یعنی اگر کوئی زندگی رکھنے والا سیارہ ۳۰۰ نوری سالوں کے فاصلہ پر بھی واقع ہوتو پیغام وہاں پہنچنے میں صرف ایک سال لے گا اوراتنا ہی عرصہ واپسی پر لگے گا۔اس لئے یقین ہے کہ خدا کی زمینی اورآسمانی مخلوق کے رابطہ کی کوئی صورت جب خدا چاہے گا تو ضرور نکل آئے گی۔کائنات کی وسعت،توازن،ترتیب،حکمت اورڈایزئن دیکھ کر مومن کی روح وجد میں آتی اور پکار اٹھتی ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّار

(الفضل انٹرنیشنل 20.2.04)

وقت کا راز

بچپن سے ہی سنتے آئے ہیں کہ وقت بہت قیمتی چیز ہے۔اس کی قدر کرو۔وقت کا تیر جب کمان سے نکل جائے تو واپس نہیں آ سکتا لیکن وقت بجائے خود ایک سر بستہ راز ہے۔وقت آخر کیا چیز ہے آیا اس کا وجود ہے بھی کہ نہیں اس کی حقیقت کا کیسے پتہ چلے؟ کیا اسے حواس خمسہ کی مدد سے معلوم کیا جا سکتا ہے جواب نفی میں ہے کیونکہ وہ اسے دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں اور نہ ہی سونگھ اور چکھ سکتے ہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا آغاز کب ہوا اور خاتمہ کب ہوگا یہ کہاں سے آتا ہے اور کدھر کو جاتا ہے اگر یہ حرکت کر رہا ہے تو کیا کبھی ساکن بھی ہو سکتا ہے اگر وقت کا تیر بالفرض مشرق سے مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے تو کیا کبھی اس کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف بھی پھیرا جا سکتا ہے اگر کبھی یوں ہو سکتا تو یہ حسرت بھی پوری ہو جاتی کہ

ع دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اور جب کائنات کی صف لپیٹی جائے گی تو کیا الٹی چلنے والی فلم کی طرح وقت الٹنا شروع ہو جائے گا اور پھر اگر کبھی یوں ہوا تو کیا گزرے ہوئے واقعات پھر الٹے دہرائے جائیں گے۔آیئے دیکھیں کہ حکماء وقت کی ماہیت کے بارہ میں کیا کہتے ہیں۔

وقت کی تعریف

وقت کی تعریف بھی گول دائرہ کی طرح ہے جیسے کوئی پوچھے کہ مرغی پہلے پیدا ہوئی تھی یا انڈہ۔کہا جاتا ہے کہ کوئی سے دو لمحوں کے درمیانی وقفہ کو ''وقت'' کہتے ہیں لیکن وہ وقفہ بذات خود وقت ہی تو ہے اس لئے مسئلہ تو حل نہ ہوا۔صرف وقت کا ایک مترادف لفظ ہاتھ آ گیا لیکن علم میں کوئی

اضافہ نہ ہوا۔سوال یہ ہے کہ کیا وقت کی کوئی تعریف بغیر وقت یا اس کا مترادف لفظ استعمال کئے ہوسکتی ہے ۔اگر نہیں ہوسکتی تو جب کسی کو گھنٹوں ۔منٹوں یا سیکنڈوں میں وقت بتاتے ہیں تو دراصل اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔اصل بات یہ ہے کہ گھڑیاں دراصل وقت کی پیمائش نہیں کرتیں بلکہ وہ صرف ایک ''سٹینڈرڈ'' ہیں جن سے تبدیلی (Change) کو ماپا جاتا ہے۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دراصل وقت نام ہے تبدیلیوں کے باہمی تعلق اور نسبت کو ماپنے کا۔کلاک بذات خود ایک تبدیلی کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ یہ ایک ایسا آلہ ہے جس سے لوگ دوسری تبدیلیوں کو ماپتے ہیں مثلاً اگر کوئی شخص دوڑ رہا ہے تو وہ ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جاتا ہے۔اس جگہ کی تبدیلی کو ہم سوئیوں کی جگہ کی تبدیلی کے ساتھ منسلک کر لیتے ہیں یہ گویا دونوں کا باہمی تعلق یا نسبت ہے۔ہم ان تبدیلیوں کو مختصر طور پر یوں بیان کرتے ہیں کہ فلاں شخص دس منٹ میں ایک میل دوڑا اس طرح جگہ تبدیلی یعنی ایک میل کو کلاک کی سوئیوں کی جگہ کی تبدیلی یعنی دس منٹ کے ساتھ منسلک کردیا۔ اس لئے بجائے یہ کہنے کہ کلاک وقت کو ماپتی ہے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ کلاک تبدیلی (Change) ظاہر کرنے کا ایک ''سٹینڈرڈ'' ہے۔پس جب ہم ''وقت'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو دراصل ہمارا منشاء تبدیلی کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔اس بات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر بالفرض کائنات میں کوئی تبدیلی نہ ہو رہی ہو اور ہر چیز ساکن ہو جائے تو وقت بھی ٹھہر جائے گا لیکن جب تک کائنات موجود ہے ایسا ہونا ممکن نہیں۔مخلوق کا ہر آن بدلتے رہنا خالق کے ہر آن نئی شان میں جلوہ گر ہونے کا مظہر ہے۔

چونکہ عناصر میں ہر آن تبدیلی کا عمل جاری ہے اور ایسے آلے بن گئے ہیں جن سے اس تبدیلی کا پتہ چلایا جاسکتا ہے اس لئے اس تبدیلی کو وقت ماپنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔نیز ہمارے ''نظام شمسی''، یعنی سورج، چانداور زمین وغیرہ میں جو تبدیلیاں وقوع میں آرہی ہیں ان کو بھی وقت ماپنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے یعنی ان میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے کلاک کی تبدیلیوں کے ساتھ منسلک کیا جاسکتا ہے۔

گھڑیوں کی دو اقسام

گھڑیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک وہ جو مادی دنیا میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کو ماپتی ہیں یہ

مشینی بھی ہوتی ہیں اور عناصر اور اجرام فلکی میں مسلسل رونما ہونے والی تبدیلیوں سے متعلق بھی ہوتی ہیں جیسے ایٹمی کلاک یا نظام شمسی کی حرکت ۔ گھڑیوں کی دوسری قسم کو روحانی کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ اس کا تعلق تبدیلیوں کے اس ادراک یا شعور سے ہے جو روح انسانی میں ودیعت کیا گیا ہے ۔ ایک بے ہوش یا گہری نیند میں سویا ہوا شخص چونکہ ماحول میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس نہیں کر سکتا اس لئے اس کیفیت میں گزرے ہوئے وقت کا بھی اسے احساس نہیں ہوتا ان کو نفسیاتی گھڑیاں (Psychological Clocks) بھی کہا جا سکتا ہے ۔ انسان اپنا تمام علم اپنے حواس خمسہ اور ان سے ماورا جو چھٹی حس ہے ان کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور ان کا تعلق دماغ (Brain) کی ساخت اور ذہن (Mind) کی مخصوص استعدادوں کے ساتھ ہے یعنی اگر دماغ کو ایک کمپیوٹر سے تشبیہ دیں تو جیسا خالق نے اس کو پروگرام کیا ہے نفسیاتی گھڑی ویسا ہی وقت بتائے گی ادراک و شعور کی علامتیں حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور مختلف انواع (Species) میں مختلف ہوتی ہیں ۔ اسی لئے حیوانوں اور انسانوں میں چونکہ یہ پروگرامنگ مختلف ہوتی ہے اس لئے ان کا ادراک و شعور اور وقت کا احساس بھی مختلف ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر انسانی کان بہت تھوڑی آوازوں کو سن سکتے ہیں یہ بھی خدا کا احسان ہے ورنہ ہمارے اردگرد ہر وقت اتنی آوازیں موجود ہوتی ہیں کہ ان کے ایک تھوڑے سے حصہ کو بھی سن سکتے تو شور سے پاگل ہی ہو جاتے ۔ اگر کوئی چیز ایک سیکنڈ میں سولہ تا اٹھارہ بار ارتعاش (Vibrate) کرے تو انسان اس مسلسل آواز کو نہیں سکتا اور اگر ارتعاش کی رفتار ایک سیکنڈ میں بیس ہزار مرتبہ ہو جائے تو ایسی آواز کو انسان بالکل نہیں سن سکتا ۔ اس کے بالمقابل کتا اڑتیس ہزار (۳۸۰۰۰) فی سیکنڈ مرتعش ہونے والی آواز کو بھی سن سکتا ہے اس لئے یہ عین ممکن ہے کہ آپ کا کتا ایک سخت اور تیز آواز سن رہا ہو اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہا ہو اور آپ کہیں پتہ نہیں اس کو کیا ہو گیا ہے جبکہ کتا شاید الٹا یہ سوچتا ہوگا کہ میرا مالک بہرا ہے کہ اتنی اونچی آواز بھی نہیں سن سکتا ۔ یہی حال دوسری حسوں کا بھی ہے اور عالم حیوانات میں اس کی ہزاروں مثالیں بکھری پڑی ہیں ۔ سچی بات یہی ہے جو خدا نے کہی کہ صرف خدا ہی کو علم ہے کہ تمہارے سامنے کیا ہے اور تمہارے پیچھے کیا ہے اور نہ تمہیں حاضر کا علم ہے نہ غائب کا سوائے اتنے حصہ کے جو خدا تمہیں دینا چاہئے ۔ اس اصول کے تابع یہی کہا جا سکتا ہے کہ خود وقت اور اس کا احساس ادراک و شعور بھی خدا ہی کے ہاتھ میں ہے انسان وہی کچھ

جان سکتا ہے جو اسے خدا بتائے یا سمجھائے۔

وقت محدود ہے یا لا محدود

وقت کی ماہیت کا مسئلہ ہمیشہ سے سائنسدانوں اور فلاسفروں کے لئے دلچسپی کا حامل رہا ہے۔جس طور پر کسی نے کائنات کو سمجھا اسی کے مطابق وقت کے محدود یا لا محدود ہونے کے بارہ میں رائے قائم کی ۔پروفیسر سٹیفن ہاکنگ (Prof Stephen Hawking) نے اپنی مشہور کتاب "A Brief History of Time" میں اس بارے میں بعض آراء کا ذکر کیا ہے جن کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

(۱) علمائے یہود ٗعیسائیت اور اسلام کہتے ہیں کہ کائنات کا آغاز ایک خاص وقت پر ہوا۔ اس سے پہلے عدم تھا۔

(۲) سینٹ آگسٹائن (Agustine) نے کہا کہ وقت ہر مخلوق کی صفت ہے یعنی جو چیز وقت کے ساتھ بندھی ہوگی وہ ضرور ہی مخلوق ہوگی اسی لئے خالق وقت سے منزہ ہے۔

(۳) ارسطو اور یونانی فلاسفر کہتے تھے کہ ہماری دنیا اور کائنات اور دنیا ہمیشہ سے یونہی ہے اور ہمیشہ یونہی رہے گی ان کے سامنے جب یہ اعتراض پیش کیا گیا کہ تہذیب وتمدن کی عمر اتنی تھوڑی اور محدود کیوں ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ چونکہ تہذیب وتمدن کے دور آتے جاتے رہتے ہیں اور یہ بنتے مٹتے رہتے ہیں اس لئے پتہ نہیں لگ سکتا کہ کائنات کب سے ہے۔

(۴) ایک فلاسفر Immanuel Kant نے اپنی کتاب Critique of Pure Reason میں لکھا کہ کائنات کے ہمیشہ سے موجود ہونے کے دلائل بھی موجود ہیں اور اس کے الٹ ایک خاص وقت پر پیدا ہونے کے بھی ۔اگر یہ مانا جائے کہ کائنات ہمیشہ سے ایسے ہی ہے تو وقت لا محدود (Infinite) ہونا چاہئے لیکن یہ اس لئے درست نہیں کہ اگر لا محدود (Infinite) کو کسی بھی عدد سے تقسیم کریں تو جواب Infinity ہی آتا ہے جس کا مطلب بنتا ہے کہ ہر واقعہ سے پہلے لامحدود زمانہ گزر چکا ہوگا جو کہ لایعنی بات ہے۔لیکن اگر اس کے بالمقابل کائنات کا آغاز ایک خاص وقت پر مانا جائے تو اس سے پہلے وقت کو لا محدود ماننا پڑتا ہے اور یہ بات بھی درست نہیں کیونکہ ایسی

صورت میں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کائنات ایک خاص وقت پر ہی کیوں شروع ہوئی اور اس سے پہلے کیوں نہ ہوئی

یہاں خاکسار عرض کرنا چاہتا ہے کہ آج کے اکثر دہریہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ کائنات اور اس میں کارفرما قوتیں ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں اور ایسے ہی رہیں گے گویا یہ خود ہیں اور ان کا خالق کوئی نہیں۔ کائنات کا آغاز کسی خاص وقت پر تسلیم کرنے سے انکا موقف غلط ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ کوئی چیز خود اپنے آپ کو (مع ضروری صفات اور طاقتوں کے) پیدا نہیں کرسکتی اس لئے اگر کسی بھی وقت کائنات عدم سے وجود میں آئی تھی تو اس کا ایک غیر محدود قدرتوں والا خالق ہونا چاہئے۔

(۵) ایڈون ہبل (Edwin Hubble) نے کہا کہ کائنات ہر طرف پھیل رہی ہے اور دور کی کہکشائیں ہم سے اور بھی دور ہوتی جا رہی ہیں اور کائنات جس رفتار سے پھیل رہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دس بیس ارب سال پہلے یہ ایک نقطہ پر مرکوز ہوگی اور اس کی کثافت (Density) لامحدود (Infinity) ہوگی جس کی وجہ سے سائنس کے قوانین ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور مستقبل کے متعلق کوئی اندازے نہیں لگائے جاسکتے۔ اگر ''بگ بینگ'' (Big Bang) سے پہلے کوئی واقعات ہوئے بھی ہوں گے تو بھی چونکہ ہمارا ان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں اس لئے انہیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

خاکسار عرض کرتا ہے کہ ہبل کی تھیوری کے مطابق کائنات کی تخلیق کا ایک نقطہ آغاز تھا جو کوئی پندرہ ارب سال پہلے تھا جس چیز کا آغاز ہے اس کا انجام بھی ہے اور چونکہ کائنات اپنی حدود اور صفات خود متعین نہیں کرسکتی اس لئے عقلاً حدود مقرر کرنے والا ایک قدیر خدا بھی ہونا چاہئے۔

(۶) نیوٹن (Newton) بھی ارسطو کی طرح وقت کے مطلق ہونے پر یقین رکھتا تھا جس کا مطلب یہ بنتا تھا کہ کوئی سے دو گزرے ہوئے واقعات کے درمیان وقت کی پیمائش درست طور پر کی جاسکتی ہے لہذا یہ وقت اور خلاء (Time and Space) ایک دوسرے سے علیحدہ اور آزاد ہیں اور دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔

(۷) آئن سٹائن نے کہا کہ وقت کوئی مطلق (Absolute) چیز نہیں۔ اگر کوئی کلاک تیزی سے حرکت کررہا ہو تو اس کے ساتھ وقت بھی بدل جاتا ہے۔ ان کے نظریہ اضافت کے مطابق

ایسا کلاک جو تیزی سے حرکت کر رہا ہو اس کا وقت ایک ساکن کلاک کی نسبت آہستہ گزرتا نظر آتا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ایک سائنسدان H.E.Ives نے اس نظریہ پر تجربات کئے اور اسے درست پایا (اگر اس جہان کا وقت بھی مطلق نہیں تو فرشتوں وغیرہ روحانی وجودوں اور حیات اخروی کے وقت کے پیمانوں کو انسان کیسے سمجھ سکتا ہے (خالد)

اللہ نے ہر چیز کو لِاَجَلِ مُسَمًّی یعنی ایک مقررہ مدت تک قائم رہنے کے لئے بنایا ہے اور اس نے پیدائش کے وقت ہی سے اس کی عمر کی حد اس کے اندر گویا لکھ چھوڑی ہے۔ کائنات جن ایٹموں سے مل کر بنی ہے اس کے جزو پروٹون تک کی عمر سائنسدانوں نے معلوم کر لی ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس مادی کائنات کی کوئی بھی چیز نہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہمیشہ رہے گی۔ جب کوئی شے اپنی مدت حیات پوری کر لیتی ہے۔ تو وہ ٹوٹ پھوٹ کر اپنے مرکز اصلی کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ کسی شے کا اپنی صفات سے محروم ہونا ہی اس کی موت ہے اور جب اس کے اجزاء ایک نئی ترکیب اور نئی صفات کے ساتھ ظہور کرتے ہیں تو وہ ایک دوسری نوع کی پیدائش کہلاتی ہے اور خدا ہمیشہ سے ایسے ہی ایک نوع کے بعد دوسری نوع پیدا کرتا چلا آیا ہے تا اس کی صفت خلق ظہور کرتی رہے لیکن مخلوق کی کوئی نوع بھی خدا کی طرح ازلی ابدی نہیں ورنہ وہ خدائی صفات میں شریک ہو جائے۔

چونکہ کائنات میں کوئی شے بھی ایسے نہیں جو کسی مدت حیات کی پابند نہ ہو اس کے لئے کائنات اور اس میں موجود ہر شے مخلوق ہے اور اپنے وجود میں اور قیام کے لئے ایک حی و قیوم ہستی کی محتاج ہے۔ وقت ہر مخلوق کی صفت اور کمزوری ہے جس سے خالق خود پاک ہے۔ وقت کا گھن ایسا ہے جو ہر چیز کو چاٹ جاتا ہے۔ غالب کا اشارہ شاید اسی طرف تھا جب اس نے کہا تھا:

ع میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

وقت روح و مادہ کی طرح خدا کی مخلوق اور اس کی تقدیر مبرم کا حصہ ہے۔ یہ وہ دھارا ہے جس کے ساتھ بہے بنا چارہ نہیں لہذا اس کو کوسنا اور برا بھلا کہنا بھی مناسب نہیں۔ ہاں اس کی قدر کرنا ضروری ہے کیونکہ

ع گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

(''لاہور'' 17.6.2005)

کائنات میں ہر طرف موت وحیات کا سلسلہ جاری ہے

پچھلے دنوں ناسا امریکہ نے اعلان کیا تھا کہ انہوں نے دسمبر ۱۹۹۷ء کے دوران کائنات میں ایک بہت بڑا دھماکہ مشاہدہ کیا تھا جو اس بگ بینگ دھماکہ کے بعد سب سے بڑا تھا جس سے کائنات کا آغاز ہوا تھا۔ یہ دھماکہ کائنات کے آغاز کے دو ارب سال بعد اور اب سے کوئی بارہ ارب سال پہلے ہوا تھا۔ دھماکہ کا مقام زمین سے اتنا دور ہے کہ روشنی جو بجلی کی رفتار سے سفر کرتی ہے اب ہم تک پہنچی ہے۔ جس سیٹلائٹ کے ذریعہ زمین پر یہ ریڈیائی پیغام موصول ہوا تھا وہ اٹلی اور ہالینڈ نے مل کر آسمان پر چھوڑا ہوا ہے اور اس کا نام Beppo Sax رکھا ہوا ہے۔

اب اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہوا ہے۔ مذکورہ بالا سیٹلائٹ نے کینبرا آسٹریلیا کے قریب واقع Mount Stromlo کی رصدگاہ کو جو پیغام بھیجے ہیں ان کے مطابق زمین سے ۱۰۰ ملین روشنی کے سال (Light Year Distance) دور فاصلہ پر ایک بہت بڑا جلتا ہوا ستارہ نظر آیا ہے۔ یہ ستارہ جو پھٹ کر مر رہا ہے وہ اکیلا اس وقت اتنی روشنی دے رہا ہے جتنا وہ ساری کہکشاں (Galaxy) بھی نہیں دے رہی جس کا وہ ایک حصہ ہے اور جس میں اس جیسے ۱۰۰ ارب سورج چمک رہے ہیں۔ جو کچھ سائنس دانوں نے ریکارڈ کیا ہے وہ ایک بلیک ہول کی پیدائش کا منظر معلوم ہوتا ہے یعنی یہ ستارہ جل کر اپنے مرکز کی طرف تہہ بہ تہہ ہو کر یعنی لپٹا جا کر گر رہا ہے۔ عام ستارہ اس طرح نہیں جلا کرتا وہ جل کر ٹھنڈا سفید کنکر بن کر چکر لگاتا رہتا ہے جلنے کی حالت میں اس کو Super Nova

کہتے ہیں۔لیکن یہ واقعہ اس لئے مختلف تھا کہ یہ ستارہ کسی بلیک ہول میں تبدیل ہو رہا ہے یا پہلے سے موجود کسی بلیک ہول میں مدغم ہو رہا ہے۔اس لئے اس کے جلنے کی کیفیت کو سپر نووا نہیں بلکہ Hyper Nova کہتے ہیں۔بلیک ہول میں مادہ (Matter) شدید بھاری اور گھنا (Dense) ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی کشش ثقل (Gravity) اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ اگر چہ روشنی بالکل ہلکی ہوتی ہے وہ بھی اس کی کشش سے بچ کر نہیں جاسکتی اور اس میں جذب ہو جاتی ہے اور بالکل منعکس (Reflect) نہیں ہوتی جس کی وجہ سے بلیک ہول نظر نہیں آ سکتا۔

آسٹریلیا کے سائنس دان کہتے ہیں کہ لگتا ہے ناسا والوں نے بھی گزشتہ دسمبر میں کوئی اسی قسم کا منظر دیکھا ہوگا بلکہ عجب نہیں کہ پہلا بگ بینگ بھی کوئی بہت بڑا بلیک ہول ہی ہو۔

(سڈنی ہیرلڈ ۹ مئی ۱۹۹۹ء)

خدا ہی جانتا ہے کہ کائنات میں کہاں کہاں کیا کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے۔حیات و موت کا سلسلہ صرف نباتات اور حیوانات کی انواع تک ہی محدود نہیں بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ پر محیط ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ''چشمہ معرفت'' (روحانی خزائن جلد ۲۳) میں زندگی و موت کے فلسفہ پر بہت لطیف انداز میں روشنی ڈالی ہے۔مثلاً آپ فرماتے ہیں:

> ''موت اسی بات کا نام ہے کہ ایک چیز اپنی لازمی صفات کو چھوڑ دیتی ہے۔تب کہا جاتا ہے کہ وہ چیز مرگئی۔'' (صفحہ ۱۶۶)

> ''اکثر لوگ موت کے لفظ پر بہت دھوکہ کھاتے ہیں۔موت صرف معدوم ہونے کا نام نہیں بلکہ اپنی صفات سے معطل ہونے کا نام بھی موت ہے۔'' (صفحہ ۱۶۱)

> ''ایسا ہی بعض نباتاتی اور معدنی چیزیں علیحدہ علیحدہ ہونے کی حالت میں تو ایک خاصیت نہیں رکھتیں مگر ترکیب کے بعد ان میں ایک نئی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔مثلاً شورہ یا گندھک یا صرف کوئلہ سے بارود بنایا جائے تو یہ غیر ممکن ہوتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ترکیب سے ایک نئی چیز پیدا ہوسکتی ہے۔''
> (صفحہ ۱۷۲)

پس معلوم ہوا کہ جب کوئی چیز اپنی لازمی صفات سے محروم ہو جاتی ہے تو وہی اس کی موت ہوتی ہے اور جب وہ نئی حالت یا نئی ترکیب میں جدید صفات پاتی ہے تو یہ اس کی نئی زندگی کہلاتی ہے مثلاً سب جانتے ہیں کہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے۔ ہائیڈروجن بطور ایندھن جلتی ہے اور آکسیجن اسے جلنے میں مدد دیتی ہے لیکن وہ خاص نسبت (H_2O) میں ملتے ہیں تو پانی وجود میں آتا ہے جو نہ جلتا ہے اور نہ جلنے میں مدد دیتا ہے بلکہ الٹا آگ کو بجھاتا ہے۔ یوں ہائیڈروجن اور آکسیجن دونوں اپنی پہلی صفات سے محروم ہو کر نئی صفات حاصل کر کے ایک نئی قسم کی زندگی پاتے ہیں۔ جس نسبت سے عناصر باہم ملتے ہیں اس کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر آکسیجن اور ہائیڈروجن H_2O_2 کی نسبت سے ترکیب پائیں تو بجائے پانی کے ایک زہر بن جائے گا۔ شرعی قوانین بھی طبعی قوانین کے متوازی چلتے ہیں چنانچہ جب انسان کی طبعی حالتیں صحیح تناسب میں کام کریں تو اعلیٰ اخلاق اور نیکی بن جاتے ہیں اور اگر ان کا تناسب بگڑ جائے تو بدخلقی اور برائی جنم لیتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جسم اور روح کے تغیرات حیات اخروی پر بڑی عمدہ روشنی ڈالتے ہیں چنانچہ فرمایا:

''یہ بھی طبعی تحقیقاتوں سے ثابت ہے کہ تین سال تک انسان کا پہلا جسم تحلیل پا جاتا ہے اور اس کے قائم مقام دوسرا جسم پیدا ہو جاتا ہے اور یہ یقینی امر ہے جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ جب انسان کسی بیماری کی وجہ سے نہایت درجہ لاغر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ایک مشتِ استخوان رہ جاتا ہے تو صحت یابی کے بعد آہستہ آہستہ پھر وہ ویسا ہی جسم تیار ہو جاتا ہے۔ سو اسی طرح ہمیشہ کے لئے اجزاء جسم کے تحلیل پاتے ہیں اور دوسرے اجزاء ان کی جگہ لے لیتے ہیں پس جسم پر گویا ہر آن ایک موت ہے اور ایک حیات ہے۔

ایسا ہی جسم کی طرح روح پر بھی تغیرات وارد ہوتے رہتے ہیں۔ اس پر بھی ہر آن ایک موت اور ایک حیات ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ جسم کے تغیرات ظاہر اور کھلے کھلے ہیں مگر جیسا روح مخفی ہے ایسا ہی اس کے تغیرات بھی مخفی ہیں اور روح کے تغیرات غیر متناہی ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف سے ظاہر ہے کہ روح کے تغیرات غیر محدود ہیں۔ یہاں تک کہ بہشت میں بھی وہ تغیرات

ہونگے مگر وہ تغیرات روبہ ترقی ہونگے اور روحیں اپنی صفات میں آگے سے آگے بڑھتی جائیں گی اور پہلی حالت سے دوسری حالت ایسی دوراور بلند تر ہوجائے گی گویا پہلی حالت بہ نسبت دوسری حالت کے موت کے مشابہ ہوگی۔''

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۶۸)

پھر فرماتے ہیں:

''حالت خواب میں روحانی نظارے عجیب وغریب ہوتے ہیں مثلاً کبھی انسان ایک بچہ کی طرح اپنے تئیں دیکھتا ہے اور بیداری کا یہ واقعہ کہ وہ درحقیقت جوان ہے یا بوڑھا ہے اور اس کی اولاد ہے اور اس کی بیوی ہے بالکل فراموش کردیتا ہے سو یہ تمام نظارے جو عالم خواب میں پیدا ہوتے ہیں صاف دلالت کرتے ہیں کہ روح خواب کی حالت میں اپنے حافظہ اور یادداشت اور اپنی بیداری کی صفات سے الگ ہوجاتی ہے اور یہی اس کی موت ہے۔''

(صفحہ ۶۴ حاشیہ)

نیز فرماتے ہیں:

''مجھے ایسے لوگوں سے سخت تعجب آتا ہے کہ وہ اپنی حالت خواب پر بھی غور نہیں کرتے اور نہیں سوچتے کہ اگر روح موت سے مستثنٰی رکھی جاتی تو وہ ضرور عالم خواب میں بھی مستثنٰی رہتی۔ ہمارے لئے خواب کا عالم موت کے عالم کی کیفیت سمجھنے کے لئے ایک آئینہ کے حکم میں ہے۔ جو شخص روح کے بارے میں سچی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ خواب کے عالم پر بہت غور کرے کہ ہر ایک پوشیدہ راز از موت کا خواب کے ذریعہ سے کھل سکتا ہے۔''

(صفحہ ۱۶۱،۱۶۲)

پس کائنات کی ہر چیز کے لئے موت مقدر ہے۔ ہر مخلوق پر فنا آنے والی ہے۔ ایک سے دوسری حالت دوسری سے تیسری اور اسی طرح ہر چیز فنا اور ارتقاء کے دائرہ میں آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے اور تمام مخلوقات کا دائرہ اول وآخر خدا کی ذات سے شروع ہوکر اسی پر ختم ہوجاتا ہے اور یہ

کیسے ہوتا ہے یہ وہ راز ہے جو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''پس جیسا کہ خدا نے اس آیت میں کہ ''وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ''
(الفرقان:۳) ہے لفظ کل کے ساتھ جو احاطہ تامہ کے لئے آتا ہے ہر ایک چیز کو
جو اس کے سوا ہے مخلوق میں داخل کر دیا۔ ایسا ہی اس لفظ کل کے ساتھ اس آیت
میں جو کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَهٗ (القصص:۸۹) یعنی ہر ایک چیز معرض
ہلاکت میں ہے اور مرنے والی ہے بجز خدا کی ذات کے کہ وہ موت سے پاک
ہے''۔

(صفحہ:۱۶۵)

پس اگر امریکہ اور آسٹریلیا کے سائنس دانوں نے مرتے ہوئے سورج، ستارے، آسمان پر مشاہدہ کئے ہیں تو یہ خدا کے سنت کے عین مطابق ہے جو ہر مخلوق پر حاوی ہے اور کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 9.10.98)

کرسمس کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

پروفیسر اوون چیڈوک (Owen Chadwick) جو کیمبرج یونیورسٹی میں ماڈرن ہسٹری کے استاد رہ چکے ہیں اپنی کتاب (A History of Christianity) میں لکھتے ہیں کہ جب ۳۳۶ عیسوی میں پہلی بار کرسمس منایا گیا تھا تو اس تہوار کے تین پہلو تھے ایک تو موسم سرما کی اداسی سے چھٹکارا پانے کی خوشی۔ دوسرے رومیوں کی سورج اور اس کی دھوپ سے روایتی عقیدت کا اظہار اور تیسرے فلسطین کے شہر بیت اللحم (Bethelhem) کے ایک طویلے میں جو بچہ پیدا ہوا تھا اس کی یاد منانے کے لئے۔ جہاں تک اس کی پیدائش کی یاد کا تعلق ہے گو عیسائی اسے آج بھی اسی طرح مناتے ہیں لیکن دوسری دو باتیں (جشن منانا اور سنٹا کلاز کی بے اصل داستان کے تجارتی پہلو) اس پر بڑی طاقت سے حاوی ہو چکی ہیں۔ اس ذکر کے بعد سڈنی کا ایک موقر اخبار اپنے اداریہ میں رقم طراز ہے۔

> ”یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ درست ہے کہ انجیل میں یسوع (Jesus) کی پیدائش کا کوئی ذکر اس کے سوا نہیں ملتا کہ لوقا میں ہے کہ ”جب Cyrenius سیریا کا گورنر تھا“ یا متی میں ہے کہ ”یہ واقعہ ہیروڈ کی موت (۴ قبل مسیح) سے پہلے کا ہے۔“

اولین عیسائی یسوع کی پیدائش کے واقعہ کو ایک اہم مذہبی تقریب کے طور پر دیکھتے معلوم نہیں ہوتے ان کے مذہبی کیلنڈر میں توجہ ایسٹر پر تھی۔ یہ امر تصدیق شدہ ہے کہ سب سے پہلی بار ۳۳۶ء میں روم سے کرسمس کا آغاز ہوا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ کرسمس کے لئے ۵۲/ دسمبر کی تاریخ

اس لئے مقرر کی گئی تھی کہ اس روز رومی موسم سرما کے زوال کی خوشی کا تہوار منایا کرتے تھے اور کرسمس کو اس پر منطبق کی گیا تھا۔

جیسا کہ Chadwick نے لکھا ہے رومن یہ تہوار شراب کی مدہوشی اور خوشی کی سرمستی (Drunkenness and Riot) کی کیفیت میں منایا کرتے تھے ۔ چرچ اگرچہ کہتا رہا کہ کرسمس کو بامقصد تہوار کے طور پر منانا چاہئے ۔لیکن جس طرح آج کے عیسائی اس طرح کی اپیلوں کو نظرانداز کر کے پینے پلانے اور کھانے پینے میں حد اعتدال سے گزر جاتے ہیں ایسا ہی حال ان پہلے عیسائیوں کا تھا۔انہوں نے بھی اسی طریق کی پیروی کی جس پر ان کے غیر عیسائی رومی ہمسائے چلتے تھے۔''

(سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۴ دسمبر ۲۰۰۳ء)

یہاں ضمناً یہ ذکر مناسب ہوگا کہ ہیروڈ (Herod) فلسطین کا رومی بادشاہ تھا جس کا زمانہ ۳۷ تا ۴ قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے۔اس لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش چار تا چھ سال قبل مسیح باور کی جاتی ہے۔

حضرت مصلح موعودؓ نے تفسیر کبیر جلد پنجم میں قرآن کریم ،انجیل اور عیسائی محققین کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش جولائی یا اگست میں یعنی موسم گرما میں ہوئی تھی جب کھجوریں پکتی ہیں۔گڈریئے اپنے ریوڑ کو کھلی جگہ رات کو رکھتے ہیں اور چشموں کا پانی بچہ کو نہلانے کے لئے موزوں ہوتا ہے۔چنانچہ آپؓ فرماتے ہیں:

> ''بائبل کی روایت سے پتہ لگتا ہے کہ بچہ بیت اللحم میں پیدا ہوا اور بیت اللحم ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے جو سمندر سے ۲۳۵۰ فٹ اونچی ہے۔اس کے اردگرد سبز وادیاں ہیں جو سارے یہودا سے زیادہ سرسبز ہیں۔اس پہاڑی کے اندر دو تین چشمے ہیں جن کو چشمہ سلیمان کہتے ہیں اور یہیں سے شہر میں پانی لایا جاتا ہے۔گویا شہر میں پانی نہیں بلکہ تالاب سلیمان سے نالیوں کے ذریعہ پانی لایا جاتا ہے۔مگر شہر سے جنوب مشرق کی طرف آٹھ سو گز یعنی نصف میل پر اور وہ بھی نیچے ڈھلوان کی طرف چشمہ ہے۔''

(قاموس کتاب المقدس ترجمہ و تالیف ڈاکٹر جارج ای پوسٹ ایم ڈی)

.....اصل بات یہ ہے کہ بائبل بتاتی ہے حضرت مریم جب بیت اللحم گئیں تو انہیں ٹھہرنے کے لئے شہر میں جگہ نہ ملی پس وہ شہر سے باہر جا کر رہیں۔ اور بائبل بتاتی ہے کہ وہ اس جگہ پر رہیں جہاں گڈریئے اپنے جانور چرایا کرتے تھے۔

(انجیل لوقا باب ۲ آیت ۱۸)

''اور گڈریئے اپنے جانور ہمیشہ شہر سے کچھ فاصلہ پر چرایا کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے لکھا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوا تو انہوں نے اسے کھلیان میں ڈالا۔ پس شہر اور چشموں کے درمیان کسی جگہ پر جا کر وہ ٹھہر گئیں۔ شاید انہیں یہ بھی خیال ہوگا کہ اگر میں شہر میں رہی تو لوگ شور ڈالیں گے کہ یہ کس کا بچہ ہے اس لئے بہتر ہے کہ شہر سے فاصلہ پر ڈیرہ لگا دیا جہاں سے پانی نزدیک تھا مگر بوجہ اجنبی جگہ ہونے کے انہیں اس کا علم نہیں تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے انہیں الہاماً بتا دیا کہ اس طرف چشمہ رہا ہے۔''

(تفسیر کبیر جلد پنجم۔ سورہ مریم آیت ۲۶ صفحہ ۱۷۸)

نیز فرماتے ہیں:

''قرآن کریم بتاتا ہے کہ مسیح اس موسم میں پیدا ہوئے جس میں کھجور پھل دیتی ہے اور کھجور کے زیادہ پھل دینے کا زمانہ دسمبر نہیں ہوتا بلکہ جولائی اگست ہوتا ہے اور پھر جب ہم یہ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک چشمہ کا بھی پتہ بتایا جہاں وہ اپنے بچے کو نہلا سکتی تھیں اور اپنی بھی صفائی کر سکتی تھیں تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جولائی اگست کا مہینہ تھا ورنہ سخت سردی کے موسم میں چشمہ کے پانی سے نہانا اور بچے کو غسل دینا خصوصاً ایک پہاڑ پر اور عرب کے شمال میں عقل کے بالکل خلاف تھا۔'' (تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ ۱۷۹)

.....پھر انجیل میں مسیح کی پیدائش کا موقع بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اسی علاقہ میں چرواہے تھے جو رات کو میدان میں رہ کر اپنے گلہ کی نگہبانی کر رہے تھے'' (لوقا باب ۲ آیت ۸)

ظاہر ہے کہ یہ گرمی کا موسم تھا نہ کہ شدید سردی کا۔ دسمبر کا مہینہ تو علاوہ شدید سردی کے فلسطین میں سخت بارش اور دھند کا ہوتا ہے۔کون یہ تسلیم کرسکتا ہے کہ ایسے موسم میں کھلے میدان میں چرواہے اپنے گلوں کو لے کر باہر نکل آئے تھے۔صاف ظاہر ہے کہ یہ گرمی کا موسم تھا۔ چنانچہ پیکس تفسیر بائبل میں انجیل لوقا کے مفسر پرنسپل اے۔ جے۔ گریو۔ ایم اے ڈی، کی طرف سے لوقا کے اس بیان پر کہ حضرت مسیح کی پیدائش جس موسم میں ہوئی تھی اس وقت چرواہے گلوں کو باہر نکال کر کھلے میدان میں راتیں بسر کرتے تھے۔مندرجہ ذیل تبصرہ موجود ہے کہ یہ موسم ماہ دسمبر کا نہیں ہوسکتا۔ ہمارا کرسمس ڈے مقابلۃً بعد کی ایک روایت ہے جو کہ پہلے پہل مغرب میں پائی گئی۔اسی طرح بشپ جارنس اپنی کتاب Rise of Christianity میں تحریر کرتے ہیں:

''اس تعیین کے لئے کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے کہ ۲۵ دسمبر ہی مسیحؑ کی پیدائش کا دن تھا اگر ہم لوقا کی بیان کردہ ولادت مسیح کی کہانی پر یقین کرلیں کہ اس موسم میں گڈریئے رات کے وقت اپنی بھیڑوں کے گلہ کی نگرانی بیت اللحم کے قریب کھیتوں میں کرتے تھے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی پیدائش موسم سرما میں نہیں ہوئی جبکہ رات کو ٹمپریچر اتنا گر جاتا ہے کہ یہودیہ کے پہاڑی علاقہ میں برف باری ایک عام بات ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا کرسمس ڈے کافی بحث و تمحیص کے بعد قریباً ۳۰۰ء میں متعین کیا گیا ہے۔''

(صفحہ ۷۹)

پس ان حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ مسیح کی پیدائش دسمبر میں نہیں ہوئی۔

(تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵)

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چار قبل مسیح سے پہلے پیدا ہوئے۔ان کی پیدائش موسم گرما میں ہوئی اور عیسائیت کے ابتدائی تین سو سالوں میں کسی نے کرسمس ڈے نہیں منایا۔پہلی بار روم کے عیسائیوں نے ۳۳۶ عیسوی میں کرسمس منایا اور ۲۵/دسمبر کا دن اس لئے مقرر کیا گیا کہ اس روز رومی اپنا موسمی تہوار پینے پلانے کے شغل کے ساتھ منایا کرتے تھے۔عیسائیوں نے اس کا نام بدل کر کرسمس رکھ دیا اور اس میں عبادت اور روحانیت پر شراب و کباب جس طرح اس وقت حاوی تھا، اور آج

بھی ہے۔اس کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے جن تہواروں کا آغاز ہوا ان میں آج بھی عبادت، روحانیت اور نیکی کا رنگ پایا جاتا ہے جیسے عیدین، حج اور جمعات اور پھر آپ ﷺ کے روحانی فرزند مسیح موعودؑ کے ذریعہ جاری ہونے والے جلسہ ہائے سالانہ وغیرہ۔الحمدللہ۔

(الفضل انٹرنیشنل 16.1.04)

نوع انسانی کا سفر

انسان کی ابتداء کس سرزمین سے ہوئی اور ہم کن کن حالتوں سے گزر کر موجودہ شکل وصورت تک پہنچے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اکثر انسان پوچھتے ہیں۔اس کا جواب سائنس دان پہلے یہ دیا کرتے تھے کہ انسانی سفر ڈیڑھ لاکھ سال پہلے افریقہ سے شروع ہوا تھا۔سب انسان ایک ہی جگہ رہتے تھے اس لئے ارتقاء بھی اکٹھے ہی ہوا۔ لیکن اب حال ہی میں کیلیفورنیا کی سٹینفورڈ (Stanford) یونیورسٹی نے انسانوں کے D.N.A پر تحقیق کی ہے جن کا تعلق مختلف رنگ ونسل اور ملکوں سے ہے تا انسانوں کا باہمی تعلق معلوم کیا جائے۔اس تحقیق سے دو باتیں سامنے آئی ہیں۔ اول یہ کہ یہ بات درست ہے کہ زندگی کا سفر افریقہ سے کوئی دو لاکھ سال پہلے شروع ہوا تھا۔ دوسری بات جو زیادہ دلچسپ ہے وہ یہ کہ نوع انسانی شروع سے ہی دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلنا شروع ہوگئی تھی اور ہر حصہ اپنے اپنے ماحول کے مطابق بقا کی جدوجہد کرتا رہا جس سے مختلف انسانی نسلیں وجود میں آئیں۔ دوسرے لفظوں میں شجر انسانی شاخ در شاخ ہوکر دنیا میں اس طرح پھیلا کہ ہر شاخ اور پھر اس کی شاخ آزادانہ طور پر ترقی کرتی ہوئی موجودہ رنگ ونسل تک پہنچی۔

انسانی ارتقاء کے بارہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام، حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ سے بھی سوالات کئے گئے تھے ان کے جوابات کی روشنی میں جو کچھ خاکسار سمجھ پایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا'' (نوح:۱۵) اور انسان پر وہ حالت بھی گزری ہے کہ قابل ذکر چیز نہ تھا۔(الدھر:۲) یہ درست نہیں ہے کہ ایک ہی نوع (Species) سے انسان، حیوان، چرند، پرند اور کیڑے مکوڑے

پیدا ہوئے بلکہ انسانی نوع شروع ہی سے باقی انواع سے مختلف تھی اور اس کا ارتقاء خود اس کی اپنی نوع کے اندر ہی ہوا ہے۔ تمام انسانوں کا تعلق اسی نفس واحدہ سے ہے اور سب انسان ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں (النساء:۲) انسان اپنی پیدائش سے قبل رحم مادر میں جن اطوار سے گزرتا ہے وہ ان حالتوں کی تصویریں ہیں جن میں سے نوع انسانی کروڑوں سال پہلے اپنے ارتقائی مراحل میں سے گزری ہے۔ چونکہ ہر نسل اور شاخ نے آزادانہ طور پر ترقی کی ہے اس لئے ہر شاخ کا پہلا شخص جو خدا کی وحی کا مہبط بنا وہ اس سلسلہ کا آدم تھا۔ اس طرح کوئی ایک لاکھ آدم گزرے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ آسٹریلیا اور افریقہ کے اصلی باشندوں کا آدم دوسروں کے آدم سے مختلف ہو۔ جیسے جیسے زندگی مسلسل ترقی کر رہی تھی ۔ اس کے اندر بھی مختلف دور ساتھ ساتھ چل رہے تھے ۔ جسمانی لحاظ سے بھی اور روحانی لحاظ سے بھی ۔ ایک دور ہزار سال کا اس سے بڑا سات ہزار سال کا اور اس سے بڑا دائرہ پچاس ہزار سال کا۔ (الحج:۴۷، المعارج:۵) یہ ایسے ہی ہے جیسے جب انسان کی عمر بڑھتی ہے سو اس پر روزانہ ایک دور چوبیس گھنٹے کا آتا ہے۔ ایک سات دن کا اور ایک سال بھر کا آخری آدم وہ تھے جن کی نسل سے ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے ۔ آدم علیہ السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک ۴۷۳۹ قمری سال گزرے جس کا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشفاً علم دیا گیا۔ (تحفہ گولڑویہ) ''احادیث صحیحہ متواترہ کے رو سے عمر دنیا یعنی حضرت آدم سے لے کر آخیر تک سات ہزار برس قرار پائی ہے۔'' آجکل ۱۴۱۶ ہجری قمری سال جا رہا ہے۔ سات ہزار سالہ دور میں سے ۶۱۴۵ قمری سال اور ہزار سالہ دور میں سے ۱۴۵ قمری سال اور ہزار سالہ دور میں سے ۱۸۵۴ قمری سال گزر چکے ہیں۔ یہ دور ۱۸۵۴ عیسوی میں شروع ہوا جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا بابرکت وجود دنیا میں ظاہر ہو چکا تھا۔ اور قرآن سے نور حاصل کر رہا تھا تا دنیا کو اس نور سے منور کرے گویا موجودہ سات ہزار سالہ دور میں سے ۸۵۵ سال باقی ہیں۔ اس کے بعد اگلا دور کس شکل میں ظاہر ہوگا خدا ہی جانتا ہے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''یاد رہے کہ قیامت بھی کئی قسم پر منقسم ہے اور ممکن ہے کہ سات ہزار

سال کے بعد کوئی قیامت صغریٰ ہو جس سے دنیا کی ایک بڑی تبدیلی مراد ہو، نہ کہ قیامت کبریٰ۔‘‘ (تحفہ گولڑویہ)

اسی طرح فرمایا:

’’اسلام اس بات کا قائل ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا جو خدا کے ساتھ کوئی نہ تھا اور صرف وحدت اپنا جلوہ دکھلا رہی تھی۔ اور خدا ایک پوشیدہ خزانہ کی طرح تھا۔ پھر خدا نے چاہا کہ میں شناخت کیا جاؤں تو اس نے اپنی شناخت کے لئے انسان کو پیدا کیا مگر ہم نہیں جانتے کہ کتنی دفعہ وحدت الٰہی کا زمانہ آ چکا ہے اس کا علم خدا کو ہے۔ لیکن جیسا کہ دوسری صفات ہمیشہ کے لئے معطل نہیں رہ سکتیں، ایسا ہی وحدت الٰہی کی صفت بھی ہمیشہ معطل نہیں رہتی اور کبھی کبھی اس کا دور آ جاتا ہے اور کبھی ذات الٰہی دنیا کو ہلاک کرنا چاہتی ہے اور کبھی پیدا کرنا کیونکہ احیاء اور اماتت دونوں صفات اس کے ہیں۔ اس لئے ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ خدا ہر ایک جاندار کو ہلاک کرے گا یہاں تک کہ آسمان اور زمین کا بھی ایسے طور پر تختہ لپیٹ دے گا جیسا کہ ایک کاغذ لپیٹ دیا جاتا ہے۔‘‘

(چشمہ معرفت)

(الفضل انٹرنیشنل 22.9.95)

زمین پر ہمارے آدم سے پہلے بھی انسان بستے تھے

ٹیلیگراف لنڈن کی خبر کے مطابق اور جس کا یہاں ٹی۔وی پر بھی چرچا رہا ہے چلی میں ایسے انسان کے قدم کے نشانات ملے ہیں جو آج سے ۱۲۵۰۰ سال پہلے وہاں بستے تھے۔ان کے علاوہ جو پرانی اشیاء ہتھیار وغیرہ ہزاروں کی تعداد میں وہاں سے ملی ہیں وہ بھی قدیم ترین انسانی ہتھیاروں سے تقریباً تیرہ ہزار سال پرانی ہیں۔ یہ دریافت اس لحاظ سے بڑی اہم خیال کی جارہی ہے کہ اس نے شمالی اور جنوبی امریکہ کے قدیمی باشندوں کے بارہ میں جو مروجہ تھیوریاں ہیں کہ وہ کب اور کیسے یہاں پہنچے ان کو غلط ثابت کر کے رکھ دیا ہے۔

(بحوالہ سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۱رفروری ۱۹۷۹ء)

اس سے کچھ عرصہ پہلے ایک اور جدید تحقیق اخباروں میں چھپی تھی جس کے مطابق چودہ ہزار سال قبل امریکہ اور برازیل میں آسٹریلیا کے Aborigines نسل کے لوگ آباد تھے۔ دونوں کے Genes اور کھوپڑیاں باہم ایک جیسی تھیں۔اس پر یہاں کے اخباروں نے بڑے فخر سے یہ لکھا تھا کہ امریکہ کے قدیم ترین باسی تو ہم آسٹریلین تھے۔

جہاں تک آسٹریلیا کے قدیمی باشندوں کا تعلق ہے سائنسدان وثوق سے کہتے ہیں کہ وہ کم ازکم چالیس ہزار سال سے یہاں رہ رہے ہیں بلکہ اب تو پتھروں اور غاروں میں ایسے نشانات رستہ وغیرہ یا حدود متعین کرنے والے ملے ہیں جو ۶۰۰۰۰ سال تک پرانے ہیں اور یہ تقریباً وہ زمانہ ہے جب انسان دو پاؤں پر چلنے لگا تھا جسے Homo Erectus کہتے ہیں گویا یا تو انسان اسی زمانہ میں یہاں پہنچ گیا تھا اور یا پھر انسانیت کئی مراکز میں ارتقائی مراحل آزادانہ طور پر طے کرتی رہی ہے۔

اگر جدید سائنسی تحقیقات کو درست تسلیم کیا جائے تو یہ ماننے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ ہمارے آدم سے پہلے بھی زمین پر انسان بستا تھا اور آدم زمین پر خدا کا خلیفہ تو تھا لیکن پہلا انسان نہیں تھا۔

لیکن یہ بات بائبل کے بیان کے خلاف ہے جو کہتی ہے کہ آدم زمین پر پہلا انسان تھا (Genesis 1:26-2:8) اور چونکہ یہ بات سائنسی تحقیقات کے خلاف ہے لہٰذا بہت لوگ یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ یا تو بائبل محرف ہو چکی ہے یا وحی والہام کا سلسلہ (نعوذ باللہ) مشکوک ہے چنانچہ ایسے لوگ متشکک اور دہریہ ہو گئے ہیں۔

قرآن کریم کا انسانیت پر احسان ہے کہ اس نے اس معاملہ میں بھی لوگوں کو شک کی دلدل سے باہر نکالا ہے کیونکہ یہ کتاب خود شک سے بالا ہے۔ چنانچہ موجودہ تحقیقات سے بہت پہلے کوئی ۸۹ سال پہلے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ آدم سے پہلے بھی مخلوق موجود تھی۔ سائل پروفیسر ریگ انگلستان کا رہنے والا ایک ثقہ ماہر علم ہیئت تھا وہ تمام دنیا کی سیر کے ارادے سے وطن سے نکلا اور بڑے بڑے لیکچر دیتا پھر رہا تھا کہ لاہور بھی آ نکلا۔ حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ نے اس کے لیکچر کو سنا اور اس سے ملاقات کی اور تبلیغ کی۔ اس نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ ان دنوں اپنے آخری سفر کے دوران لاہور میں قیام پذیر تھے۔ حضور نے ملاقات کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس نے ۱۲ر مئی ۱۹۰۸ء اور دوسری بار ۱۸ر مئی ۱۹۰۸ء کو حضورؑ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور اس دوران اس نے بہت سے سوالات پوچھے جن کے حضور نے بہت لطیف جواب مرحمت فرمائے۔

(ملفوظات جلد دہم صفحہ ۳۵۳، ۴۲۶)

ایک سوال جو اس نے پوچھا وہ یہ تھا کہ

''بائبل میں لکھا ہے کہ آدم یا یوں کہئے کہ پہلا انسان جیحون یحون میں پیدا ہوا تھا اور اس کا وہی ملک تھا۔ تو پھر کیا یہ لوگ جو دنیا کے مختلف حصوں امریکہ، آسٹریلیا وغیرہ میں پائے جاتے ہیں یہ اس آدم کی اولاد سے ہیں؟''

اس سوال کا جو جواب حضورؑ نے مرحمت فرمایا وہ یہ تھا کہ:

''ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی اس مسئلہ میں ہم توریت

کی پیروی کرتے ہیں کہ چھ سات ہزار سال سے ہی جب سے یہ آدم پیدا ہوا تھا اس دنیا کا آغاز ہوا ہے اوراس سے پہلے کچھ بھی نہ تھا اور خدا گویا معطل تھا۔ اور نہ ہی ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ یہ تمام نسل انسانی جو اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہے یہ اسی آخری آدم کی نسل ہے۔ہم تو اس آدم سے پہلے بھی نسل انسانی کے قائل ہیں جیسا کہ قرآن شریف کے الفاظ سے پتہ لگتا ہے۔خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرہ:۳۱) خلیفہ کہتے ہیں جانشین کو۔اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آدم سے پہلے بھی مخلوق موجود تھی پس امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ کے لوگوں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اسی آخری آدم کی اولاد میں سے ہیں یا کہ کسی دوسرے آدم کی اولاد میں سے ہیں۔‘‘

(ملفوظات جلد دہم صفحہ ۴۳۲)

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ امر یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کشفاً یہ علم دیا گیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کا ظہور (یعنی دعویٰ نبوت یا قرآنی وحی کا آغاز) آدم کے ۴۵۹۸ شمسی سال بعد ہوا اور آنحضرت ﷺ کے روز وفات تک ۴۷۳۹ قمری سال گزر چکے تھے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۲۔۹۴)

اس حساب سے تا دم تحریر آدمؑ سے ۵۹۸۵ شمسی سال گزر چکے ہیں (ہوسکتا ہے اس بنیاد پر کبھی نئے کیلنڈر کا آغاز بھی کیا جائے) یہ عرصہ قمری حساب سے ۶۱۴۶ سال بنتا ہے۔ظہور نبوت ۲۰ اگست ۶۱۰ء کو ہوا تھا جس پر ۱۳۸۷ سال گزر چکے ہیں۔

(عہدی نبوی کا قمری شمسی کیلنڈر مؤلفہ مولانا دوست محمد شاہد صاحب)

قرآن کریم کا اسلوب بائبل کی اصلاح کرنے کا بڑا پیارا ہے۔کاش بائبل کے پیروکار قرآن کریم کے اس احسان پر غور کریں۔یہی ایک مثال لے لیں۔بائبل بھی کہتی ہے کہ آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور قرآن بھی کہتا ہے کہ آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا۔لیکن قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مٹی سے پیدا کیا گیا اور اے انسانو تم سب کو بھی مٹی سے پیدا کیا گیا، آدم کی اس بارہ میں

تخصیص ختم کردی ہے اوریوں وضاحت بھی کردی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کومٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا گیا ہے۔یعنی وہی عناصر جومٹی میں ہوتے ہیں وہ سبزیوں، پھلوں، اناجوں، دودھ گوشت وغیرہ کے توسط سے کئی حالتیں بدل کر انسان کے جسم کا حصہ بنتے ہیں۔اس طرح بائبل کی اصلاح بھی کردی کہ آدم کومٹی سے پیدا کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بغیر کسی تغیر وتبدل کے مٹی سے ہی پیدا کیا گیا تھااور لہٰذاوہ پہلا انسان تھا۔قرآن کریم نے عیسٰی علیہ السلام کے بارہ میں فرمایا:

''عیسٰی کا حال اللہ کے نزدیک یقیناً آدم کے حال کی طرح ہے اسے (یعنی آدم کو) اس نے خشک مٹی سے پیدا کیا، پھراس کے متعلق کہا کہ وجود میں آجا تو وہ وجود میں آنے لگا۔''

(آل عمران:۶۰)

نیز تمام انسانوں کومٹی سے پیدا کرنے کے بارہ میں فرمایا''اوراس کے نشانات میں سے (ایک نشان) یہ بھی ہے کہ اس نے تم کومٹی سے پیدا کیا۔ پھراس پیدائش کے نتیجہ میں تم بشر بن جاتے ہواور (تمام زمین میں) پھیل جاتے ہو۔

(الروم:۲۱)

الغرض آدم بھی اسی طرح مٹی سے پیدا ہوئے تھے جس طرح ہم سب اور عیسٰی پیدا ہوئے تھے لہٰذا وہ پہلے انسان نہ تھے۔اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انسان کے زمین میں پھیل جانے کا ذکر بھی کیا ہے۔

مذکورہ بالا تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں ہی دنیا میں پھیل گیا تھا۔نوع انسانی کا ارتقاء بطور ایک درخت کے ہوا جوایک ہی جڑ سے نکلا اور جس کی شاخیں در شاخیں اور پھر آگے ان کی شاخیں دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئیں۔انسان کی تخلیق کے بعد اللہ نے اس کو مناسب حال قوتیں عطا کیں اوران کے مناسب حال ہدایت کا سامان کیا۔ چنانچہ ہر شاخ درشاخ میں جونہی انسان، جسمانی، ذہنی، معاشرتی اور روحانی لحاظ سے اس قابل ہوا کہ خدا کی طرف سے آنے والی ہدایت کو حاصل کر سکے۔سمجھ سکے اوراس پرعمل کر سکے تو اللہ نے وہاں اپنا خلیفہ بصورت آدم مقرر فرما دیا۔ساری دنیا کی طرف صرف حضرت محمد ﷺ کو ہی مبعوث کیا گیا تھا۔اگر ہر شاخ در

شاخ میں اپنے اپنے وقت پر ایک آدم آیا ہو تو کوئی عجب نہیں کہ اب تک ایک لاکھ آدم گزر چکے ہوں (علاوہ ازیں آدم سے تمثیلی طور پر ابن آدم یا نوع انسانی بھی مراد ہو سکتا ہے)

چنانچہ نوع انسان کا شجر شاخ در شاخ ہو کر جو دنیا میں پھیلا اس پر ترقی و تباہی اور جہالت و ہدایت کے بھی دور آتے رہے ہیں جس طرح دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں اور سالوں میں تبدیل ہوتے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کب سے یہ حالات انسانوں پر گزر رہے ہیں۔ ہمارے آدم سے تو بہر حال پہلے کے ہیں کیونکہ ان کو آئے ہوئے تو صرف ۵۹۸۵ سال ہی اب تک گزرے ہیں۔ **واللہ اعلم بالصواب.**

(الفضل انٹرنیشنل 9.5.97)

انسان افریقہ سے عرب میں آیا اور پھر وہاں سے دنیا میں پھیلا۔ نیا انکشاف

مروجہ تھیوری کے مطابق نسل انسانی افریقہ میں کوئی ڈیڑھ لاکھ سال پہلے ابھری تھی اور وہاں سے شمال کی طرف مصر اور مشرق وسطیٰ میں ہجرت کر گئی اور پھر وہاں سے آگے دنیا میں پھیلی لیکن اب نئی تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ تمام انسان جو اس وقت دنیا میں موجود تھے وہ افریقہ سے ۶۵ تا ۷۵ ہزار سال قبل جزیرہ نمائے عرب (موجودہ سعودی عرب) میں آئے اور پھر وہاں سے مختلف اطراف میں پھیلے تھے۔ ایک حصہ ان کا ۶۵ ہزار سال قبل بحیرۂ ہند کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے جزائر انڈیمان۔ ملیشیا اور انڈونیشیا میں پہنچے اور وہاں سے آگے ۴۶ ہزار سال پہلے جنوبی آسٹریلیا تک جا پہنچے۔ چنانچہ اسی وقت سے آسٹریلیا کے اصل باشندے (Aborgines) وہاں رہ رہے ہیں۔ انسانوں کا دوسرا گروہ ۳۰ تا ۴۰ ہزار سال پہلے یورپ کی طرف گیا۔ اس زمانہ میں انسان سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ رہتا اور آگے بڑھتا تھا اس نئی تحقیق نے پہلی تھیوری کو غلط قرار دے دیا ہے۔

مندرجہ بالا تحقیق دو مختلف اداروں نے اپنے اپنے طور پر آزادانہ کی ہے لیکن وہ دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ایک ٹیم کا تعلق آسٹریلیا کی نیشنل یونیورسٹی سے تھا اور دوسری کا کیمرج یونیورسٹی سے۔

تحقیق کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ تمام عورتوں کو ان کی ماں کی طرف سے ایک ڈی این اے ورثہ میں ملتا ہے جس کو Mitochrondrial D.N.A کہا جاتا ہے۔ اس ڈی این اے میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں (Mutations) آتی رہتی ہیں۔ انہیں تبدیلیوں سے وقت کا اندازہ ہوتا ہے

کہ کس نسل کا کس سے تعلق ہے اور کب سے وہ تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں یہ تبدیلیاں گویا تاریخی گھڑی (Historical Watch) کا کام دیتی ہے۔

(ماخذ سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۱۴، ۱۵ مئی ۲۰۰۵ء)

یہ جدید تحقیق ہمارے لئے بہت دلچسپی کی حامل ہے۔ اگر ابتدائی انسان وادیٔ بکّہ میں آباد ہوئے تھے جس کا مرکزی مقام مکہ تھا تو وہی تمام دنیا کے لئے اُمُّ القریٰ یعنی بستیوں کی ماں ٹھہرتا ہے ۔اسی جگہ پہلے نبی آدمؑ مبعوث ہوئے ہوں گے اور جو زبان خدا نے انہیں سکھائی ہوگی وہی (یعنی عربی) اُمُّ الْاَلْسِنہ یعنی زبانوں کی ماں ہوگی جس سے بگڑ کر دنیا کی سب زبانیں وجود میں آئی ہوں گی پس تمام انسانوں کا نہ صرف روحانی مرکز ہی مکہ ٹھہرتا ہے بلکہ اصل وطن بھی وہی ٹھہرتا ہے نیز اسی جگہ کو خدا نے یہ عزت بخشی کہ جہاں پہلا نبی آیا تھا اور پہلی ہدایت نوعِ انسان کو عطا ہوئی تھی وہیں آخری ہدایت لے کر خاتم النبیینؐ مبعوث ہوا تا ابتدا اور انتہاء باہم مشابہ ہوں۔

دنیا کی عمر

یہ کائنات کب سے ہے؟ زمین کب وجود میں آئی؟ اس میں حیات کب پیدا ہوئی؟ انسان نے کب جنم لیا؟ زمین کا انجام کیا ہے؟ اس کا خاتمہ کب اور کیسے ہوگا؟ یہ وہ چند سوالات ہیں جو ہمیشہ سے انسان کی دلچسپی کا مرکز رہے ہیں اور فلاسفر اور سائنسدان ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ جوں جوں انسان کا علم ترقی کرتا گیا متعدد نظریات قائم ہوتے اور تبدیل ہوتے رہے۔ اس مقالہ کا مقصد سائنس اور قرآن وحدیث اور تحریرات حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی روشنی میں ان سوالوں کا جواب تلاش کرنا ہے۔ وباللہ التوفیق

عمر زمین از روئے سائنس

زمین کی عمر کے متعلق سائنسدانوں کے مختلف نظریات

Mr.W.Maxwall Reed اپنی کتاب The Stors for Sam میں زمین کی عمر کے بارہ میں مختلف نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ ہے ہماری زمین کی قدیم تاریخ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بہت کچھ جان لینے کے باوجود ہم ابھی کچھ بھی نہیں جانتے۔ ہم سب کے سب زمین کے حال اور مستقبل کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ کبھی ان معلومات میں اضافہ ہوجاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نئے حقائق کی روشنی میں پرانے نظریات کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔''

پھر لکھتے ہیں:

''ہماری زمین کی پیدائش کسی ایسے حادثے کا نتیجہ ہے جب آج سے تقریباً دس ارب سال پہلے سورج کسی دوسرے ستارے کے ساتھ ٹکرا گیا یا دونوں اس قدر قریب سے گزرے کہ سورج متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا (اور زمین سورج سے علیحدہ ہو کر گردش کرنے لگ پڑی)

جارج گیمو George Gamow نے اپنی کتاب Biography of Earth میں لکھا ہے کہ زمین سورج کے بطن سے دو ارب سال پہلے پیدا ہوئی۔ سید محمد تقی صاحب اپنی کتاب ''روح اور فلسفہ'' میں زمین کی عمر کے بارہ میں مختلف نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حیات کی عمر سے متعلق اب سے کچھ پہلے تک قیاس یہ تھا کہ وہ اسی کروڑ سال پہلے وجود میں آئی تھی۔ لیکن جدید تحقیقات کی بناء پر حیات کی عمر اس سے بہت زیادہ خیال کی جاتی ہے۔ ایڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر آرتھر ہومس نے بتایا ہے کہ حیات کی عمر لگ بھگ تین ارب سال ہے......

.....اب تک حیاتیات کی نصابی کتابوں میں آغاز حیات کی عمر پچاس کروڑ یا زیادہ سے زیادہ اسی کروڑ بتائی جاتی تھی اور کائنات کی عمر دو ارب سال مگر تازہ انکشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات کی عمر تین ارب سال اور غالباً پانچ یا دس ارب کے درمیان یا اس سے بھی زیادہ ہوگی۔''

الغرض سائنس دان نے زمین پر زندگی کی عمر دو ارب سے دس ارب سال کے درمیان بیان کی ہے۔

سائنس دان نے زمین کی عمر کے اندازے کس طرح لگائے ہیں؟

یہاں طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے ذرائع ہیں جن کے ذریعہ سائنسدانوں نے زمین کی عمر کے اندازے لگائے ہیں۔ اختصار کے ساتھ دو اہم ترین ذرائع کا یہاں ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔

ا۔ سمندروں کی عمر: سمندر ہماری زمین کے تقریباً تین چوتھائی حصوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ سمندر کا پانی نمکین ہوتا ہے لیکن کم لوگوں نے اس پر غور کیا ہوگا کہ یہ نمک ان ہی دریاؤں کا لایا ہوا ہے جن کے پانی کو ہم شیریں کہتے ہیں۔ سمندر کا پانی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے لیکن نمک سمندروں ہی میں رہ جاتا ہے۔ اس طرح ہر سال سمندر کے پانی میں نمک کی مقدار بڑھتی جاتی ہے۔ ہمارے سمندروں میں اس وقت جتنا نمک موجود ہے وہ انتہائی مقدار کا تقریباً دسواں حصہ ہے اور اس کا وزن تقریباً چالیس لاکھ ارب ٹن ہے۔ دنیا کے تمام دریا ہر سال تقریباً چالیس کروڑ ٹن نمک مختلف سمندروں میں لا ڈالتے ہیں۔ اگر ہم سمندروں کے کل نمک اور ہر سال کے اضافہ کا مقابلہ کریں تو سمندروں کی عمر تقریباً ڈیڑھ ارب سال بنتی ہے۔

۲۔ چٹانوں کی عمر: اللہ تعالیٰ نے چٹانوں میں اپنی ایک گھڑی چھپا رکھی ہے جسے دیکھ کر ماہرین ارضیات زمین کی عمر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ گھڑی یہ ہے کہ کچھ چٹانوں میں Uranium اور Thorium کے Radio Active Elements پائے جاتے ہیں جو ''الفاذرات'' بڑی تیزی سے اپنے چاروں طرف پھیلاتے ہیں۔ ان ذرات کے جدا ہونے کی وجہ سے یہ تابکار عناصر بالآخر سیسہ (Lead) میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایک معینہ مدت میں ان خارج ہونے والے ''الفاذرات'' کی مقدار کا اندازہ ایک نہایت حساس آلہ ''گیگر کاؤنٹر'' کے ذریعہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ ایک ایک ذرہ کے اخراج کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ یورینیم کی کسی بھی مقدار کو اس انتشار اور تبدیلی کی وجہ سے نصف رہ جانے میں ساڑھے چار ارب سال لگتے ہیں۔ اسی طرح تھوریم کی مقدار کو نصف رہنے میں ساڑھے سولہ ارب سال لگنے چاہئیں۔ سائنسدانوں کے نزدیک دنیا میں کسی بھی چیز کی عمر دریافت کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں۔

اب ان چٹانوں کا معائنہ کرنے سے جن میں یورینیم اور تھوریم پایا جاتا ہے یہ دیکھ کر ان میں بچا کھچا سیسہ کتنی مقدار میں ہے ان چٹانوں کی عمر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جو اندازہ اس طرح پر لگایا گیا ہے وہ تقریباً دو ارب سال بنتا ہے۔

قرآن مجید کی رو سے ایک ایک زمینی دور پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے اور اس کا آخری سات ہزار سالہ حصہ دورِ انسانیت یا دورِ نبوت کہلاتا ہے

چنانچہ سورۂ معارج میں آتا ہے کہ سائل پوچھتا ہے کہ دنیا کو ختم کر دینے والا اٹل عذاب کب آئے گا؟ جس کے جواب میں خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ عذاب ذوالمعارج خدا تعالیٰ کی طرف سے آکر رہے گا۔

کب آئے گا؟۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (المعارج:۵) یعنی عام فرشتے اور کلام الٰہی لانے والے فرشتے اس خدا کی طرف اتنی مدت میں چڑھا کرتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ ایک زمینی دور کا خاتمہ پچاس ہزار سال کے بعد ہوتا ہے۔ یعنی ہر پچاس ہزار سال کے بعد دنیا کا نظام چلانے والے اور کلام الٰہی لانے والے فرشتے اپنے فرائض سرانجام دے کر خدا تعالیٰ کی طرف لوٹ جایا کرتے ہیں۔ فرشتوں کی ڈیوٹی یا شفٹ تبدیل ہوتی ہے ۔ پہلے دور کے فرشتے واپس لوٹ جاتے ہیں اور دوسرے دور کے فرشتے چارج سنبھال لیتے ہیں۔

اس آیت کی تشریح میں پرانے مفسرین اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے دنیا کی عمر پچاس ہزار سال ہی لکھی ہے یعنی اس دور کی جس کا ہمارے ساتھ تعلق ہے۔ حضورؓ تفسیر صغیر میں اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

> ”صلحاء اور اولیاء نے حضرت آدمؑ سے لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک پانچ ہزار سال کی عمر قرار دی ہے مگر اندازے الگ الگ حساب سے ہوتے ہیں۔ پس یہ اختلاف کوئی نہیں۔ آدمؑ کی نسل سے سلسلہ انبیاء کی عمر ممکن ہے سات ہزار سال ہو۔ اور طبقات الارض کے اندازے کے

لحاظ سے دنیا کی عمر پچاس ہزار سال ہو۔ پس یہ کوئی اختلاف نہیں۔"

حضورؓ کی اس تشریح سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا ایک دور پچاس ہزار سال کا اور اس دور کے آدم سے لے کر اس کے خاتمہ تک کا عرصہ سات ہزار سال ہوتا ہے۔

دور کے خاتمہ کا حال

اسی سورۃ معارج میں آگے چل کر دور کے خاتمہ کا حال بیان ہوا ہے اور ان خرابیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں آخری زمانہ کے انسان مبتلا ہوں گے اور جو خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے کا موجب ہوں گے۔ ان سب امور کو بیان کرنے کے بعد سورۃ کے آخر میں فرمایا ذٰلِکَ الْیَوْمُ الَّذِیْ کَانُوْا یُوْعَدُوْنَ (المعارج:۴۵) کہ یہ ہے وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے یعنی یہ ہے تفصیل اس دور کے خاتمہ کی جس کے بارہ میں سائل نے سوال کیا تھا۔

پچاس ہزار سالہ زمینی دور کے خاتمہ کا حال بیان فرماتے ہوئے بتایا کہ اس کا خاتمہ شدید شعلہ والے عذاب سے ہوگا۔ آسمان کا رنگ پگھلائے ہوئے تانبہ کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ دھنی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے اور کوئی شخص اس سے بھاگ کر بچ نہیں سکے گا۔

ان آیات کی تشریح میں حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"یعنی ایسی ایسی ایجادیں نکل آئینگی جیسے ایٹم بم اور ہائیڈ روجن بم کہ جن کے گرنے سے پہاڑوں جیسی مضبوط چیز بھی روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائے گی۔"

ابھی چند روز ہوئے ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ ایک روسی ماہر کے اندازہ کے مطابق اس وقت بھی دنیا میں اتنے ایٹمی ہتھیار موجود ہیں کہ جو ساری دنیا کی مکمل تباہی کے لئے کافی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا قرآن مجید کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔

دورِ انسانیت سات ہزار سال کا ہوتا ہے

پچاس ہزار سالہ "زمینی دور" کے آخری سات ہزار سالہ حصہ کو دورِ انسانیت ی دورِ نبوت کہا

جاتا ہے۔ یہ آخری سات ہزار سال ظہور آدمؑ سے لے کر اس دور کے خاتمہ تک ہوتے ہیں۔

پچاس ہزار سالوں کے ابتدائی تینتالیس ہزار سالوں میں زمین روئیدگی سے تقریباً خالی ہوجاتی ہے اور ہزاروں سالوں کے بعد آہستہ آہستہ زندگی کے قیام اور انسان کی رہائش کے قابل ہوتی ہے۔ گزشتہ دور کے خاتمہ پر جو اِکا دکا انسان استثنائی طور پر دنیا کے کسی حصہ میں جان سے بچ جاتے ہیں وہ اس عذاب اور اس کی مسموم فضا سے ذہنی اور جسمانی طور مفلوج ہوجاتے ہیں اور انسان کہلانے کے قابل نہیں رہتے۔ پیدائش انسانی کا سلسلہ تقریباً ختم ہوجاتا ہے۔ اگر کہیں کوئی بچہ جنم بھی لے تو وہ بھی مسموم فضا سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایٹم بم کے اثرات بھی ایسے ہی بیان کئے جاتے ہیں۔

حیوانات اس صدمہ سے پہلے نجات حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ درندوں سے بچنے کے لئے وہ نامکمل انسان غاروں میں رہنا شروع کردیتے ہیں ایک وقت کے بعد خدا کی رحمت پھر جوش میں آتی ہے اور ان کے قویٰ ترقی کرنے لگتے ہیں اور مسموم فضا کے اثرات دور ہونا شروع ہوتے ہیں اور جب وہ اس قابل ہوجاتے ہیں کہ مل جل کر رہ سکیں تو اللہ تعالیٰ آدم کو زمین میں اپنا جانشین مقرر کردیتا ہے۔ وہ انہیں وحدانیت کا ابتدائی درس دیتے ہیں۔ غاروں سے باہر نکال کر معاشرہ کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ عربی زبان اور زراعت کا علم سکھاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد انسان دوبارہ تیزی سے ترقی کی منازل طے کرنے لگ پڑتا ہے۔ اس دور انسانیت کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام لیکچر سیالکوٹ میں صفحہ ۶۔۷ پر فرماتے ہیں:

> ”تمام نبیوں کی کتابوں سے اور ایسا ہی قرآن شریف سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے آدمؑ سے لیکر اخیر تک دنیا کی عمر سات ہزار سال رکھی ہے... چونکہ یہ آخری ہزار ہے اس لئے ضرور تھا کہ امامِ آخرالزمان اس کے سر پر پیدا ہو اور اس کے بعد کوئی امام نہیں اور نہ کوئی مسیح مگر وہ جو اس کے لئے بطور ظل کے ہو۔ کیونکہ اس ہزار میں اب دنیا کی عمر کا خاتمہ ہے جس پر تمام نبیوں نے شہادت دی ہے اور یہ امام جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مسیح موعود کہلاتا ہے وہ مجدد صدی بھی ہے اور مجدد الفِ آخر بھی۔“

پھر حضور علیہ السلام لیکچر لاہور صفحہ ۳۸۔۳۹ پر فرماتے ہیں:

”یہ سب علامتیں اس زمانہ میں پوری ہوگئیں (یعنی قرب قیامت کی ناقل) اور ایک اور علامت قرآن شریف نے مسیح موعود کے زمانہ کے لئے قرار دی ہے کہ ایک جگہ فرماتا ہے اِنَّ یَوْماً عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ یعنی ایک دن خدا کا ایسا ہے جیسا تمہارا ہزار برس ہے۔ پس چونکہ دن سات ہیں اس لئے اس آیت میں دنیا کی عمر سات ہزار برس قرار دی ہے۔ لیکن یہ عمر اس آدم کے زمانہ سے ہے جس کی ہم اولاد ہیں۔ خدا کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی دنیا تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگ کون تھے اور کس قسم کے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سات ہزار برس میں دنیا کا ایک دور ختم ہوتا ہے... ہمیں معلوم نہیں کہ دنیا پر اس طرح سے کتنے دور گزر چکے ہیں اور کتنے آدم اپنے اپنے وقت میں آچکے ہیں ......اس حساب سے انسانی نوع کی عمر میں سے اب اس زمانہ میں چھ ہزار برس گزر چکے ہیں اور ایک ہزار برس باقی ہیں۔“

ایک لاکھ آدم گزرے ہیں

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ تفسیر کبیر میں سورۃ حج کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس موقعہ پر حضرت محی الدین صاحب ؒ ابن عربی کے ایک کشف کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب فتوحات مکیہ کی جلد ۳ میں بیان فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ”میں نے ایک دفعہ کشفی حالت میں دیکھا کہ میں بیت اللہ کا طواف کر رہا ہوں اور میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں مگر وہ کچھ اجنبی قسم کے لوگ ہیں جن کو میں پہچانتا نہیں۔ پھر انہوں نے دو شعر پڑھے جن میں سے ایک تو مجھے بھول گیا مگر دوسرا یاد رہا۔ وہ شعر جو مجھے یاد رہا وہ یہ تھا کہ

؎ لَقَدْ طُفْنَا کَمَا طُفْتُمْ سِنِیْنَا
بِھٰذَا الْبَیْتِ طُرًّا اَجْمَعِیْنَا

یعنی ہم بھی اس مقدس گھر کا سالہا سال اسی طرح طواف کرتے رہے ہیں جس طرح آج تم اس کا طواف کرر ہے ہو۔ وہ فرماتے ہیں مجھے اس پر بڑا تعجب ہوا۔ پھران میں سے ایک شخص نے مجھے اپنا نام بتایا مگروہ نام بھی ایسا تھا جو میرے لئے بالکل غیر معروف تھا۔ اس کے بعد وہ شخص مجھ سے کہنے لگا کہ میں تمہارے باپ دادوں میں سے ہوں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو وفات پائے کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟ اس نے کہا کہ چالیس ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ میں نے کہا کہ زمانۂ آدم پر تو اتنا عرصہ نہیں گزرا۔ اس نے کہا تم کس آدم کا ذکر کرتے ہو؟ کیا اس آدم کا جو تمہارے قریب ترین کا زمانہ میں ہوا ہے یا کسی اور آدم کا؟ وہ کہتے ہیں اس پر معاً مجھے آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث یاد آ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ آدم پیدا کئے ہیں اور میں نے یہ سمجھا کہ میرے یہ جد اکبر بھی انہیں میں سے کسی آدم سے تعلق رکھنے والے ہونگے۔

(فتوحات مکیہ جلد۳ باب ۲۹ صفحہ ۵۴۹ منقول از تفسیر کبیر)

حضرت محی الدین صاحب ابن عربیؒ کا یہ کشف بتا رہا ہے کہ بیت اللہ نہایت قدیم زمانہ سے دنیا کا مرکز اور لوگوں کی ہدایت کا ایک ذریعہ بنا رہا ہے اور اسی طرح یہ دنیا بھی لاکھوں سال سے چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ آج سے ہزار ہا سال قبل بھی لوگ اس مقدس گھر کا اسی طرح طواف کرتے رہے ہیں۔ یہی حقیقت قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے کہ یہ بیت العتیق ہے جو زمانہ قدیم سے خدا تعالیٰ کے انوار و برکات کا تجلی گاہ رہا ہے اور قیامت تک دنیا کو ایک مرکز پر متحد رکھنے کا ذریعہ بنا رہے گا۔‘‘

(تفسیر کبیر جلد ۵ حصہ اول صفحہ ۳۸۔۳۹)

حضرت آدم علیہ السلام کا سن پیدائش

آیئے اب آدم علیہ السلام کا سن پیدائش معلوم کریں ۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ تو زمانہ ماقبل تاریخ کی بات ہے،اس زمانہ کی کوئی تحریر یا ریکارڈ دستیاب نہیں ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ آدم علیہ السلام کے زمانہ کا کوئی ایسا پتھر بھی دستیاب نہیں ہوسکتا جس پر ’’قبل مسیح‘‘ میں کوئی سن درج ہو لیکن خدائے علیم وخبیر سے کوئی بات مخفی نہیں ۔اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کشفاً آدمؑ کے سن پیدائش سے خبر دی ۔چنانچہ حضورؑ فرماتے ہیں:۔

’’خدا تعالیٰ نے مجھے ایک کشف کے ذریعہ سے اطلاع دی ہے کہ سورۃ العصر کے اعداد سے بحساب ابجد معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک عصر تک جو عہد نبوت ہے یعنی تیئس برس کا تمام وکمال زمانہ کل مدت گزشتہ زمانہ کے ساتھ ملا کر ۴۷۳۹ برس ابتدائے دنیا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روز وفات تک قمری حساب سے ہے۔‘‘

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۳۔۹۴)

پھر حضور علیہ السلام فرماتے ہیں:

’’شمسی حساب کی رو سے ۵۴۶۹ برس بعد آدم صفی اللہ حضرت نبینا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہر ہوئے۔‘‘

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۲)

اگر ظہور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دعویٔ نبوت مراد لیا جائے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۱۰ءعیسوی میں فرمایا تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مذکورہ بالا کشف کی رو سے آدم علیہ السلام سن ۳۹۸۸ قبل مسیح پیدا ہوئے۔

دنیا کی عمر

الغرض اگر ایک لاکھ دور گزرے ہوں اور ہر دور قرآن کریم کے مطابق پچاس ہزار سال کا

ہوتو زمین پر انسانی زندگی کی عمر اب تک پانچ ارب سال بنتی ہے۔اور حیوانات اور نباتات کی عمر اس سے زائد ہوگی چونکہ زمین کو ٹھنڈا ہونے اور آبادی کے قابل ہونے کے لئے بھی ایک طویل عرصہ درکار تھا لہٰذا زمین کی عمر نباتات کی عمر سے زائد ہونی چاہیئے۔ظاہر ہے کہ کائنات کی عمر زمین کی عمر سے بھی زائد ہوگی۔

ہمارے زمینی دور کے جب ابتدائی تنتالیس ہزار سال گزر گئے تو آدم علیہ السلام پیدا ہوئے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ۴۷۳۹ سال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے اب تک (یعنی ۱۹۶۸ء تک) ۱۳۷۸ قمری سال گزرے ہیں گویا ہمارے پچاس ہزار سالہ دور میں سے ۴۹۱۱۷ سال اور دورِ نبوت سے یا آدم علیہ السلام کی پیدائش سے اب تک ۶۱۱۷ سال گزر چکے ہیں اور ہمارے دور کے خاتمہ میں تقریباً نوسو سال باقی ہیں۔گویا ہم دنیا کے آخری دنوں میں سے گزر رہے ہیں اور قرآن مجید نے جو آخری زمانہ کی نشانیاں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمائی تھیں وہ سب پوری ہو چکی ہیں۔

یہاں یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ یہ سب اندازے قربِ قیامت کے ہیں جس کی بہت سی علامات قرآن کریم اور احادیث میں مذکور ہیں لیکن یہ امر کہ وہ ساعت عین کب واقع ہوگی اور ہمارے دور کی گھڑی اپنے آخری منٹ کا کب اعلان کرے گی؟ اس کا علم صرف خدا تعالیٰ ہی کو ہے اور یہی قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے۔

وحدت اور کثرت کے دور

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ وحدت اور کثرت کے بھی دور ہوتے ہیں۔چنانچہ حضورؑ فرماتے ہیں:

> ''خدا تعالیٰ قدیم سے خالق چلا آتا ہے لیکن اس کی وحدت اس بات کو بھی چاہتی ہے کہ کسی وقت سب کو فنا کر دے۔ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ وقت کب آئے گا مگر ایسا وقت ضرور آنے والا ہے۔یہ اس کے آگے ایک کرشمہء قدرت ہے وہ چاہے پھر خلقِ جدید کر سکتا ہے۔'' (ملفوظات جلد ۹ صفحہ ۱۹۳)

پھر حضورؑ فرماتے ہیں:

''پس خدا تعالیٰ کی صفاتِ قدیمہ کے لحاظ سے مخلوق کا وجود نوعی طور پر قدیم ماننا پڑتا ہے نہ شخصی طور پر۔ یعنی مخلوق کی نوع قدیم سے چلی آتی ہے۔ ایک نوع کے بعد دوسری نوع خدا پیدا کرتا چلا آیا ہے سو اسی طرح ہم ایمان رکھتے ہیں اور یہی قرآن کریم نے ہمیں سکھایا ہے۔

اور ہم نہیں جانتے کہ انسان سے پہلے کیا کیا خدا نے بنایا مگر اسقدر ہم جانتے ہیں کہ خدا کی تمام صفات کبھی ہمیشہ کے لئے معطل نہیں ہوئیں اور خدا تعالیٰ کی قدیم صفات پر نظر کر کے مخلوق کے لئے قدامتِ نوعی ضروری ہے مگر قدامتِ شخصی ضروری نہیں۔''

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۶۸۔۱۶۹)

پھر حضورؑ فرماتے ہیں:

''اگرچہ اسلام بھی مخلوق کی نوعی قدامت کا قائل ہے مگر اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر ایک چیز مخلوق ہے اور ہر ایک چیز خدا کے سہارے سے قائم اور موجود ہے اور نیز اسلام اس بات کا قائل ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا جو خدا کے ساتھ کوئی نہ تھا اور صرف وحدت اپنا جلوہ دکھلا رہی تھی کہ خدا ایک پوشیدہ خزانے کی طرح تھا۔ پھر خدا نے چاہا کہ میں شناخت کیا جاؤں تو اس نے اپنی شناخت کے لئے انسان کو پیدا کیا مگر ہم نہیں جانتے کہ کتنی دفعہ وحدتِ الٰہی کا زمانہ آچکا ہے۔ اس کا علم خدا کو ہے۔ لیکن جیسا کہ دوسری صفات ہمیشہ کے لئے معطل نہیں رہ سکتیں ایسا ہی وحدتِ الٰہی کی صفت بھی ہمیشہ معطل نہیں رہتی اور کبھی کبھی اس کا دور آجاتا ہے۔ اور کبھی ذات الٰہی دنیا کو ہلاک کرنا چاہتی ہے اور کبھی پیدا کرنا کیونکہ احیاء اور امانت دونوں صفات اس کے ہیں۔ اس لئے ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ خدا ہر ایک جاندار کو ہلاک کرے گا یہاں تک کہ آسمان اور زمین کا بھی ایسے طور پر تختہ لپیٹ دے گا جیسا کہ ایک کاغذ لپیٹ دیا جاتا ہے

اوراس صورت میں تعطل صفات کا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ بعض صفات کی جب تجلی ہوتی ہے تو دوسری صفات جو ان کے مقابل پر ہیں اوران کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں وہ کسی دوسرے وقت میں ظاہر ہوتی ہیں اوراس وقت کی منتظر رہتی ہیں اور یہ ایک سلسلہ قدرت کا واقعی ہے جس سے اہلاک کے بعد احیاء لازم پڑا ہوا ہے پس انہیں معنوں سے ہم کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی کوئی صفت معطل نہیں ہوتی وہ قدیم سے محیي بھی ہے اور ممیت بھی ہے اور کوئی صفت اس کی ایسی نہیں ہے کہ پہلے تھی اور اب نہیں ہے یا اب ہے اور پہلے نہیں تھی۔

غرض ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی چیز خدا تعالیٰ کی وحدت کے ساتھ مزاحمت نہیں رکھتی۔ محض اسی کی ذات قائم بنفسہٖ اور ازلی ابدی ہے اور باقی سب چیزیں ہالکۃ الذات اور باطلۃ الحقیقت ہیں اور یہی خالص توحید ہے جس کے مخالف عقیدہ رکھنا سراسر شرک ہے۔''

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۸۵،۱۸۶،۱۸۹)

(الفرقان جنوری ۱۹۶۹ء)

حصہ سوم

دنیائے مذاہب

عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب پر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایک عجیب وغریب مضحکہ خیز دلیل

یہاں سڈنی میں ایک ''آسٹریلین کیتھولک یونیورسٹی کے پروفیسر رچرڈ سونبرن (Richard Swinburne) نے ایک تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہاں کے ایک موقر روزنامہ میں شائع ہوا۔ ساتھ اس پر تبصرے بھی شائع کئے۔ پروفیسر صاحب نے بعض مفروضوں (Assumptions) پر اپنی دلیل کی بنیاد رکھ کر ''امکانات کی تھیوری'' (Theory Of Probability) کے ذریعہ کمپیوٹر کے مدد سے حساب لگا کر یہ ثابت کیا کہ ایک ہزار میں سے ایک امکان ہے کہ یسوع کا مُردوں سے جی اٹھنا غلط ہو یعنی ہزار میں سے ۹۹۹ کا امکان ہے کہ وہ مر کر جی اٹھے ہوں۔ جن مفروضوں پر انہوں نے اپنے حساب کی بنیاد رکھی وہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ خدا کے موجود ہونے کا پچاس فیصد امکان ہے کیونکہ ہوسکتا ہے وہ واقعی موجود ہو اور ہوسکتا ہے نہ ہی ہو۔

۲۔ یسوع مسیح کو بعد وفات زندہ اٹھائے جانے کی بابت چاروں انجیلوں میں جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت محض پانچ فیصد گواہی کی ہے۔ دس میں سے صرف ایک امکان ہے کہ انجیلیں یسوع مسیح کی زندگی اور دوبارہ جی اٹھنے کا ذکر اُس طرح کریں گی جس طرح کہ انہوں نے کیا ہے۔

پروفیسر سونبرن صاحب نے اس سوال کے تین جزو بنائے ہیں۔

اوّل: کیا ایسے عقلی وسائنسی دلائل موجود ہیں جن کی رو سے خدا کا وجود ثابت ہوتا ہو۔

دوم: کیا ایسے عقلی دلائل موجود ہیں کہ خدا ایک مادی جسم اختیار کرسکتا ہے۔

سوم: اگر خدا مادی جسم اختیار کرسکتا ہے تو کیا وہ زمین پر اس طرح کی زندگی گزار سکتا ہے جس طرح کی انہوں نے گزاری۔

پروفیسر صاحب نے اس موضوع پر ایک کتاب شائع کی ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی ہے جس کا نام The Resurrection of God Incarnate ہے۔ یہی موضوع ان کے لیکچر کا تھا۔ امکانی تھیوری کے حساب کتاب کے مطابق دوبارہ جی اٹھنے کے امکان کا غلط ہونا ہزار میں سے ایک ہے۔

(ماخوذ ازسڈنی مارننگ ہیرلڈ ۱۹/جولائی ۲۰۰۵ء)

اخبار مذکور کی اشاعت ۱۹،۲۰ جولائی ۲۰۰۵ء میں پروفیسر صاحب کی تقریر پر جو تبصرے آئے وہ حسب ذیل تھے۔

یونیورسٹی آف نیوساؤتھ ویلز سڈنی کے شعبہ حساب کے پروفیسر کالن سدرلینڈ نے لکھا:

''میں گمان کرتا ہوں کہ دوبارہ جی اٹھنے کا مسئلہ ایسا ہے کہ اسے حساب کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ عمومی طور پر حساب آپ کو یہی بتا سکتا ہے کہ اگر یہ بات درست ہے تو فلاں دوسری بات بھی درست ہوگی لیکن ضروری ہے کہ آپ کے بنیادی مفروضے (Basic Assumptions) بڑے واضح ہوں۔ کیونکہ اس طرح کی بحث سے آپ جن نتائج پر پہنچتے ہیں وہ صرف اُنہیں مفروضوں کی عکاسی کرتے ہیں جن سے آپ نے اپنے حساب کا آغاز کیا تھا۔ اس مفروضہ کی کیا بنیاد ہے کہ خدا کے وجود کا امکان ۵۰ فیصد ہے اور اس بات کا امکان بھی ۵۰ فیصد ہے کہ اُس نے کبھی جسم اختیار کرلیا ہو۔''

پچاس فیصد امکان کے مضحکہ خیز ہونے کے بارہ میں مائیکل فاکس نے لکھا:

''رچرڈ سونبرن نے بتلایا ہے کہ اُن کے حساب کے مطابق اس بات کا ۹۷ فیصد امکان ہے کہ خدا نے یسوع کو مردوں میں سے اٹھایا ہو۔ یہ کیا ہی بے تکی بات ہے۔ اس دلیل میں بہت سی کمزوریاں ہیں مثلاً اسی کو دیکھیں کہ خدا یا تو ہے یا نہیں ہے۔ لہٰذا سونبرن کے نزدیک اس کا امکان ۵۰ فیصد ہے۔

اگراس دلیل کوآپ تسلیم کرتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ میرے گھر میں ایک پرانا ڈبہ پڑا ہوا ہے جس میں یا تو ایک ملین ڈالر پڑے ہیں یا نہیں پڑے ہیں۔ یہ ڈبہ میں آپ کوایک ہزار ڈالر کے بدلہ میں دے دوں گا۔ مشتری اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ اس میں ایک ملین ڈالر برآمد ہونے کا پچاس فیصد امکان ہے جس کے درست ہونے کی صورت میں آپ کو نو لاکھ ننانوے ہزار ڈالر کا فائدہ ہوگا۔ کوئی ہے جو خریدنا چاہے؟'' (ایضاً)

خاکسار عرض کرتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے جو سوالات اٹھائے ہیں اور ابتدائی مفروضے قائم کیئے ہیں ان پر تو بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ صرف چند ایک نکات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ ذرا اپنی امکانات کی تھیوری کو ان پر لگا کر دیکھیں تو شائد حقیقت ان پر کھل جائے۔

ا۔ عقل کی رو سے خدا کے وجود کا ثبوت:

(ا) ہر وہ چیز جس کی ابتداء ہے اس کی انتہاء بھی ہے۔ لہٰذا اُس کے ہونے سے پہلے بھی کوئی ہوگا اور اس کے ختم ہونے کے بعد بھی کوئی رہے گا۔ وہ وجود جو اوّل و آخر ہے جو اپنی ذات میں قائم اور ہر مخلوق کو قائم رکھنے والا ہے وہی خدا ہے۔ کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات اور وقت (مکان اور زمان) کا آغاز بگ بینگ سے ہوا تھا اور یہ کائنات ہمیشہ سے نہ ایسی رہی ہے اور نہ ایسے ہی رہے گی۔ کیا کوئی چیز اپنی خالق خود ہو سکتی ہے؟ اپنی طاقتوں، صفات، تاثیرات اور عمر وغیرہ کو خود اپنی مرضی سے متعین کر سکتی ہے؟ اگر تمام مخلوق اپنی طاقتوں کے دائروں میں پابند ہے اور ان سے باہر نہیں نکل سکتی تو وہ حدیں مقرر کرنے والی ہستی کون سی ہے؟

(ب) کائنات کے کھربوں کھرب ستاروں کو بغیر ظاہری ستونوں کے کس نے لٹکا رکھا ہے؟ کرّوں کو اپنے اپنے مدار (Orbit) میں کس نے رکھا ہوا ہے؟ مدار میں چلتے رہنے کے لئے کرّوں کا مادہ (Mass)، قوت کشش (Gravity)، ان کا باہم فاصلہ اور رفتار گردش (Velocity) وغیرہ کا ایک خاص مقدار میں ہونا کائنات میں وضع میزان (توازن) کے لئے ضروری ہے۔ اگر ان میں سے ایک چیز بھی کم و بیش ہو تو کرّے یا تو باہم قریب ہو کر ٹکرا جائیں یا دور ہو کر تباہ ہو جائیں۔ کیا یہ ایک

مدبّر بالا رادہ خدا کی تخلیق ہے یا محض اتفاق (Chance)؟ مختلف عناصر (Elements) کے ایٹم باہم اکٹھے کیسے ہو گئے؟ مثلاً کہیں لوہا بن گیا کہیں سونا، پیتل اور کاربن وغیرہ اور پھر عناصر کا باہم تعلق کیا خود بخود بن گیا تھا؟ ستاروں کو مدار میں رکھنے کا نظام کائنات کے ایک ایک ایٹم میں کس نے قائم کیا جس سے الیکٹران مرکز کے گرد کئی طاقتوں کے زیر اثر توازن برقرار رکھتے ہوئے ہر آن محوِ گردش رہتے ہیں؟

(ج) سائنسدان کہتے ہیں کہ اگر اتفاق (Probability or Chance) اتنی کم ہو جائے کہ ایک (ا) کے عدد کے دائیں طرف پچاس صفرے لگانے سے جو عدد بنتا ہے اُس میں سے صرف ایک امکان رہ جائے تو ایسا امکان عملاً صفر سمجھا جاتا ہے یعنی امکان رہتا ہی نہیں۔ ڈیزائن یا ارادہ سے ہی ایسے ہو سکتا ہے۔ اب وہ Amino Acids پانچ سو ہیں جو باہم مل کر ہر پروٹین کا مالیکیول بناتے ہیں ایسے کھربوں ہر انسان کے وجود کا حصہ ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ ایمینو ایسڈ اتفاق سے اکٹھے ہو کر ایک مالیکیول (Molecule) بناتے تو اس کا امکان ایک (ا) کے دائیں طرف ۹۵۰ صفر اگر لگا دیئے جائیں تو ان میں سے صرف ایک دفعہ کا ہے۔ گویا اس کو امکان کا نام دیا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ یہ کسی حکیم و قدیر مُدَبّر بالا رادہ ہستی کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ پروفیسر صاحب اِسے ۵۰ فیصد امکان کیسے قرار دے سکتے ہیں۔

(د) حیوانات کے وجود کا ذرّہ ذرّہ، ان کے اعضاء، قُویٰ، استعدادیں اور پھر ان کو استعمال کرنے کے لئے جِبلّت (Instinct) اور شعور کے ذریعہ ہدایت میں اَن گنت راز پوشیدہ ہیں۔ مثلاً پرندوں کا انڈوں پر بیٹھنا، بچوں کو پالنا، گھونسلہ بنانا، اڑنا وغیرہ اُن کے دماغوں میں کون ڈالتا ہے؟ انسانی آنکھ ہی کو لیں ایک مکمل کیمرہ سے کہیں زیادہ پیچیدہ یونٹ ہے جو ارتقاء کے نتیجہ میں وجود میں آ ہی نہیں سکتا کہ گویا پہلے ایک حصہ بنا ہو جب نظر نہ آیا تو خود بخود دوسرا حصہ بن جائے پھر بھی نظر نہ آئے تو تیسرا حصہ بن جائے اس طرح بغیر غلطی کے ایک خاص طرف چلتے چلاتے آنکھ وجود میں آ گئی ہو۔ یہی حال دل، دماغ، گردوں، پھیپھڑوں وغیرہ کا ہے۔ کیا یہ لاکھوں اتفاقات تھے جو کائنات میں ہر طرف بکھرے نظر آتے ہیں یا ایک پُر حکمت تخلیق ہے؟

2۔کیا خدا جسم اختیار کرسکتا ہے؟

خدا کی ذات بھی زمان و مکان کی پابندیوں سے پاک ہے اوراس کی صفات بھی ۔اس کے بالمقابل انسان کا جسم تین جہات (لمبائی، چوڑائی ،موٹائی) میں پابند اور محدود ہے۔ پروفیسر صاحب کس حساب سے ایک غیر محدود ہستی کو ایک محدود وجود میں کامل طور پر سمٹنے کا تصور کر سکتے ہیں ۔ خدا کے برابر یا ہمسر کوئی ہو ہی نہیں سکتا اس لئے اگر سارے سمندر کا پانی پورے کا پورا ایک پیالہ میں نہیں آسکتا تو ایک غیر محدود ہستی ایک پابندِ زمان و مکان وجود کے اندر کیسے سما سکتی ہے۔جبکہ آپ کا عقیدہ ہے کہ یسوع مسیح کامل خدا بھی تھا اور کامل انسان بھی تھا۔ یہ تضاد ہے۔کیونکہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ بیک وقت کوئی وجود غیر محدود بھی ہو اور محدود بھی ہو۔اگر وہ غیر محدود ہے تو محدود نہیں اوراگر وہ محدود ہے تو غیر محدود نہیں ۔اللہ اپنی صفات کے لحاظ سے بھی غیر محدود ہے۔مثلاً وہ قیوم ہے اور قیوم ہونے کے لئے ہر وقت ہر جگہ موجود ہونا ضروری ہے ورنہ وہ چیزوں کو قائم کیسے رکھ سکتا ہے۔عیسیٰ علیہ السلام جو محدود طاقتوں والے انسان تھے جب وہ چلتے پھرتے نظر آتے تھے انہوں نے کب زمین کو اٹھا کر اپنے مدار پر قائم رکھا ہوا تھا یا آسمان کو تھاما ہوا تھا۔وہ تو خود نو ماہ ماں کے پیٹ کے اندر مقیّد رہے۔ اگروہ بیک وقت کامل خدا اور کامل انسان تھے تو ان کا علم کیوں ناقص تھا۔دشمنوں سے بچنے کی قدرت کیوں نہ تھی؟ کیا وہ بحیثیت انسان اپنی ہی دوسری حیثیت خدا سے دعائیں کیا کرتے تھے۔

خدا انسانی جسم کیسے اختیار کرسکتا ہے۔انسانی جسم کے ہر سَیل (Cell) میں ۴۶ کروموسوم ہوتے ہیں جن میں سے نصف والد کی طرف سے اور نصف والدہ کی طرف سے آتے ہیں ۔خدا کی نہ تو ماں ہے، نہ باپ، نہ بیوی۔ کیونکہ بیوی کے لئے ہم جنس ہونا ضروری ہوتا ہے ۔خدا مادی کروموسومز سے بھی پاک ہے تو انسانی شکل میں اس کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے۔خدا خالق ہے تو بندہ مخلوق۔تو یسوع مسیح ایک ہی وقت میں غیر محدود طاقتوں والے کامل خدا اور محدود و ناقص طاقتوں والے کامل انسان کیسے ہوسکتے ہیں۔اس لئے خدا کے مجسم ہونے کا مفروضہ ہی غلط ہے۔

۳۔مُردوں میں سے جی اٹھنا:

یہ جہان اگر مادی ہے تو دوسرا جہان غیر مادی اور روحانی ہے۔لہذا مادی جسم کے ساتھ کوئی اُس

جہان میں نہیں جا سکتا۔جسم کا مادی چولہ مادی جہان ہی میں اتار پھینک کر وہاں جانا پڑتا ہے۔اگر عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ جی اٹھے تھے تو وہ چھپتے چھپاتے بھیس بدل کر کیوں پھرتے رہے؟ جسم پر زخموں کے نشانات کیوں تھے؟ کیا نیک آدمی مرنے کے بعد اپنی بیماریوں کے نشان اور داغ لے کر اگلے جہان جایا کرتے ہیں؟۔کیا روحانی انسان مادی کھانا جیسے روٹی اور مچھلی بھی کھایا کرتے ہیں؟۔پتہ نہیں اس طرف عیسائی بھائیوں کا خیال کیوں نہیں جاتا کہ عیسیٰ ؑ صلیب پر چڑھائے ضرور گئے تھے، زخمی بھی ہوئے تھے لیکن صلیب پر مرنے کی موت سے بچائے گئے تھے کیونکہ وہ سچے نبی تھے۔مفتری نہ تھے۔

پس پروفیسر سَوِنْبرن صاحب نے اپنے عقائد کے مطابق جو مفروضے کمپیوٹر میں ڈالے تھے ان کو ویسا ہی جواب مل گیا۔حسابی سوالات میں تو یہی کچھ ہوتا ہے کہ اگر یہ بات درست ہے تو فلاں بات بھی درست ہو گی ۔سائنس کی بنیاد تو حواس خمسہ کے مشاہدات (Observation) اور مادی تجربات پر ہوتی ہے ۔روحانی معاملات اُن کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں ۔روحانی مشاہدات و واردات میں ان پر بھروسہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے آنکھوں کا کام ناک سے اور زبان کا کام کان سے لینے کی کوشش کی جائے۔

حضرت مریم کے روحانی مقام کی بابت کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے اختلافات

ایک خبر کے مطابق بہت سال پہلے ایک بین الاقوامی کمیشن مقرر کیا گیا تھا جس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی غرض سے ان کے اختلافی عقائد کا جائزہ لے کر کوئی ایسی درمیانی راہ نکالیں جو دونوں فرقوں کو قابل قبول ہو اور کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ یہ دونوں فرقے مشترکہ طور پر عبادت (Communion) بجا لاسکیں۔ اس کمیٹی میں دس ممالک کے ۱۸ بشپ، پادری اور غیر پادری مذہبی رہنما شامل تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ باوجودیکہ کمیٹی ان فرقوں کے مرکزی رہنماؤں نے ہی بنائی تھی یہ بات طے کرلی گئی تھی کہ کمیٹی کا فیصلہ کسی پر Binding نہیں ہوگا۔ کمیٹی کی رپورٹ کا بہت لوگوں کو بشدّت انتظار تھا۔ اس کا اعلان ۱۷ مئی ۲۰۰۵ء کو امریکہ کے شہر سیاٹل (Seatle) میں کیا گیا۔

کمیٹی نے جس اختلافی مسئلہ کو سب سے پہلے لیا ہے وہ حضرت مریم کے روحانی مقام و مرتبہ سے تعلق رکھتا ہے۔ پروٹسٹنٹ کہتے ہیں کہ حضرت مریم ایک کمزور انسان تھیں۔ ہاں وہ ایک نیک خاتون تھیں اور حواری تھیں لیکن کیتھولک ان کے مقام اور روحانی طاقت کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور ان کو وہ عزت دیتے ہیں جو صرف یسوع کا حق ہے۔

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں تسلیم کرلیا ہے کہ کیتھولکس کے یہ عقائد مذہبی کتب کی تعلیمات کے مطابق سمجھے جاسکتے ہیں کہ حضرت مریم پیدائشی گناہ سے مُبرّا تھیں۔ وہ معصوم پیدا ہوئیں۔ وہ

حضرت یسوع کی اوّلین پیرو(حواریہ)تھیں وہ مُتجسّم خدا(God Incarnate) کی والدہ تھیں۔ ان کا نجات (Salvation) کی تاریخ میں ایک مخصوص مقام تھا۔وہ تمام عیسائیوں کے لئے تقدس، ایمان اوراطاعت کا نمونہ تھیں اور چرچ میں ان کا مقام رسول(Prophetic Figure) کا تھا۔ ہم ان سے درخواست کر سکتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے دعا کریں لیکن وہ خود اپنے طور پر گناہوں کی سزا سے نجات نہیں دلاسکتیں ۔ان سے بھی دوسرے سینٹس (Saints) کی طرح درخواست کی جاسکتی ہے کہ وہ ہماری شفاعت کریں لیکن ان سے دعا نہیں مانگی جاسکتی ۔دعا اور عبادت کا حق صرف یسوع ،باپ اورروح القدس کو ہے۔وہ بھی یسوع کی طرح روح اور جسم سمیت آسمان پر چڑھ گئی تھیں۔

کمیشن نے البتہ حضرت مریم کے لوگوں پر ظاہر ہونے کے معجزات کوتسلیم نہیں کیا کہ وہ گویا نجی طور پرلوگوں کے سامنے آتی ہیں یا ان مجسموں سے خون یا آنسو ٹپکتے ہیں ۔اگر چہ پروٹسٹنٹ ان باتوں کونہیں مانتے مگر کیتھولکس اس طرح کے بہت سے واقعات بیان کرتے ہیں۔مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ۱۹۷۳ء میں جاپان کی ایک خانقاہ(Convent) میں نصب کردہ مریم کے ایک لکڑی کے مجسمہ کے دائیں ہاتھ سے لہو ٹپکا۔۱۹۷۵ء میں اس مجسمہ نے آنسو ٹپکائے اورسو بار مزید بھی ایسا ہونا بیان کیا گیا۔اسی طرح یہ رپورٹ کیا گیا کہ ۱۹۳۲ء،۱۹۳۳ء میں بلجیم کے ایک کنونٹ سکول کے کھیل کے میدان میں پانچ بچوں نے حضرت مریم کو ۳۳ بار دیکھا۔

اس سے پہلے ۱۹۱۷ء میں پرتگال کے ایک فاطمہ نامی گاؤں میں حضرت مریمتین بچوں پر ظاہر ہوئیں اوران کوایک پوپ کے قتل کئے جانے کے متعلق وقوعہ سے پہلے بتایا۔ کہتے ہیں ۱۸۵۸ء میں فرانس کے ایک قصبہ بورڈز کے ایک شخص پرحضرت مریم اٹھارہ بار ظاہر ہوئیں اور یہ بات اتنی پھیلی کہ یہ گاؤں زیارتگاہ بن گیا۔ پروٹسٹنٹ تو ان باتوں کونہیں مانتے ۔کہا جاتا ہے کہ پوپ جان پال دوم حضرت مریم کی تعظیم وعبادت کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔

آخر میں کمیشن نے اعتراف کیا ہے کہ ہمارا معاہدہ سارے اختلافات کوحل نہیں کرتا جن میں خصوصی طور پر وہ سوالات شامل ہیں جن کا تعلق اس بات سے ہے کہ پوپ جن عقیدوں (Dogmas) کواپنی سند سے جاری کرتے ہیں انجیل کی تعلیمات کی روشنی میں ان کو کیا مقام اور طاقت حاصل ہے۔(ماخوذ از سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۱۷مئی ۲۰۰۵ء)

یہ معاہدہ جس کا عنوان Mary -Grace and Hope in Christ رکھا گیا ہے کٹّر پروٹسٹنٹوں کو پسند نہیں آیا۔انہوں نے اس کے خلاف آوازیں اٹھانی شروع کر دی ہیں۔چنانچہ اس خبر کی اشاعت کے اگلے ہی روز ایک رپورٹ لِنڈ مورس نے لکھا کہ مریم کے مقام کی تعیین کے لئے جو سنگِ میل قسم کا معاہدہ ہوا ہے اس پر اینگلیکنز (Anglicans) کو اعتراض ہے۔ان کے قدامت پسند طبقہ نے متنبہ کیا ہے کہ اس معاہدہ سے دونوں فریقوں کے اتحاد کو سخت دھکہ لگا ہے۔اسکی وجہ یہ ہے کہ کمیشن مریم کو ایک عاجز اور بے بس انسان (A Broken Human Being) کے روپ میں پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔سڈنی کے ایک حلقہ کے صاحب اثر بشپ ڈاکٹر رابرٹ ڈائل نے اس دستاویز کو ایک آفت (Disaster) قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اُس وقت تک مشترکہ عبادت ادا کرنے کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا جب تک کہ پہلے پوپ کے عقائد مذہبی کتابوں کے مطابق نہیں ہوتے۔

(ماخوذ از سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۱۸رمئی ۲۰۰۵ء)

اس خبر میں جو پہلو ہمارے لئے خصوصی دلچسپی کے حامل ہیں ان پر خاکسار کچھ مختصراً عرض کرنا چاہتا ہے۔جو بات دل کو اچھی لگی ہے وہ اختلافی امور پر ایک دوسرے کو سننے کا حوصلہ اوران کو حل کرنے کی کوشش ہے۔یہ کمیشن عیسائیوں کے دو بڑے فرقوں کے سربراہوں کی طرف سے بین الاقوامی سطح پر قائم کیا گیا تھا اس کے باوجود اس کی سفارشات کو تسلیم کرنا کسی فریق کے لئے ضروری (Binding) نہ تھا۔یہ بات بھی معقول تھی کیونکہ عقائد کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو خدا اور بندے کے درمیان ہوتا ہے اس لئے کوئی کمیشن، عدالت، اسمبلی یا ادارہ کسی عقیدہ کو درست قرار دے کر اُسے جبراً نافذ نہیں کرسکتی۔

ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ کمیشن کی بعض سفارشات ہمیں بھی انجیل کی تعلیمات کے متضاد دکھائی دیتی ہیں۔مثلاً لکھا ہے کہ دعا اور عبادت صرف باپ، بیٹے اور روح القدس کا ہی حق ہے کسی اور کا نہیں۔حتیٰ کہ ''خدا کے بیٹے کی ماں'' کا بھی نہیں۔اس کے بالمقابل کہیں یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ یسوع مسیح نے کہا ہو کہ تم مجھ سے مانگو یا میری عبادت کرو بلکہ وہ تو خود بھی خدا سے رو رو کر دعائیں کرتے رہے اور اپنے حواریوں کو بھی دعائیں مانگنے کے لئے کہتے رہے۔(دیکھو متی باب ۲۶ آیت

۳۹۔۴۱) آپ نے انہیں وضاحت سے تلقین کی تھی کہ تم خدا کی عبادت کرو گے۔صرف خدا کی۔ (متی باب۴: ۱۰) کیونکہ خدا ایک ہی ہے اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں۔(مرقس باب۱۲: ۳۲)

دوسری بات رپورٹ میں حضرت مریم کے بارہ میں یہ کہی گئی ہے کہ وہ مجسم خدا کی والدہ تھیں جبکہ انجیل میں تو یہ لکھا ہے کہ وہ روح القدس (Holy Ghost) سے حاملہ ہوئی تھیں۔(متی باب ۱ آیت ۲۰) اور شادی سے پہلے وہ جس بچے سے حاملہ تھیں وہ روح القدس کا تھا۔(متی باب ۱ آیت ۱۸)

حضرت مریم کے بارہ میں ایک بات رپورٹ میں یہ کہی گئی ہے کہ وہ جیزس (Jesus) پر سب سے پہلے ایمان لائی تھیں۔ہوسکتا ہے یہ بات درست ہو لیکن انجیل میں سب سے پہلے دو ایمان لانے والوں کے نام لکھے ہیں وہ انڈریو اور اس کا بھائی سائمن تھا (یوحنا باب ۱ آیت ۳۵۔۴۱) اور انہوں نے کہا تھا کہ ہم نے مسیح کو پالیا ہے۔(نہ کہ خدا کے بیٹے کو)

پھر حضرت مریم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حواری قرار دیا گیا ہے جبکہ متی باب ۱: ۱۰ میں جن بارہ حواریوں کے نام لکھے ہیں ان میں حضرت مریم کا نام درج نہیں۔

انجیل کے مقابلہ میں قرآن کریم میں حضرت مریم کا ذکر بہت زیادہ عزّت و اکرام سے آیا ہے۔ان کو پڑھ کر دل اُن کی محبت سے بھر جاتا ہے اور ان کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے۔ فرمایا:

> ”جب عمران کی ایک عورت نے کہا اے میرے رب! جو کچھ بھی میرے پیٹ میں ہے یقیناً وہ میں نے تیری نذر کر دیا (دنیا کے جھمیلوں سے) آزاد کرتے ہوئے۔پس تو مجھ سے قبول کر لے۔یقیناً تو ہی بہت سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔پس جب اُس نے اُسے جنم دیا تو اس نے کہا اے میرے رب! میں نے تو بچی کو جنم دیا ہے۔جبکہ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اُس نے کس چیز کو جنم دیا تھا۔اور نر، مادہ کی طرح نہیں ہوتا اور (اس عمران کی عورت نے کہا) یقیناً مَیں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور مَیں اُسے اور اس کی نسل کو راندۂ درگاہ شیطان سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔پس اس کے رب نے اُسے

ایک حسین قبولیت کے ساتھ قبول کیا اور اس کی احسن رنگ میں نشو ونما کی اور زکریا کو اس کا کفیل ٹھہرایا۔ جب کبھی بھی زکریا اس کے پاس محراب میں داخل ہوا تو اُس نے اس کے پاس کوئی رزق پایا۔ اس نے کہا اے مریم! تیرے پاس یہ کہاں سے آتا ہے؟ اس نے (جواباً) کہا یہ اللہ کی طرف سے ہے یقیناً اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔'' (آل عمران آیت ۳۷۔۳۸)

''اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم یقیناً اللہ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک کر دیا ہے اور تجھے سب جہانوں کی عورتوں پر فضیلت بخشی ہے۔ اے مریم اپنے رب کی فرمانبردار ہو جا اور سجدہ کر اور سجدہ کرنے والوں کے ہمراہ جھک جا۔'' (آل عمران: ۴۳، ۴۴)

''اور وہ خاتون (مریم) جس نے اپنی عصمت کو اچھی طرح بچائے رکھا تو ہم نے اس میں اپنے امر میں سے کچھ پھونکا اور اُسے اور اس کے بیٹے کو ہم نے تمام جہانوں کے لئے ایک نشان بنا دیا۔'' (الانبیاء: ۹۲)

کیا ساری انجیل میں کوئی اس طرح کے تعریفی الفاظ حضرت مریم کے بارہ میں پیش کرسکتا ہے؟

ٹورین والا کفن سات صدیاں پرانا نہیں بلکہ بائبل کے زمانے کا ہے

۱۹۸۸ء میں کفن ٹورین پر تحقیق کرنے کے لئے سائنسدانوں کی ایک ٹیم بنائی گئی تھی جن کا کام اس کپڑے کی عمر معلوم کرنا تھا۔ اس غرض کے لئے چادر کے کچھ ٹکڑے کاٹ کر دیئے گئے تھے۔ اس وقت انہوں نے اعلان کیا تھا کہ کپڑا ۱۲۶۱ تا ۱۳۹۰ عیسوی کے عرصہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ابتدائی تحقیقاتی ٹیم کے ایک رکن مسٹر ریمنڈ روجرز بھی تھے۔ کئی سال کے غور و فکر کے بعد اب انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ کمیٹی کا عمر کا اندازہ غلط (Invalid) تھا۔ اصل کفن کی حفاظت یا مرمت کے لئے اسکی پشت پر کہیں بعد میں ایک اور چادر سی دی گئی تھی۔ مسٹر روجرز کہتے ہیں کہ چونکہ یہ ٹیسٹ اس حفاظتی چادر کے ٹکڑوں پر کئے گئے تھے اس لئے درست نہ تھے۔ وہ کہتے ہیں میں خود ۱۹۸۸ء کے مہیا کردہ نمونوں اور اصل چادر کے ۳۲ ٹکڑوں پر کیمیائی ٹیسٹ کر چکا ہوں وہ دونوں ایک دوسرے سے کئی لحاظ سے مختلف تھے اس لئے ان کی عمریں بھی مختلف تھیں۔ نیز اصل چادر کے حصوں پر ایک کیمیکل کمپاؤنڈ (Vanilin) موجود نہ تھا۔ اگر چادر سات سو سال پرانی ہوتی تو اس کے نشانات (Traces) ان پر ضرور موجود ہوتے، وہ اتنے کم عرصہ میں ضائع نہیں ہو سکتے۔ کپاس وغیرہ کے ریشوں میں ایک کیمیائی مادہ Lignin ہوتا ہے جو حرارت کے زیر اثر وقت کے ساتھ ساتھ Vanillin میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اور بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔

جو خبر یا رپورٹ اس سلسلہ میں سڈنی مارننگ ہیرلڈ کے ۲۹۔۳۰ جنوری ۲۰۰۵ء کے شمارہ

میں بحوالہ ''دی ٹیلیگراف لنڈن'' شائع ہوئی ہے وہ روم سے Bruce Johnston نے بھیجی ہے اوراس کا عنوان ہے Faithful Heartened By Turin Shraud Tesls. رپورٹر نے Veiled in mystery (پرسرار پردوں میں) کے عنوان سے کفنِ ٹورین کی جو مختصر تاریخ بیان کی ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''۱۳۵۵ء میں یہ چادر لائرے فرانس کے مقام پر سب سے پہلے منظر عام پر آئی جسے میّنہ طور پر ایک فرانسیسی سردار نے قسطنطیہ سے حاصل کیا تھا۔ ۱۵۳۴ء میں جب یہ Sainte Chapelle Chambery کے مقام پر تھی تو اسے آگ سے نقصان پہنچا۔ وہاں کی راہبات (Nuns) نے کفن کی پشت پر ایک اور کپڑا سی کر اس کی مرمت کی۔ ۱۵۷۸ء میں یہ چادر ٹورین پہنچی۔ ۱۹۶۷ء میں اس کا پہلی بار سائنسی معائنہ کیا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں اس کے بارہ میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ زمانہ وسطیٰ میں کسی پینٹر نے Iron Oxide سے پینٹ کر کے اسے بنایا تھا۔ ۱۹۸۸ء میں ریڈیو کاربن ٹیسٹوں کے بعد یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ یہ زمانہ وسطیٰ کی ایک جعلسازی (Fake) ہے ۲۰۰۲ء میں اس کی مرمت (Restoration) کے دوران چادر کی دوسری طرف سے بھی ایک انسانی چہرہ کا عکس نظر آیا۔ ۲۰۰۴ء میں اس پر مزید غور فکر ہوا تو پتہ چلا کہ کفن ٹورین تین ہزار سال پرانا ہوسکتا ہے۔''

چوکھٹے میں مذکور کفن ٹورین کی مختصر تاریخ کے بعد رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ''کفنِ ٹورین (Shroud of Turin) کی عمر کا اندازہ جو کاربن ڈیٹنگ (Carbon Dating) کے ذریعہ اب سے پہلے لگایا گیا تھا اُس کی اصل عمر اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک نئی تحقیق سے اندازہ ہوا ہے کہ جیسا کہ معتقدین یقین کرتے ہیں یہ کفن بائبل کے زمانہ کا ہوسکتا ہے۔ اس تحقیق کے بعد ازسرنو یہ امید پیدا ہوگئی کہ یہ کپڑا زمانہ وسطیٰ کی کوئی جعلسازی کی کاروائی نہیں ہے بلکہ یہ تو واقعہ ء صلیب کے بعد یسوع کے چہرہ کا عکس ہے جو معجزانہ طور پر اس پر محفوظ رہ گیا ہے۔

یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کی لاس الاموس لیبارٹری (Los Alamas Laboratory)

سے منسلک مسٹر ریمنڈ روجز (Raymond Rogers) کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ۱۹۸۸ء کے تجربات کے نتائج غلط (Invalid) تھے۔ان کا استدلال ہے کہ جس سُوتی کپڑے پر ٹیسٹ کئے گئے تھے وہ اصل کفن کی بجائے اس کے مرمت شدہ حصہ سے حاصل کیا گیا تھا۔ان کے اپنے ٹیسٹ جو زیادہ تر کپڑے کے کیمیائی تجزیہ پر مبنی تھے بقول ان کے اصل کپڑے سے حاصل کردہ حصوں پر تھے اوران کی عمر (بجائے سات سوسال کے)۱۳۰۰ء تا ۳۰۰۰ء سال منکشف ہوئی تھی۔ بہت سے کیتھولک یقین رکھتے ہیں کہ کپڑے پر جو عکس ہے وہ یسوع کا ہے اوراس وقت کا جب انہیں صلیب سے اتارنے کے بعداس میں لپیٹا گیا تھا۔

وہ محققین جنہوں نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں الگ الگ طور پر اریزونا، کیمبرج اور زیورچ میں اس پر تجربات کئے تھے وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ کپڑے کی عمر ۱۶۲۱ء تا ۱۳۹۰ء کے درمیانی عرصہ کی ہے۔اس لئے ہوسکتا ہے کہ یہ زمانہ ٔوسطی کا کوئی فریب ہو۔چنانچہ اس وقت کے ٹورین کے کارڈینل Anatasio Alberto کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کردیا گیا تھا کہ کپڑا ایک عملی مذاق (HOAX) لگتا ہے۔

لیکن مسٹر روجرز رسالہ Thermochinica Acta میں لکھتے ہیں کہ اصل کپڑے پر کیمیائی مادہ Vanillin کی موجودگی کے کوئی آثار نہ تھے جو حرارت کے زیراثر Lignin کے ٹوٹنے پھوٹنے سے بنتی ہے جو روئی وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔اس مادہ Lignin کی مقدار وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ گرتی جاتی ہے۔ اگر کفن زمانہ ٔوسطی میں بنایا گیا ہوتا تو اس پر ابھی بھی Vanillin موجود ہوتا۔

مسٹر روجرز جو خود ابتدائی تحقیقاتی ٹیم (Shroud of Turin Research Project) کے ایک ممبر تھے انہوں نے ریڈیو کاربن ڈیٹنگ کے نتائج پر اپنی حیرانگی کا اظہار اس کے دس سال بعد کیا ہے۔انہوں نے مبینہ حقائق (Data) پر از سرِ نو غور کیا ہے اوراس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عمر نکالنے کے لئے ۱۹۸۸ء میں مہیا کئے گئے نمونے اوران دوسرے ۳۲ نمونوں میں جو انہوں نے ساری چادر کے مختلف حصوں سے لئے وہ یکساں نہ تھے۔حرارت کی وجہ سے جو کیمیائی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں ان کی سائنس یعنی Chemical Kinetics پھر کیمیائی تجزیہ اور دوسرے تجربات سے یہ

بات بپایہ ثبوت پہنچ گئی ہے کہ ریڈیو کاربن ٹیسٹ جس نمونہ پر کئے گئے تھے وہ اصل کپڑے کا حصہ نہ تھا اوراس لئے کپڑے کی عمر معلوم کرنے کے لئے اسکا استعمال جائزیا قانونی نہ تھا۔ان کے الفاظ ہیں:

"Chemical kinetics,analytical chemistry and other tests proved the,, radio carbon sample was not part of the original cloth,,and so was,, Invalid in detetmining the age of the shroud."

(the Telegraph London-Reproduced by Sydney Morning Herald dated 29.30January 2005)

اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی مسلسل کوشش کی جارہی ہے کہ یہ چادر وہی ہے جس میں واقعہ، صلیب کے بعد مرہم لگا کر عیسیٰ علیہ السلام کو لپیٹا گیا تھا۔خون بہنے کے نشانات واضح کرتے ہیں کہ ایک زندہ انسان کو اس میں لپیٹا گیا ہے۔اگر یہ ثابت ہوجائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر مرنے سے بچ گئے تھے تو صلیبی مذہب کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔لیکن یہ مقدر ہے کہ اس زمانہ میں ایسے ثبوت مہیا ہوں تو آنحضرت ﷺ کی یہ پیشگوئی پوری ہو کہ مسیح موعودؑ کے ہاتھوں اس کے زمانہ میں کسر صلیب ہوگا۔چنانچہ مکتوب اسکندریہ،صحائف قمران اور کفن مسیح پر یہ جدید تحقیق،قبر مسیح کا انکشاف، تاریخی ،مذہبی اور طب کی کتب جو اس زمانہ میں دریافت ہورہی ہیں اسی پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے خدائی تقدیر کا حصہ ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس مضمون کو اپنی کتاب ’’مسیح ہندوستان میں‘‘ میں یوں بیان فرمایا ہے:

’’پس اس جگہ ہم بجز اسکے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خدا کا ارادہ تھا کہ وہ چمکتا ہوا حربہ اور وہ حقیقت نما برہان کہ جو صلیبی اعتقاد کا خاتمہ کرسکے اس کی نسبت ابتدا سے یہی مقدر تھا کہ مسیح موعود کے ذریعہ سے دنیا میں ظاہر ہو۔کیونکہ خدا کے پاک نبیؐ نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ صلیبی مذہب نہ گھٹے گا اور نہ اس کی ترقی

میں فتور آئے گا جب تک مسیح موعود دنیا میں ظاہر نہ ہو اور وہی ہے جس کے ہاتھ پر کسر صلیب ہوگی۔

اس پیشگوئی میں یہی اشارہ تھا کہ مسیح موعود کے وقت میں خدا کے ارادہ سے ایسے اسباب پیدا ہو جائیں گے جن کے ذریعہ سے صلیبی واقعہ کی اصل حقیقت کھل جائے گی۔ تب انجام ہوگا اور اس عقیدہ کی عمر پوری ہو جائے گی۔ لیکن نہ کبھی جنگ اور لڑائی سے بلکہ محض آسمانی اسباب سے جو علمی اور استدلالی رنگ میں دنیا میں ظاہر ہوں گے۔ پس ضرور تھا کہ آسمان ان امور اور شہادتوں اور ان قطعی اور یقینی ثبوتوں کو ظاہر نہ کرتا جب تک کہ مسیح موعود دنیا میں نہ آتا اور ایسا ہی ہوا۔ اور اب سے جو وہ موعود ظاہر ہوا ہر ایک کی آنکھ کھلے گی اور غور کرنے والے غور کریں گے کیونکہ خدا کا مسیح آ گیا۔ اب ضرور ہے کہ دماغوں میں روشنی اور دلوں میں توجہ اور قلموں میں زور اور کمروں میں ہمت پیدا ہو اور اب ہر ایک سعید کو فہم عطا کیا جائے گا اور ہر ایک رشید کو عقل دی جائے گی کیونکہ جو چیز آسمان میں چمکتی ہے وہ ضرور زمین کو بھی منور کرتی ہے۔“

(مسیح ہندوستان میں روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۶۴)

(الفضل انٹرنیشنل 25.3.05)

پوپ جان پال دوم کا انتقال اور انتخاب جانشین

دنیا کے ایک ارب کیتھولک عیسائیوں کے مذہبی رہنما جان پال دوم ۔۱۳ اپریل ۲۰۰۵ء کو ۸۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے ۔ وہ ۱۹۲۰ء میں پولینڈ میں پیدا ہوئے ۔ ان کا اصل نام Karol Wojtyla تھا۔ وہ ۱۹۷۸ء میں پوپ جان پال اول کی وفات پر منتخب ہوئے ۔ان کے پیشرو صرف ۳۳ دن پوپ رہنے کے بعد وفات پا گئے تھے اس لئے انہیں کا نام انہیں دے دیا گیا۔

پوپ کی وفات کے بعد اخباروں میں ان کے بارہ میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ کچھ حق میں اور کچھ خلاف ۔ ان کے مدّاح کہتے ہیں کہ ان کی خاص توجہ اور کوشش سے افریقہ اور ایشیا میں عیسائیت کی تبلیغ مستحکم ہوئی ۔ یورپ سے کمیونزم کے خاتمہ کے لئے انہوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو باہم قریب کیا۔ دو ہزار سال تک عیسائی جو یہودیوں پر ظلم کرتے رہے ہیں اس پر افسوس کا اظہار کیا اور ان کو بتایا کہ Jesus کو صلیب پر چڑھانے کے اصل مجرم یہودی نہیں بلکہ رومی تھے ۔ یورپی یونین کے وہ حامی تھے ۔کیتھولکس اور پروٹسٹنٹس کو ایک دوسرے کے خلاف تشدد کے اظہار سے روکتے رہے اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک ڈائیلاگ شروع کرنے پر زور دیتے رہے۔ دوسری طرف کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ سخت قدامت پرست تھے۔ دور حاضر کے تقاضوں کو نہ سمجھتے تھے ۔سخت گیر تھے ۔بشپوں کے اختیار محدود کئے ہوئے تھے۔ سب اختیارات اپنے ہاتھ میں مرکوز کئے ہوئے تھے۔ دنیا کے ساتھ نہ چلتے تھے۔ Abortion (اسقاط حمل)، خاندانی منصوبہ بندی ،ہم جنس افراد کی باہم شادیاں ،ہم جنس پرست پادریوں اور عورتوں کو پریسٹ (Priest) بنانے کی مخالفت کرتے رہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ کسی بھی مذہبی رہنما کی کامیابی

کا پیمانہ اپنے پیروکاروں کی اخلاقی وروحانی حالت کو سدھارنے سے لگایا جاسکتا ہے۔ ساری مغربی دنیا اور خود اٹلی اور روم کے لوگوں کی اخلاقی حالت تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے اور چرچوں میں عبادت کرنے والوں کی تعداد مسلسل گر رہی ہے۔ اگر وہ واقعی عظیم پوپ تھے تو اس اہم معاملہ میں تو ان کا اثر کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کے پاس اگر کسی پادری کے خلاف ہم جنس پرستی کی شکایت پہنچتی تھی تو وہ کوئی کارروائی اس کے خلاف نہ کرتے تھے۔

پوپ اور پاپا کا ماخذ ایک ہی ہے۔ کیتھولک عیسائی پوپ کو فادر یا باپ بھی کہتے ہیں۔ پوپ کا سرکاری عہدہ Supreme Pontiff کہلاتا ہے۔ یہ لفظ لاطینی ہے جس کے معنے پُل کے ہیں۔ اس لئے انجیل کی صحیح تشریح بھی انہیں کا حق ہے۔ اس بات کو پروٹسنٹ اور دوسرے غیر کیتھولک تسلیم نہیں کرتے۔

پوپ جان پال دوم کی صحت کافی عرصہ سے خراب اور کمزور چلی آتی تھی۔ چرچ کے Canon Law کے مطابق پوپ کو اس کے عہدہ سے معزول نہیں کیا جاسکتا، نہ اس کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ البتہ خود پوپ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اگر کسی وقت اپنے آپ کو اس ذمہ داری کے ادا کرنے کے قابل نہ پائے تو از خود اپنے عہدہ سے دستبردار ہوسکتا ہے۔ کوئی ایسا ادارہ اس کے اوپر نگران نہیں جس کو وہ اپنا استعفیٰ پیش کرے۔ پس خود ایک تحریر لکھ کر دستبردار (Abdicate) ہوسکتا ہے۔

تاریخ عیسائیت میں اب تک چھ پوپ اپنے عہدہ سے دستبردار ہو چکے ہیں جن کے نام ہیں 235 عیسوی میں Pontian، 537 عیسوی میں Silverius، 1009 میں John XvII، 1045 عیسوی میں Benedict IX، 1294ء میں Celestine V اور 1415 عیسوی میں Gregory xII۔

دس سال پہلے جب پوپ جان پال بیمار پڑے تھے تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاید وہ دستبردار ہو جائیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر اس کی تردید کر دی کہ دیکھیں خدا کس طریق پر مجھے اس بوجھ سے فارغ کرتا ہے۔ اگر پوپ کی صحت ایسی گر جائے کہ وہ کام نہ کر سکے اور نہ وہ دستبردار ہو تو پھر اس کے معتمدین یعنی اس کی کیبنٹ، پرائیویٹ سیکرٹری وغیرہ اس کے نام پر فیصلے کرتے اور کام چلاتے

ہیں۔لیکن اگر صورت حال غیر یقینی ہو تو اہم فیصلے کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

جب ایک پوپ فوت ہو جاتا ہے تو اس کے جانشین کے انتخاب تک کے عرصہ کو Vecante Sede (یعنی Vacant See) کہا جاتا ہے۔اس عرصہ کے دوران وہ کارڈینل جو خرچ کے منتظم اعلیٰ یا میر حاجب اور خزانچی ہوتے ہیں اور Chamberlain کہلاتے ہیں وہ عارضی نگران کے طور پر کام چلاتے ہیں لیکن سوائے انتخابی کاموں کے اور کوئی اہم فیصلہ نہیں کر سکتے۔ جب کوئی پوپ فوت ہوتا ہے تو سب سے پہلے انہیں کو اطلاع دی جاتی ہے اور صرف وہی پوپ کی وفات کی تصدیق کر کے اس کا اعلان کرنے کے مجاز ہوتے ہیں۔

پوپ کا انتخاب ایک انتخابی ادارہ (Electoral College) کرتا ہے جو آج کل ۵۸ ممالک کے ۱۲۰ کارڈینلز (Cardinals) پر مشتمل ہوتا ہے۔ان میں سے تین ایسے ہیں جو ۸۰ سال سے اوپر کی عمر کے ہیں۔ وہ انتخاب سے پہلے مشورہ میں شامل ہو سکتے ہیں لیکن انتخاب میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس لئے عملاً یہ کالج ۱۱۷ افراد پر مشتمل ہے جو سوائے تین کے سبھی پوپ جان پال دوم کے مقرر کردہ ہیں۔

انتخابی ادارہ کی کوشش ہوتی ہے کہ پوپ کی مسند پر ایسا شخص بیٹھے جس کی صحت اچھی ہو۔جس میں روحانیت پائی جاتی ہو،اس کی عمر ۶۴ اور ۷۴ سال کے درمیان ہو تا کہ اس کی پاپائیت کا عرصہ نہ تو بہت مختصر ہو نہ بہت لمبا۔اگرچہ چرچ کے قانون کے مطابق امیدوار کے لئے صرف کیتھولک عقیدہ کا ہونا ضروری ہے اس کے لئے پریسٹ (Priest) یا کارڈینل ہونا ضروری نہیں۔لیکن ہوتے عموماً وہی ہیں جو کارڈینل وغیرہ ہوں۔ دینی مدرسہ کے فارغ التحصیل ہوں بالخصوص روم کے مرکزی مدرسہ سے۔

قانون کی رو سے تو اس کا تعلق دنیا کے کسی ملک سے ہو سکتا ہے لیکن بوجہ عیسائیت کا مرکز ہونے کے اٹلی والوں کا حق فائز سمجھا جاتا ہے۔ پوپ کے لئے ضروری ہے کہ اطالوی زبان اچھی طرح بول سکتا ہو۔مغربی پوپ کے کلچر سے پوری طرح شناسا ہو اور اس کی عمر اپنے مذہب کی خدمت میں گزری ہو۔

پوپ کا انتخاب خاصہ مشکل اور دقت طلب کام ہوتا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی سے College of Cardinal کے ذریعہ سے انتخاب کا طریق رائج ہوا۔شروع شروع میں تو انتخاب

کے موقعہ پر بہت اختلاف پیدا ہو جایا کرتے تھے جس کی وجہ سے تیرھویں اور چودھویں صدی میں ایک پوپ کی وفات پر دوسرے انتخاب تک لمبے لمبے وقفے پڑ جایا کرتے تھے۔ تنگ آ کر ایک طریق یہ نکالا گیا کہ کالج کے ممبران کو ایک کمرہ میں بند کر دیتے تھے جس کو Conclave کہا جاتا ہے۔ اس کمرہ کو باہر سے تالا لگا دیتے تھے اور اسی وقت کھولتے تھے جب ان کی اکثریت کسی ایک نام پر متفق ہو جاتی تھی۔ ممبران کے علاوہ کسی کو اس کمرہ میں جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ چونکہ ان کو روٹی پانی کسی طریق سے اندر پہنچا دیا جاتا تھا اس لئے پھر بھی کئی دن لگ جایا کرتے تھے۔ آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ روزے رکھیں گے اور ان کو کھانا بھی نہیں دیا جائے گا۔ بھوک سے تنگ آ کر وہ جلد انتخاب کر لیا کرتے تھے۔ یہ طریق ابھی بھی رائج ہے اگرچہ روٹی پانی اب مہیا کر دی جاتی ہے۔ اگر تین دن تک صبح وشام دو دو دفعہ بیلٹ کرنے کے بعد بھی فیصلہ نہ ہو سکے تو چوتھے روز دعا اور مشورہ کے لئے ناغہ کیا جاتا ہے۔ سولہویں صدی عیسوی سے یہ Conclave روم کے Sistine chapel میں منعقد ہوتا ہے۔ موجودہ قانون کے مطابق انتخابی ادارہ کے ارکان پوپ کی وفات کے پندرہ بیس دن بعد Conclave میں چلے جاتے ہیں۔ پوپ کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنے پیچھے آنے والے کے لئے انتخابی قانون میں تبدیلی کر سکے۔ آج کل پوپ کیلئے دو تہائی ووٹ درکار ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کئی دن بعد بھی اتنی تعداد کسی نام پر متفق نہ ہو سکے تو یہ ادارہ بھی معمولی اکثریت سے منتخب کر سکتا ہے۔ کارڈینلز کو نوٹس وغیرہ لینے کے لئے بہت تھوڑا کاغذ دیا جاتا ہے اور ہر ایک یا دو بیلٹ پیپر اور وہ نوٹس جلا کر ضائع کر دئے جاتے ہیں تا اس کارروائی کو خفیہ رکھا جا سکے۔

کمرہ انتخاب کے اندر ایک انگیٹھی ہوتی ہے۔ ہر دفعہ جب ووٹ ڈالے جاتے ہیں تو بعض خاص کیمیکلز ڈال کر دھوا ں باہر نکالا جاتا ہے تو بالکل سفید ہوتا ہے یا بالکل سیاہ۔ سیاہ دھوئیں کا مطلب ہوتا ہے کہ اس بار بھی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اور سفید دھوئیں کا مطلب ہوتا ہے کہ پوپ کے انتخاب پر اتفاق ہو گیا ہے۔ ہزاروں لوگ صبح وشام اس انگیٹھی سے نکلنے والے دھوئیں کا رنگ بے چینی سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ جب پوپ جان پال دوم کا انتخاب ہوا تھا تو وہ کیمیکل ایسا خراب تھا کہ دھوئیں کا رنگ نہ سفید ہوتا تھا نہ سیاہ بلکہ درمیان تھا۔ جس سے بہت گڑبڑ اور پریشانی ہوئی تھی۔ امید کی جا سکتی ہے کہ اس بار بجائے دھوا ں چھوڑنے کا کوئی اور طریق اختیار کیا جائے گا۔

(الفضل انٹرنیشنل 22.4.2005)

ہم جنس پرستوں کی ''شادیوں'' کو چرچ نے ''برکت'' دینی شروع کردی

ہم جنس پرستی (سدومت) کی بائبل میں سخت مذمت کی گئی ہے اور لوط علیہ السلام کی قوم پر اسی گناہ کی پاداش میں خدائی گرفت کا تذکرہ ملتا ہے۔ لیکن آج کل کے چرچ بجائے لوگوں کو بدکاری سے روکنے کے ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کی پالیسی پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔

آسٹریلیا کے یونائیٹنگ چرچ (Uniting Church) میں عورتیں بھی پادری کے طور پر کام کرتی ہیں۔ مرد پادریوں کو جنسی زیادتیوں کے خلاف تو احتجاج اور ہرجانوں کے مطالبوں کی خبریں آتی رہتی ہیں لیکن اب ایک عورت پادری کے اس انکشاف نے کہ وہ ہم جنس پرست (Lesbian) ہے۔ مذکورہ بالا چرچ میں تزلزل کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ وہ اس مشن کے نہایت ذمہ دار عہدہ پر فائز ہیں اور سارے آسٹریلیا کی نیشنل ڈائریکٹر ہیں۔ ان کا نام Rev Dorothy Mc Mahon ہے۔ ان کے اعلان سے سخت ہنگامہ برپا ہو گیا اور ایک حلقہ کی طرف سے اسے بائبل کے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی وجہ سے انہیں اپنے عہدہ سے علیحدہ کرنے کا مطالبہ ہوا۔ دوسری طرف چرچ سے متعلق ایک بڑے گروپ نے انہیں فارغ کرنیکی صورت میں چرچ سے علیحدگی کی دھمکی دے دی اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ سدومی اپنا علیحدہ چرچ قائم کرلیں گے۔ اس مسئلہ کا حل نکالنے کے لئے ایک میٹنگ بلائی گئی جو اگرچہ بڑی ہنگامہ خیز رہی لیکن دونوں گروپ کسی تصفیہ پر آمادہ نہ ہوسکے۔ لہذا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا کہ آیا ہم جنسوں کی باہم شادیاں (Same-sex Marriages) باضابطہ قرار دی جائیں

یا نہ۔ نیز یہ کہ جو افراد اعلانیہ طور پر ہم جنس پرست (Gay & Lesbians) ہوں ان کو چرچ پادری مقرر کرے یا نہ۔

ابھی یہ گومگو کی کیفیت جاری تھی کہ مذکورہ بالا پادری مسماۃ ریورنڈ ڈورتھی نے یہ اعلان کر کے ایک اور دھماکہ کر دیا کہ انہوں نے مردوں کی مردوں کے ساتھ اور عورتوں کی عورتوں کے ساتھ غیر حقیقی شادیوں (Pseudo-Marriages) کو ''برکت'' (Bless) دینے کا کام شروع کر دیا ہے۔ یعنی اگرچہ یہ تقریبات رسمی طور پر شادیاں تو نہیں کہلائیں گی لیکن ایک رنگ میں چرچ کی رضامندی کا اظہار ہوگا کہ جاؤ تم خوش رہو۔ (ماخوذ از سڈنی ہیرلڈ ۲۸ جولائی ۱۹۹۷ء)

اسی قسم کی ایک خبر ڈنمارک سے بھی آئی ہے۔ نیشنل چرچ آف ڈنمارک نے تقریباً دس سال قبل ایک اعلانیہ سودمی (Homosexual) کو باضابطہ طور پر اپنا پادری مقرر کیا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہاں کے سودومیوں (Gays and Lesbians) نے مطالبہ کیا کہ ان کی ''شادیوں'' کو چرچ تسلیم کرے۔ اس پر چرچ نے ایک کمیشن مقرر کیا جنہوں نے سو صفحات پر مشتمل رپورٹ مرکزی ادارہ Church's College of Bishops کو پیش کی۔ چنانچہ اب انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ لوتھرن چرچ (Luthern Church) تین سفارش کردہ طریقوں میں سے کوئی بھی طریقہ اختیار کر کے ایک ہی صنف (Same Sex) کے جوڑوں کی شادی کو Bless کر سکتے ہیں۔

(ماخوذ از سڈنی مارننگ ہیرلڈ ۲۳ مئی ۱۹۹۷ء)

خاکسار متجسس ہوا کہ یہ معلوم کرے کہ عیسائیت میں کسی کو Bless کرنے کا کیا مطلب و مفہوم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب میں نے ''پاکٹ بائبل ڈکشنری'' کی طرف رجوع کیا تو اس میں لفظ ''Bless'' کی مندرجہ ذیل تشریح پائی۔

Bless,Blessing:The bestowal of divine favor and benefits (Ge1.22.9:1-7,39:5) It includes recognition of God's goodness in a thankful and adoring manner.(Ps103:1:MA26:26:Ico11:24) And invoking God's favor upon another(Ge27:4-12,27-29.Ps129:8)

یعنی ’’Bless‘‘ کرنے کا مطلب ہے خدا کی نعمتوں اور فضلوں کی عطا۔ اس میں خدا کے احسانات پر اس کا شکریہ ادا کرنا اور اس کی عبادت کرنا شامل ہے۔ علاوہ ازیں اس کا مطلب کسی دوسرے کے لئے دعا کرنا ہے کہ خدا اس پر فضل فرمائے۔

(Pocket Bible Dictionary-published by Meridian and world Bible publisher, USA,P-49)

اگر پادری صاحبان ہم جنس شادیوں (Same-sex Marriages) کو مذکورہ بالا مفہوم میں Bless کرتے ہیں تو یہ خدا، مذہب اور بائبل کے ساتھ ایک نہایت گستاخانہ اور گھناؤنے مذاق سے کم نہیں۔ اس کو اپنے چہرے کی سیاہی کو خدا کے چہرہ پر ملنے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ گویا اس طرح کی شادیاں خدا کا نام لے کر اور اس کی اجازت سے کی جاتی ہیں۔ اور خدا کی ایسی نعمتوں اور فضلوں میں متصور ہوتی ہیں جن پر خدا کا شکر اور اس کی تسبیح و تحمید کی جاتی ہے۔ (نعوذ باللہ من ھذہ الخرافات)

اس طرح کی خبریں قصر عیسائیت کے اندرونی توڑ پھوڑ کی مظہر ہیں۔ لیکن ایسا ہونا مقدر تھا کیونکہ جب تک پرانی عمارت نہ گرائی جائے اس کی جگہ نئی تعمیر نہیں کی جاسکتی۔ قانون قدرت یہی ہے کہ جتنا زیادہ خلا پیدا ہوگا اتنے ہی زور سے وہ جگہ پر کرنے کے لئے باہر سے جھکڑ چلیں گے۔ یہ خلا کون پر کرے گا اس کے بارہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

’’.........چونکہ ضرور تھا کہ خدا ایک عالمگیر مذہب یعنی اسلام دنیا میں قائم کرے اس لئے عیسائیت کا بگڑنا اسلام کے ظہور کے لئے بطور ایک علامت کے تھا۔‘‘

(لیکچر سیالکوٹ روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۲۰۵)

(الفضل انٹرنیشنل 28.11.96)

پروفیسر پال ڈیویز(Paul Davies)

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اپنی معرکۃ الآراہ کتاب جو ''الہام، عقل، علم اور سچائی'' Revelation Rationality Knowledge &) (Truth کے علوم کا بحر بیکراں ہے، میں بے شمار ماہرین علوم کے حوالے درج فرمائے ہیں اُن میں آسٹریلیا کے مشہور سائنس دان پروفیسر پال ڈیویز بھی شامل ہیں۔

پروفیسر صاحب موصوف ۱۹۴۶ء میں لندن میں پیدا ہوئے اور ایڈیلیڈ آسٹریلیا میں پہلے Mathematical Physics اور اس کے بعد Natural Philosophy کے پروفیسر بنے۔ آپ ۲۰ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "The Edge of Infinity" اور "The Mind of God" بہت مشہور ہیں۔ سائنسی امور پر آپ دنیا کے بہترین لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کا خاص مضمون مذہب اور سائنس ہے۔ آپ کو ساڑھے چودہ لاکھ ڈالر کی مالیت کا انعام Templeton Prize for Progress in Religion مل چکا ہے۔

حضور ایدہ اللہ نے اپنی کتاب میں پروفیسر صاحب کی کتابوں سے دو بہت دلچسپ حوالے پیش فرمائے ہیں۔ پروفیسر صاحب کا کہنا ہے کہ سائنس پراسرار امور کی وجہ سے ہی ترقی کرتی ہے۔ جب ہم ایک بات کو حل کرتے ہیں تو دوسری ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اسی مضمون کو بہت عارفانہ طریق پر ان اشعار میں بیان فرمایا ہے:

کیا عجب تو نے ہر اک ذرہ میں رکھے ہیں خواص
کون پڑھ سکتا ہے سارا دفتر ان اسرار کا

ے تیری قدرت کا کوئی بھی انتہا پاتا نہیں
کس سے کھل سکتا ہے پیچ اس عقدۂ دشوار کا

حضورانور ایدہ اللہ نے پروفیسر پال ڈیویز کے جو دو حوالے اپنی کتاب میں درج فرمائے ہیں ان کا خلاصہ آسان الفاظ میں یہ ہے کہ آج سے کوئی ڈیڑھ صدی پہلے تک سائنس دانوں کو ایسے ہی قوانین قدرت سے واسطہ پڑتا تھا جو ہر وقت یکساں رہتے ہیں اور جیسے زمانہ حال میں لاگو ہیں ویسے ہی زمانہ ماضی میں بھی تھے اور مستقبل میں بھی رہیں گے۔ لیکن پھر حرارت اور توانائی کے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونے کے مسائل سامنے آئے تو پرانے تصورات یکسر بدل گئے۔ اس کا بنیادی اصول بہت سیدھا سادا ہے کہ گرمی صرف گرم جسم سے ٹھنڈے جسم کو منتقل ہوسکتی ہے۔ کم گرم جسم سے زیادہ گرم جسم کو منتقل نہیں ہوسکتی۔ یعنی گرمی کے انتقال کا رخ تیر کی طرح سیدھا ایک ہی سمت میں سفر کرتا ہے اور اس عمل کو الٹایا نہیں جاسکتا۔ اس اصول نے کائنات کے اوپر وقت کے تیر کا نشان ثبت کردیا ہے۔ یعنی یہ کائنات ہمیشہ سے ہی ایسے نہیں ہے جس طرح آج ہے بلکہ ایک خاص وقت سے کائنات کے گرم اجسام نے اپنے اردگرد گرمی بکھیرنی شروع کی تھی اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ تمام اجسام کا درجہ حرارت یکساں نہ ہو جائے۔ اور جب کائنات کی تمام اشیاء ایک ہی درجہ حرارت پر آجائیں گی۔ یعنی اس حالت پر پہنچ جائیں گی جس کو Thermo Dynamic Equilibrium کہا جاتا ہے تو کائنات میں مزید تغیر و تبدل کی گنجائش نہ رہے گی اور اس کی حرارتی موت (Heat Death) واقع ہو جائے گی۔

ساری کائنات سالموں یعنی Molecules سے بنی ہے جب اس کی حرارتی موت ہو جائے گی تو ان مالیکیولز میں انتہائی ابتری پیدا ہو جائے گی۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں گے اور ساتھ ہی یہ کائنات مرکرکسی اور حالت میں آجائے گی۔ اس حالت کو Entropy کہا جاتا ہے۔ چونکہ کائنات ابھی زندہ ہے، کائنات کا سفر ابھی رواں دواں ہے، سورج چاند ستارے محو گردش ہیں اس لئے اگرچہ Entropy کا عمل آج بھی جاری ہے، ابھی کامل نہیں ہوا۔ پس ثابت ہوا کہ ہماری کائنات نہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہی ہمیشہ رہے گی۔

پروفیسر صاحب نے وہی بات کہی ہے جو قرآن بار بار کہتا ہے کہ سورج چاند اور ستارے

ایک (اَجَلٍ مُّسمیً) یعنی مقررہ مدت کیلئے کام پر لگائے گئے ہیں۔ خدائے ذوالجلال والاکرام کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ازلی ابدی خالق ہی ہے جو وقت وخلا (Time &Space) کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس کے سوا ہر دوسری چیز مخلوق ہے اور وہ وقت ومکان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہندومت اور بدھ مت والے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مادہ وروح ہمیشہ سے اپنے آپ ہیں اور کائنات ہمیشہ سے ہی اس طرح ہے جس طرح آج، ان کو Entropy کے اصول پر غور کرنا چاہئے۔

(حضور انور ایدہ اللہ نے اپنی کتاب کے صفحات ۳۱۹ تا ۳۲۸ پر اس دلچسپ مضمون کو بیان فرمایا ہے) اس مضمون کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے اصل کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔

(الفضل انٹرنیشنل 28.2.2003)

دل بھی دماغ کی طرح باہر سے پیغام وصول کرنے، اس پر فیصلہ کرنے اور عمل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے

بین الاقوامی رسالہ ''فزیالوجی'' میں ملبورن یونیورسٹی آسٹریلیا کی تحقیق شائع ہوئی ہے جس میں پہلی بار یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دماغ کی طرح دل کا بھی اپنا علیحدہ شعوری نظام ہے۔ اگرچہ دل کے Sensory Cells دماغ کے Nerve Cells کے مقابلہ میں پانچ گنا چھوٹے ہیں اور ان کو معلوم کرنا خاصہ مشکل کام ہے۔ محققین نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے دل کے فعل کو سمجھنے کے لئے ایک نئی دریافت کی ہے جو یہ ہے کہ دل کے اپنے Nerve Cells مرکزی اعصابی نظام سے آزادانہ طور پر بھی کام کر سکتے ہیں۔ اس انقلابی دریافت کے نتیجہ میں ایسی دوائیں وجود میں آئیں گی جو دل کی حرکت کو منضبط کرنے کے لئے براہ راست دل کے اعصاب پر اثر کریں گی بجائے اسکے کہ وہ دماغ پر اثر کریں اور دماغ آگے دل کو احکام بھیجے جس طرح آجکل ہوتا ہے۔ پروفیسر ڈیوڈ ہرسٹ نے کہا ''ہمارے گروپ کی تحقیق نے پہلی بار یہ ثابت کیا ہے کہ دل کا علیحدہ نروس سسٹم ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ دل بھی سوچتا ہے اگر سوچنے کا مطلب یہ ہے کہ حواس کے ذریعہ علم حاصل کرنا Receiving Sensory Information پھر اس پر فیصلہ کرنا اور اس پر عمل کرنا تو پھر دل بھی یہ کام کرتا ہے۔ دل میں ایسے حسی خلیات (Sensory Cells) ہیں جو پیغام وصول کر سکتے ہیں اور اسے دل کے فعل میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔

(ہیرلڈ، ۲۷ نومبر ۱۹۹۸ء)

یہ تحقیق اس لئے اہم ہے کہ اس کے مطابق دل بھی دماغ کی طرح باہر سے براہ راست پیغام وصول کرسکتا ہے اگرچہ دماغ کے مقابلہ میں بہت کم لیکن باقی سائنسدانوں کا خیال ہے کہ شعور مکمل طور پر صرف دماغ میں ہوتا ہے اور کہیں نہیں۔

یہ تحقیق اس لحاظ سے بھی دلچسپ ہے کہ اس کے ذریعہ قرآن پر ایک اعتراض کا ایک اور جواب ملتا ہے معترض کہتا تھا کہ قرآن کہتا ہے

''اور یقیناً یہ (قرآن) رب العلمین خدا کی طرف سے اترا ہے اس کو لے کر ایک امانت دار کلام بردار فرشتہ (جبرائیلؑ) تیرے دل پر اترا ہے۔''

(الشعراء:۱۹۳۔۱۹۵)

یعنی قرآن دل پر اترا ہے جس میں شعور نہیں کیونکہ شعور کا مرکز صرف دماغ ہے۔اب اگر یہ تحقیق درست ثابت ہوتی ہے کہ دل میں بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے تو یہ اعتراض باطل ہو جاتا ہے۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ عربی میں قلب کے اصل معنے ہیں پھیرنے اور الٹانے پلٹانے والا اس لئے کہ وہ خون کو پھیرتا ہے یا خیالات کو پھیرتا ہے اور قلب کے معنے کسی چیز کا اصل اور لب یعنی خلاصہ اور روح (Essence) کے بھی ہیں جیسے حدیث میں ہے کہ ہر چیز کا ایک قلب ہے اور قرآن کا قلب ''یٰس'' ہے۔پس قلب سے مراد وہ روحانی قلب ہے جو جسمانی قلب کے بالمقابل واقع ہے انسان کے تمام ظاہری اعضاء وجوارح کے بالمقابل ویسے ہی باطنی اور روحانی اعضاء بھی واقع ہوئے ہیں۔ظاہری آنکھوں کی بصارت کے بالمقابل باطنی آنکھوں کی بصیرت ظاہری کانوں کے پیچھے باطنی سماعت اور ظاہری دل کے اندر روحانی دل اور یہی روحانی دل آنکھیں اور کان ہی آسمان روحانیت کی خبریں سننے کی اہلیت رکھتے ہیں اور یہی ہیں جو جب اس دنیا میں نور بصیرت سے محروم ہوتے ہیں تو دوسرے جہان میں بھی اندھے ہوں گے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ یہاں جسمانی آنکھیں مراد نہیں لیکن خدا کا نظام ایسا ہے کہ جسمانی وروحانی قلب ودیگر اعضاء علیحدہ علیحدہ اپنے طور پر کام نہیں کرسکتے اور اپنے مفوضہ فرائض کی انجام دہی کے لئے مل کر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں (جسے دوسرے لفظوں میں جسم وروح کا باہمی تعلق بھی کہا جاتا ہے) لہٰذا جب باطنی قلب الہام

وحی کا مہبط بنتا ہے تو ظاہری یا جسمانی قلب بھی اس کی کیفیات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ اپنے اوپر خدا کے کلام کو نازل ہوتا محسوس کرتا ہے۔

قرآن کریم باطنی قلوب وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''کیا وہ زمین میں چل کر نہیں دیکھتے تا کہ ان کو ایسے دل حاصل ہو جائیں (جوان باتوں کو) سمجھنے والے ہوں یا کان حاصل ہو جائیں (جوان باتوں کو) سننے والے ہوں۔ کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوتے ہیں۔''

(الحج: ۴۷)

اس آیت سے ظاہر ہے کہ جسمانی دل، آنکھ اور کان وغیرہ کے بالمقابل باطنی وروحانی دل آنکھ اور کان وغیرہ ہوتے ہیں اور جب وہ بیمار اور اندھے ہوتے ہیں تو خدا کی باتوں کے سننے، ان پر غور وفکر کرنے اور ان کا اثر قبول کرنے کی اہلیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب غور وفکر کے نتیجہ میں ان کی فطرتی استعدادیں حالت صحت کی طرف لوٹتی ہیں تو خدا کی باتوں سے فائدہ اُٹھانے لگتی ہیں۔ ورنہ کیا سینوں کے اندر کے گوشت پوست کے دل بھی کبھی کسی نے آنکھوں کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے دیکھے ہیں۔ ہاں قلب ظاہری کے اندر پوشیدہ روحانی دل یا دوسرے لفظوں میں روح انسانی ضرور بیمار بھی ہوتی ہے اور صحتمند بھی وہ تاریک بھی ہوتی ہے اور نورانی بھی پس وہ ایک قلب روحانی ہی تھا جو تمام بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ پاک ترین اور نوروں سے پر تھا جس پر قرآن نازل ہوا اور جس کا پرتو جسمانی قلب پر بھی پڑا (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

معترض کے سمجھنے کے لئے اتنی بات بھی کافی ہے کہ ہمیشہ سے دل کو اعتقادات اور خیالات کا مرکز سمجھا جاتا رہا ہے اور دماغ کو عقل وشعور کا۔ تمام دنیا کی زبانیں اس محاورہ کو استعمال کرتی رہی ہیں بلکہ آج بھی سب اہل زبان اپنی تحریرات میں دل ہی کو عشق ومحبت اور جذبات کا محل بیان کرتے ہیں اور اس کے بالمقابل روکنے ٹوکنے والی قوت کو دماغ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے دل ودماغ کی کشمکش بھی ہمیشہ موضوع سخن رہی ہے۔ چنانچہ یہی زبان کا محاورہ قرآن کریم نے استعمال کیا ہے اور وحی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر نازل کرنے کا ذکر فرمایا۔ لہٰذا اعتراض کی حیثیت محض سطحی ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 10.5.96)

کیتھولک چرچ میں تبدیلیوں کی خاطر پندرہ لاکھ جرمنوں کی تحریری یادداشت

پندرہ لاکھ جرمنوں نے کیتھولک چرچ میں اصلاح کی خاطر ایک تحریری عرض داشت پیش کی ہے۔ جو جرمنی میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ عرضداشت میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ عورتوں کو پریسٹ مقرر کیا جائے اور لازمی رہبانیت کا طریق ختم کیا جائے۔ اس تحریک کا نام ہے "We are The People" یعنی ''ہم عوام ہیں'' اور اس نے دیوار برلن کے گرائے جانے سے قبل لوگوں کو کیمونزم کے خلاف متحرک کیا تھا۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم جنس پسندوں اور مطلقہ افراد کے متعلق بھی ہمدردانہ رویہ اور نرم گوشہ اختیار کیا جائے۔

اسی طرح کی تحریک اور عرض داشت اس سال کے شروع میں آسٹریلیا میں بھی کی گئی تھی۔ نیز سوئٹزرلینڈ میں بھی ویٹیکن کی رجعت پسندی پر تنقید کی جا رہی ہے۔ یورپ کی اصلاحی تحریکیں کہتی ہیں کہ موجودہ پوپ کے ہوتے ہوئے چرچ میں جدید رجحانات کو سمونے کی کوشش کامیاب ہونے کا کوئی امکان نہیں جرمنوں نے عورتوں کو پریسٹ بنانے کی جو عرضداشت دی تھی پوپ نے اس کا ناقابل تنسیخ رد کرنے کی صورت میں جواب دیا ہے۔ چنانچہ اب ہر سال ڈیڑھ لاکھ کیتھولک چرچ کو چھوڑ رہے ہیں۔

آسٹریلیا میں اینگلیکن چرچ کا حال بھی اس سے مختلف نہیں۔ اس چرچ کی مجلس Diocese نے ۱۹۹۲ء میں اپنے ہی چرچ کی قومی مجلس General Synod کا یہ فیصلہ مسترد

کر دیا تھا کہ عورتیں بھی پریسٹ بن سکتی ہیں انہوں نے کہا تھا کہ بائبل کے مطابق صرف مرد ہی پادری بن سکتا ہے اور مذہبی رسومات کی امامت کرسکتا ہے۔ چنانچہ جو عورتیں پریسٹ بننے کی متمنی ہیں وہ سڈنی کے چرچ کو چھوڑ کر دوسرے چرچوں میں قسمت آزمائی کر رہی ہیں جن میں سے ایک ریورنڈ لوسل پائپر ہیں جنکی ایک دوسرے شہر نیوکاسل کا منتقلی ایک نمایاں خبر کا موضوع بنی ہے۔

آسٹریلیا میں اینگلیکن چرچ نے ایک اور جدت بھی کی ہے۔شروع سے یہ طریق چلا آرہا ہے کہ بچے کو چرچ لے جا کر عیسائی بناتے تھے اور اس کو بپتسمہ دے کر اس کا موروثی گناہ دھوتے اور عیسائی نام دھرتے اور جب تقریباً چودہ سال کا ہو جاتا تو اسے Confirmation کی رسم کے ذریعہ چرچ کا پورا ممبر بناتے اس کے بعد وہ تمام مذہبی عبادات و رسومات میں حصہ لینے کا حقدار بن جاتا۔لیکن اب چونکہ اس چرچ کے ممبروں کی تعداد گرتی جا رہی ہے اس لئے انہوں نے چرچ کی اس آٹھ سو سالہ قانون کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اب جلد ہی تین سالہ بچے بھی عبادات میں پورے ممبروں کی طرح شریک ہو سکیں گے۔

گویا یوں لگتا ہے کہ عیسائیت کا ہر قاعدہ واصول توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہا ہے اور عیسائیت کا قلعہ اپنے کلچر کے سہارے ہی قائم ہے۔

(الفضل انٹرنیشنل 10.5.96)

ڈاکٹر بلی گراہم نے اپنا کام اپنے بیٹے کو سونپ دیا

آج کل ڈاکٹر بلی گراہم (Billi Graham) کے بیٹے فرینگلن گراہم سڈنی آئے ہوئے ہیں اور دعائیہ اجتماعات منعقد کر رہے ہیں جس کا اخبارات میں بہت چرچا ہے۔ ان کا مختصر تعارف قارئین کے لئے باعث دلچسپی ہوگا۔

ڈاکٹر بلی گراہم مشہور عیسائی مناد ہیں جو ۱۹۱۸ء میں امریکہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے دنیا بھر میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے ایک ادارہ بنام

Youth for Christ Crusade

قائم کیا جس نے امریکہ اور انگلستان میں کام شروع کیا۔ بعد میں روس شرق اوسط اور افریقی ممالک میں اپنی تنظیم کو قائم کیا۔ آپ کئی کتب کے مصنف ہیں جن میں Peace With God, Secret of Happiness, My Answer, How to be Born Again. زیادہ مشہور ہیں۔ انہوں نے بعض مذہبی فلمیں بھی بنائیں۔ ایک دفعہ انہوں نے کہا تھا کہ مغربی معاشرہ میں جنسی بے حیائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ مجھے یقین ہے کہ اگر ان پر عذاب نہ آیا تو خدا کو لوط کی بستیوں سدوم اور گمورہ سے معذرت کرنی پڑے گی۔ (سدوم اور گمورہ لوط علیہ السلام کی پانچ بستیوں میں سے تھیں جن پر عذاب آیا تھا۔)

ڈاکٹر بلی گراہم اب ۷۷ سال کے ہیں اور بیماری کی وجہ سے سفر کے قابل نہیں آسٹریلیا میں پہلی بار دورہ پر وہ ۱۹۵۹ء میں آئے تھے اور ۳.۳ ملین لوگ ان کے اجتماعات میں شامل ہوئے تھے۔ پھر ۱۹۷۹ء میں جب سڈنی آئے تو ۴۹۱۵۰۰ افراد ان کے اجتماعات میں شامل ہوئے۔ ان کی تنظیم

کا سالانہ بجٹ ۱۱ کروڑ ڈالر سالانہ ہے۔ (۱۱۰ ملین ڈالر) ان کا ایک ہی بیٹا ہے جس کے عشق و محبت کے افسانے، شراب و کباب اور پینے پلانے کے شغل اخباروں میں خوب شہرت پاتے رہے ہیں اور اخبار لکھتا ہے کہ اب اس کے بعد اس نے اپنی باپ کی تنظیم، شکل وصورت اور خدا کی محبت ورثہ میں پالی ہے کیونکہ ڈاکٹر بلی گراہم نے اپنا سب کام کاج اپنے ۴۳ سالہ بیٹے کے سپرد کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کے کام کو کیسے چلاتے ہیں۔ پہلے تو وہ باغی بیٹے کے طور پر مشہور تھے۔ ڈاکٹر بلی گراہم تو بعض دفعہ چھ چھ گھنٹے خطاب کرتے اور بڑے بڑے اجتماعات پر اجتماعی دعا کے دوران رقت طاری کر دیتے۔ لوگ گھنٹوں روتے اور دعا کرتے لیکن ریورنڈ ہیری جے ہربرٹ کہتے ہیں کہ یہ سب بے کار تھا اگر لوگوں کے دلوں پر اس کا واقعی اثر ہوتا تو ان کے جانے کے بعد گرجوں میں حاضری بڑھتی مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ لوگ محض ایک وقتی لطف اٹھاتے تھے اور بات وہیں ختم ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر بلی گراہم وہی صاحب ہیں کہ جب وہ ایک بار افریقہ میں ایسے ہی دعائیہ اجتماعات منعقد کرتے پھر رہے تھے تو ہمارے مبلغ محترم شیخ مبارک احمد صاحب (اطال اللہ عمرہ) نے ان کو دعا کے مقابلہ کا چیلنج دیا تھا لیکن انہوں نے راہ فرار اختیار کر لی تھی۔

(الفضل انٹرنیشنل 10.5.96)

پوپ نے لمبو (Limbo) کا عقیدہ چپکے سے ترک کر دیا

آسٹریلیا (نمائندہ الفضل) مذکورہ بالا عنوان سے یہاں سڈنی مارننگ ہیرلڈ میں ایک خبر چھپی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حال ہی میں پوپ نے لمبو (Limbo) کا عقیدہ چپکے سے اپنے عقائد کی فہرست سے نکال دیا ہے۔ پوپ کیتھولک عقائد پر مبنی ایک سرکلر وقفہ وقفہ سے جاری کیا کرتے ہیں۔ حال ہی میں جو آخری سرکلر اس سلسلہ کا جاری کیا گیا ہے اس میں لمبو کا عقیدہ خارج کر دیا گیا ہے۔ اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کی قابل قبول تشریح مشکل تھی اور یہ عقیدہ عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد کی ناراضگی کا موجب بن رہا تھا۔

لمبو کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر شخص پیدائشی طور پر گناہ گار ہے اور یہ گناہ دھونے کے لئے اس کو بپتسمہ دینا ضروری ہے تا اس کے بعد اس کا معاملہ یسوع مسیح کے سپرد کر دیا جائے اور وہ پیدائشی گناہ کی سزا سے بچ جائے۔ چونکہ بپتسمہ لئے بغیر کوئی انسان جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔ لہذا ایسے افراد کی رہائش کے لئے ایک ایسا مقام تجویز کیا گیا جو جنت سے باہر دوزخ کے کنارے پر واقع ہے جہاں بپتسمہ نہ لینے والے سزا بھگتتے رہیں گے۔ جو بچے چھوٹی عمر میں وفات پا جاتے ہیں ان کا مقام بھی لمبو بیان کیا جاتا تھا۔ لیکن اب جبکہ بپتسمہ نہ لینے والے بالغ عیسائیوں کی تعداد بھی دن بدن بڑھ رہی ہے لہذا ان سب کو لمبو میں داخل کرنا اور اس طرح ان کی ناراضگی مول لینا دن بدن مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ لہذا اس کا آسان حل یہ تجویز کیا گیا کہ چپکے سے یہ عقیدہ عقائد کی فہرست ہی سے خارج کر دیا گیا۔

اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

CELIBACY

چرچ کا بنایا ہوا لغو قانون

برطانیہ میں حال ہی میں ایک فلم ''پریسٹ''(Priest) بنائی گئی ہے جس میں ایک ہم جنس پسند پادری کی زندگی اور اس کے زوال کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ اس فلم کے بارہ میں نیویارک کے آرچ بشپ جان اوکانر(Cardinal john O'Connor) نے کہا ہے کہ یہ نفرت آمیز کیتھولک مخالف (Viciously Anti-Catholic) ہے۔ آسٹریلیا کے پادری فادر رچرڈ لینن (Fr. Richard Lennan) نے فلم دیکھ کر کہا کہ ایک کیتھولک پادری کی مشکلات جو اس میں بیان کی گئی ہیں وہ محض سطحی ہیں۔ اور ایک پادری کو عام زندگی کی رو سے غیر متعلق ظاہر کیا گیا ہے۔ تجرد کی بحث بھی محض چرب زبانی ہے۔ تجرد یا تو چرچ کا اپنا بنایا ہوا بے مقصد قانون تھا یا پھر خدا نے یہ نا قابل یقین وعمل توقع ایک پادری سے باندھی تھی لیکن وہ خود اس سے الگ رہا۔ پادری صاحب کے الفاظ ہیں:

The discussion of celibacy was glib. It was either a useless rule of the church, or it was some incredible ideal that God asked of the priest but that God was not part of.

پادری صاحب نے جو کہا ہے وہ شروع سے اب تک لاکھوں پادریوں کے دل کی آواز ہے اور قرآن اس سوال کا جواب چودہ سو سال پہلے دے چکا ہے کہ تجرد کی زندگی بسر کرنا چرچ کا اپنا فیصلہ تھا یا خدا نے ایسا حکم دیا تھا۔ خدا فرماتا ہے:

> ''پھر ہم نے ان کے (یعنی اولاد نوح وابراہیم کے) بعد اپنے رسول ان کے نقش قدم پر چلا کر بھیجے اور عیسیٰ بن مریم کو بھی ان کے نقش قدم پر چلایا اور اس کو انجیل بخشی۔ اور جو اس کے متبع ہوئے ہم نے ان کے دل میں رافت اور رحمت پیدا کی اور انہوں نے کنوارا رہنے کا طریق اختیار کیا جیسے اور انہوں نے

خود اختیار کیا تھا۔ ہم نے یہ حکم ان پر فرض نہیں کیا تھا اور (گو) انہوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے یہ طریق اختیار کیا تھا مگر اس کا پورا لحاظ نہ رکھا۔ پس ان میں سے جو مومن تھے ان کو ہم نے مناسب حال اجر بخشا اور ان میں بہت سے فاسق تھے۔'' (الحدید:۲۸)

(الفضل انٹرنیشنل 11.2.2005)

آسٹریلیا کے کیتھولک پادریوں کی شرطِ تجرّد کے خلاف بغاوت

آسٹریلیا کے کیتھولک پادریوں نے پوپ سے مطالبہ کیا ہے کہ ان پر شادی نہ کرنے کی پابندی ختم کی جائے ان کے مطالبہ کی تائید میں سڈنی مارننگ ہیرلڈ میں بہت سے خطوط، مضامین اور ایک اداریہ لکھا گیا ہے جن میں سے چند اقتباسات ہدیۂ قارئین ہیں۔

ایک صاحب Brian Haili لکھتے ہیں:

"اس بات کا بہت ہی کم امکان ہے کہ پادریوں کا مطالبہ تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن اگر یوں ہوجائے تو چرچ میں عورتوں کی بڑی اہمیت کا حامل اثر نفوذ کر جائے گا۔ اب تک یہ تھا کہ عملاً تو مرد و عورت کی مساوات کو نظر انداز کیا جارہا تھا جبکہ زبانی کلامی ان کو مساوی حقوق دینے کی تلقین کی جاتی تھی جو ایک بیکار بات تھی۔ اب پادریوں کو بھی بیویوں، ماؤں، خاوندوں اور باپوں کا کردار اور ضرورت کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع ملے گا۔"

ایک اور صاحب Owen Koegh لکھتے ہیں:

"مجھے کامل یقین ہے کہ آج کیتھولک چرچ کے اہم مسائل میں سے ایک پادریوں کو شادی کرنے کی اجازت دینا ہے۔ جب تک ویٹیکن (vatican) اس مسئلہ کی طرف اپنی توجہ مبذول نہیں کرے گی پادریوں کی تعداد مسلسل گرتی

جائے گی اور بالآخر کیتھولک مذہب ہی ناپید ہو جائے گا۔‘‘

ایک اور صاحب S.E.P. Keogh لکھتے ہیں:۔

’’کیتھولک چرچ میں مجرّد رہنے کی شرط دراصل عورتوں کے خلاف اس تعصب کا نتیجہ ہے جو زمانہ وسطیٰ میں ان کے خلاف پایا جاتا تھا اور جس کے متعلق کوئی حکم قدیم اولین چرچ میں نہیں۔ ہمیں پتہ ہے کہ پطرس (Peter) شادی شدہ تھے۔(متی باب ۸ آیت ۱۴)

اس لئے جس طرح سب سے پہلے پوپ کا شادی شدہ ہونا درست تھا۔ اسی طرح ان کے جانشینوں اور دوسرے پادریوں کے لئے بھی درست ہے۔ زمانۂ وسطیٰ کے پوپ عورتوں کے بارہ میں عجیب پراسرار خیالات رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک عورتوں کی دو ہی قسمیں تھیں یا تو وہ زنا کار طوائفیں تھیں یا بے داغ معصوم۔

سینٹ میری مگدلینی کو خطرناک طور پر بدنام کر کے پہلی قسم کے نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا تھا اور دوسری قسم کی مثال سینٹ میری (حضرت مریمؑ) کی اندھی عقیدت کے ساتھ بیان کی جاتی تھی۔ یہ خوش آئندہ بات ہے کہ تاریک ماضی کی ان یادگاروں کو ختم کرنے کے لئے آسٹریلیا کے کیتھولک پادریوں نے علم بغاوت بلند کیا ہے۔

سڈنی مارننگ ہیرلڈ اپنے ۲۸؍جنوری ۲۰۰۵ء کے ادارتی کالم میں پادریوں کے مطالبہ کی حمایت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ آج ۱۵ فیصد سے بھی کم لوگ چرچ جاتے ہیں اور پادری ہیں کہ اپنے مذہبی اداروں کو چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں اور نئے لوگ ان کی جگہ لینے کے لئے آگے نہیں آ رہے..... یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کیتھولک پادری ہمیشہ ہی تجرّد کی زندگی نہیں گزارتے رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ابتدائی پوپ شادی شدہ ہوتے تھے۔ بعضوں کے بچے بھی تھے جو بعد میں پوپ بنے..... اندازہ ہے کہ ۲۰ سال کے عرصہ میں کیتھولک چرچ کے پاس رسمی دعا کی قیادت کے لئے جتنے پادری چاہئیں ان کا صرف چھٹا حصہ رہ جائے گا۔

(الفضل انٹرنیشنل 11.2.2005)

عیسوی سال کا آغاز

آج کل عملاً ساری دنیا سن عیسوی کو ہی استعمال کرتی ہے اگرچہ پہلے وقتوں میں قوموں کے اپنے اپنے سال ہوتے تھے۔ مثلاً مصریوں، ہندوستانیوں، چینیوں، ایرانیوں، وغیرہ کے اپنے اپنے سال مقرر تھے۔ عرب چاند کے مہینوں کو استعمال کرتے تھے، رومن اپنا سال یکم جنوری سے شروع کرتے تھے۔

دراصل سال ایک گول دائرہ کی طرح ہے اس لئے اس کا آغاز سال کے کسی بھی دن سے کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے موسم کی تبدیلی پر اس کی بنیاد رکھی گئی۔ ورنہ دراصل تو سورج کے سال کا آغاز اس دن سے ہونا چاہئے تھا جس روز ۴۶۰۰ ملین سال پہلے زمین سورج سے علیحدہ ہو کر اپنے محور پر جھکی اور کشش ثقل (Gravity) کے زیر اثر اس نے سورج کے گرد اپنے مدار پر گھومنا شروع کیا تھا۔ اس وقت زمین پر کوئی مخلوق نہ بستی تھی۔ ظاہر ہے ہزاروں درجے سنٹی گریڈ گرم آگ کے گولہ پر کون رہ سکتا تھا لیکن بفرض محال اگر اس وقت کوئی وجود زمین پر ہوتا اور سورج کو پہلی بار زمین پر طلوع ہوتے دیکھتا تو وہی دن سال کا پہلا دن ہوتا۔ لہٰذا سال کے آغاز کا فیصلہ ہر قوم کی اپنی مرضی پر منحصر تھا جس طرح کسی نے چاہا کر لیا۔ اس لئے یکم جنوری کو کوئی مخصوص حیثیت دینے کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ باقی دن بھی اسی خدا کے بنائے ہوئے ہیں اور نظریاتی طور پر کسی بھی دن سے سال کا آغاز سمجھا جاسکتا ہے۔

رومنوں نے ۱۵۳ قبل مسیح میں یکم جنوری سے سال کا آغاز کیا لیکن ان کا کیلنڈر موسموں کے ساتھ منطبق نہیں ہوتا تھا۔ 47 قبل مسیح میں جولیس سیزر (Jullius Caeser) نے اس سال کو ۴۴۵ دن کا قرار دے کر اس فرق کو دور کیا۔ لیکن ۵۷۶ عیسوی (یعنی آنحضرت ﷺ کی پیدائش کے

چھ سال بعد) اس وقت کی رومن حکومت نے موسم بہار میں جب دن رات برابر ہوتے ہیں یعنی ۲۱ مارچ سے سال کا آغاز قرار دے دیا۔ سیزر کے کیلنڈر میں ایک اور غلطی تھی۔ اس کا کیلنڈر کا سال شمسی سال کے مقابلہ میں ۱۸ گھنٹے اور ۳۲ منٹ زیادہ لمبا تھا۔ اس غلطی کی اصلاح ۱۵۸۲ء میں پوپ گریگوری (xIII) نے کی اور ۴ اکتوبر ۱۵۸۲ء بروز جمعرات کے بعد جمعہ کے روز کو ۱۵ اکتوبر قرار دے دیا۔ نیز اس نے دیکھا کہ سال ۳۶۵.۲۵ دن کا ہوتا ہے اور چار سال بعد ایک دن زائد ہو جاتا ہے اس لئے لیپ کا سال ۳۶۶ دن کا کر دیا۔ یہی گریگورین کیلنڈر آج دنیا استعمال کرتی ہے۔

اس سال ۲۶ دسمبر ۲۰۰۴ء کو بارہ ممالک پر قیامت گزر گئی۔ شدید زلزلہ اور سمندری طوفان (Tsunami) کی وجہ سے ڈیڑھ لاکھ سے زائد انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ کئی ممالک نے نئے سال کی تقریبات منسوخ کر دیں اور ان پر اٹھنے والا خرچ سیلاب زدگان کو دے دیا۔ سڈنی میں گو تقریبات منسوخ تو نہیں کی گئیں البتہ آتش بازی کے بعد ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ گویا رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

مومن چونکہ کوئی دعا کا موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اس لئے وہ معروف سال کا آغاز بھی دعاؤں ہی سے کرتا ہے۔ ورنہ وہ تو ہر روز خدا سے عرض کرتا ہے: ہر دن چڑھے مبارک ہر شب بخیر گزرے۔

(الفضل انٹرنیشنل 14.1.2005)

''ڈاونچی کوڈ'' (Da Vinci Code) کے خلاف

چرچ کا شدید ردّ عمل

ایک مصنف Dan Brown نے حال ہی میں ایک ناول Da Vinci Code کے نام سے لکھا ہے جس کے بارہ میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس کی بنیاد تاریخی حقائق اور آثار پر رکھی گئی ہے جن میں خاص طور پر فلپ کی انجیل (Gospel of Philip) قابل ذکر ہے۔

انجیل فلپ ان انجیلوں میں سے ایک ہے جن کو عیسائی غیر معتبر اور مشکوک اناجیل (Apocryphal Gospel) قرار دیتے ہیں کیونکہ ان میں ابتدائی عیسائیوں کے ایسے عقائد بیان کئے گئے ہیں جو آج کل مروّجہ عیسائی عقائد سے بنیادی طور پر متصادم ہیں۔

جب ۳۲۵ء میں شہنشاہ قسطنطین (Constantine) نے نیکیا (Nicea) (حال ترکی) کے مقام پر ۳۳۰ پادریوں کی کونسل بلا کر موجودہ انجیل کو سٹینڈرڈ قرار دے کر ابتدائی زمانہ کی لکھی ہوئی سب انجیلوں کو مشکوک اور غلط ٹھہرا کر جلا دینے کا حکم دیا تھا اور ان کے رکھنے والے کو ملحد قرار دے کر واجب القتل قرار دیا تھا تو جن کے پاس وہ پرانی انجیلیں تھیں انہوں نے موت کے ڈر سے یا تو انہیں جلا دیا یا مرتبانوں میں ڈال کر ریت میں دبا دیا تھا۔

مذکورہ بالا ناول اور فلم میں ہماری دلچسپی کی جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ شہنشاہ قسطنطین نے پادریوں کے ساتھ مل کر ملحدانہ عقائد (Paganism) کو اصل عیسائی عقائد کے ساتھ ملا جلا کر ایک دوغلا (Hybrid) قسم کے مذہب کو طاقت کے بل پر رواج دیا۔ جس میں

حضرت عیسیٰعلیہ السلام کوایک بشر رسول (Mortal Prophet) کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کا مرتبہ دے دیا۔ اوراس نئے مذہب کو رائج کرنے کے لئے ایسی بائبل کو جاری کیا جس میں اس کی مرضی کے عقائد درج کئے گئے تھے۔

ناول کے مطابق یسوع خدانہ تھا اسے خدا کے طور پر منوایا گیا تھا۔

دوسری قابل ذکر بات فلم میں یہ بیان کی گئی ہے کہ یسوع نے مریم مگدلینی سے شادی کی تھی اوراس شادی سے شاہی نسل چلی تھی لیکن اس حقیقت کولوگوں سے چھپانے کے لئے چرچ کی سربراہی میں ایک سازش تیار کی گئی تھی۔فلم میں بیان کردہ یہ بات بھی فلپ انجیل سے اخذ کی گئی ہے۔

ہماری سڈنی جماعت میں عیسائیت پر تحقیق کے میدان کے ایک چھپے رستم سید ضیاء الحق صاحب ایڈووکیٹ کراچی ہیں۔خاکسار کی درخواست پر انہوں نے ''ناگ حمّادی لائبریری'' کے Apocryphal Gospel میں سے تلاش کر کے تیرہ صفحات پر مشتمل ایک مضمون لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی حضرت عیسیٰعلیہ السلام کی زوجہ تھیں۔اوران کی نسل کشمیر میں موجود ہے اور وہی خاندان جو آج تک صاحبزادہ کہلاتے ہیں حضرت عیسیٰعلیہ السلام کی قبر کے نگران چلے آتے ہیں۔ان کے حوالوں میں سے ایک دو کا مختصر ذکر یہاں مناسب ہوگا۔

1۔''وہ تین تھیں جو خداوند (مسیح) کے ساتھ ہمیشہ شریک سفر رہیں۔(ان میں سے ایک) مریم ان کی والدہ اور (دوسری) ان کی بہن اور (تیسری) مگدلینی تھیں۔جنہیں ان (حضرت مسیح) کا (جیون) ساتھی کہا جاتا ہے۔ان کی (مسیح کی) بہن اور ان کی والدہ اور ان کی (جیون) ساتھی (تینوں) مریم تھیں''۔(فلپ کی انجیل باب ۵۹ آیات ۷ تا ۱۲)

(نوٹ: بریکٹ کے الفاظ مفہوم کو واضح کرنے کی غرض سے ہیں، اصل متن میں نہیں)۔

2۔''اور نجات دہندہ (مسیح) کی ساتھی مریم مگدلینی۔انہوں (مسیح) نے ان کے ساتھ تمام شاگردوں سے بڑھ کر محبت کی اور وہ (مسیح) اکثر ان کے منہ کا بوسہ لیا کرتے تھے''۔

(فلپ کی انجیل باب ۶۳ آیت ۳۱)

3۔''پطرس نے مریم (مگدلینی) سے کہا: بہن ہم جانتے ہیں کہ نجات دہندہ (مسیح) نے تمام عورتوں سے زیادہ بڑھ کر تمہارے ساتھ محبت کی۔ہمیں نجات دہندہ کے وہ الفاظ بتاؤ جو تم کو یاد

ہیں جنہیں کہ (صرف) تم ہی جانتی ہو ہم نہیں (اور) نہ ہی ہم نے انہیں کبھی سنا''۔

(مریم مگدلینی کی انجیل باب ۱۰ آیات ۱ تا ۷)

جو مصنفین و محققین مریم مگدلینی کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زوجہ قرار دیتے ہیں ان میں Dan Brown کے علاوہ باربرا تھیئرنگ (Barbra Theiring) اور انڈریاس فیبر قیصر (Andreas Faber Kaiser) شامل ہیں۔

عیسائیوں کے لئے جو بات زیادہ پریشان کن ہے وہ یہ ہے کہ یسوع مسیح خدا یا خدا کا بیٹا نہ تھے بلکہ محض خدا کے ایک نبی تھے اور مسیح کے ابن اللہ ہونے کا عقیدہ ایک سازش کے ذریعہ رائج کیا گیا ہے۔ ان کو تو پہلے ہی یہ بے چینی تھی کہ خدا تو ہو ہی ایک سکتا ہے ہم تثلیث کے عقیدہ کو کس طرح قابل فہم بنائیں۔ چنانچہ ورلڈ بائبل پبلشرز کی پاکٹ بائبل ڈکشنری (Meridn Publication) کے صفحہ ۱۰۱ پر ''خدا کی توحید'' (Unity of God) کے عنوان کے تحت جو لکھا ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

> ''توحید خدا: صرف ایک وجود ہی ایسا ہے جو اپنی ذات میں قائم ہے۔ چنانچہ بائبل ہمیں خدا کے بارہ میں بتاتی ہے کہ وہ ایک اور صرف ایک خدا ہے۔ ایک سے زیادہ خداؤں کا وجود (عقلاً) ممکن ہی نہیں کیونکہ (خدائی صفات) ازلیت وابدیت، لامحدود و لامتناہی ہونا اور ہر جگہ ہر وقت موجود ہونا (Eternity, Infinity, Omni Presence) ایسی صفات ہیں جو ایک سے زیادہ وجودوں میں جمع ہی نہیں ہو سکتیں۔ (مثلاً) اگر دو وجود ایسے ہوں جو ان صفات کے ہوں تو وہ یا ایک دوسرے کی حدود کو پابند کریں گے اور یا ایک دوسرے کی حدود میں داخل ہو کر اسے وہاں سے باہر نکالیں گے اور ایسی صورت میں خدا کا وجود برقرار رہنا ہی ناممکن ہو جائے۔ خدا نے کتاب میں اپنے آپ کو بطور باپ، بیٹے اور روح القدس سے متعارف کروایا ہے۔ ایک خدا کے وجود میں یہ تین علیحدہ شخصیات (Three Separate Persons) جمع ہیں۔ لیکن یہ تین خدا نہیں ہیں۔ اس لئے یہ عقیدہ تثلیث

(Trinity) کہلاتا ہے۔نہ کہ تین خداؤں کا عقیدہ (Tritheism)''۔یعنی تین علیحدہ علیحدہ بھی ہیں اور ایک بھی ہیں۔ایک تین اور تین ایک۔

مندرجہ بالا حوالہ میں جو بیان کیا گیا ہے کہ ایک سے زیادہ خداؤں کا وجود عقلاً محال ہے، یہ بات خدا تعالیٰ قرآن کریم میں پہلے ہی بیان فرما چکا ہے۔چنانچہ فرمایا **لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا** (الانبیاء:۲۳) اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوائے کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں تباہ ہو جاتے۔اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات میں ایک زبردست نظم وضبط پایا جاتا ہے جس نے ایک طرف تو ساری کائنات کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور دوسری طرف ایک ایک ذرّہ کی تہ تک اس نے نفوذ کیا ہوا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی کٹّر دہریہ بھی انکار نہیں کرسکتا۔ہر جگہ قانون کے یکساں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ قانون نافذ کرنے اور چلانے والی ایک ہی ہستی ہے۔اگر بالفرض خدا ایک سے زائد ہوتے تو ان کے قوانین بھی اپنے اپنے ہوتے اور ساری کائنات افراتفری کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو جاتی۔ہر مخلوق اپنی طاقتوں، استعدادوں اور صفات میں ایک حد کے اندر پابند ہوتی ہے۔لیکن خالق ان سب حد بندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔وہ تو زمان و مکان کا خود خالق ہوتا ہے۔اس کی سننے اور دیکھنے اور قدرتوں کی کوئی حد بست نہیں ہوسکتی۔اس لئے اگر بالفرض خدا ایک سے زائد ہوتے تو وہ اپنے اپنے علاقوں کی حد بندیاں کر کے ان میں اپنے اپنے مخصوص قوانین نافذ کرتے۔چونکہ ضروری ہے کہ خدا غیر محدود طاقتوں کا مالک ہو وہ ایک دوسرے کی حدود میں ضرور داخل ہو جاتے اور باہم گتھم گتھا ہو کر سبھی فنا کا شکار ہو جاتے۔پس خدا کا یہ فرمانا بالکل برحق ہے کہ اگر اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہوتا تو وہ خود بھی دونوں تباہ ہو جاتے اور زمین و آسمان بھی تباہ ہو جاتے۔

اب ناول اور اس پر شدید ردّ عمل کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔یہ ناول اتنا مقبول ہوا کہ اس کی چالیس ملین (چار کروڑ) کاپیاں اب تک فروخت ہو چکی ہیں۔چرچ کو فکر پڑ گئی ہے کہ اس ناول نے تو عیسائیت کے بنیادی عقائد پر سخت ضرب لگائی ہے۔ایسا نہ ہو کہ ایسے عیسائی جو پہلے ہی شک کا شکار ہیں کہیں عیسائیت ہی سے بدظن ہو جائیں۔اس ناول کی ویٹیکن نے بھی مذمّت کی ہے اور اس

کی حمایت میں سڈنی کے آرچ بشپ کارڈینل جارج پیل(Cardinal George Pell)نے اسے بھدّی افسانہ تراشی قرار دیا ہے اور اسے محض تاریخ میں واقع ہونے والے استثنائی اور اتفاقی واقعات پر مبنی قرار دیا ہے اور لوگوں کو حوصلہ دلاتے ہوئے کہا ہے کہ یہ کتاب ہمارے عقائد کو متزلزل نہیں کر سکتی۔

اسی طرح سڈنی کے Anglican, Baptist Uniting اور دوسرے چرچوں کے سربراہوں نے بھی اس کتاب کی بھرپور مذمت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہمارے مذہب کو اس سے کوئی خطرہ نہیں بلکہ الٹا لوگوں کو حقیقت معلوم کرنے کے لئے تجسّس پیدا ہوگا۔ کتاب کے اثر کو زائل کرنے کے لئے کئی کتابیں مارکیٹ میں آچکی ہیں جن میں بائبل سوسائٹی نیوساؤتھ ویلز کی جاری کردہ کتاب Deciphering The Da Vinci Code اور Da Vinci De code شامل ہیں۔ مختلف جگہوں پر لیکچروں کا انتظام کیا گیا ہے۔ Baptist Church والوں نے ایک تھیٹر کرایہ پر لے کر سارے پادریوں اور مذہبی دلچسپی رکھنے والوں کو مدعو کر کے یہ فلم دکھائی اور دوسرے دن ان کو چرچ میں بلا کر فلم میں مذکور باتوں کی توضیح و تردید کی گئی۔ بعض ناقدین کا رویّہ یہ تھا کہ ''بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا''۔ ویب سائٹ کے ذریعہ بھی کتاب کا ردّ کیا جا رہا ہے۔

کم از کم چار کروڑ لوگوں تک جب یہ کتاب پہنچ چکی تھی کہ اس کے مصنف ڈان براؤن پر کئی لوگوں نے مضمون کے سرقہ (Plagiarism) کا الزام لگا کر مقدمہ چلا دیا ہے۔ لیکن U.K. کی ہائی کورٹ نے مصنف کو بری قرار دے دیا ہے۔ الزام لگانے والوں میں ایک صاحب Michael Baigent بھی شامل تھے۔ جس ہفتہ یہ فلم پردۂ سکرین پر آئی اسی ہفتہ انہوں نے ایک اور کتاب بنام "The Jesus Papers" بازار میں فروخت کے لئے پیش کر کے عیسائی مذہبی دنیا میں ایک اور دھماکہ کر دیا۔ اس کتاب کے سرورق پر دائیں کونہ میں موٹے حروف میں لکھا ہے: Exposing The Greatest Cover Up in History یعنی تاریخ کے اہم ترین راز کا انکشاف۔ اور وہ راز یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیبی موت سے بچ گئے تھے اور ان کو بچانے کے لئے رومی حاکم پیلاطوس (Pontius Pilate) نے در پردہ ساز باز کی تھی۔

چلو کفارہ کے عقیدہ سے چھٹی ہوئی۔ فلم نے تو مروّجہ انجیل کا اعتبار ختم کیا تھا۔ یسوع مسیح کو خدا کے مرتبہ سے واپس لا کران کے اصلی مقام ''بشر رسول'' کے طور پر پیش کیا تھا۔ ان کی شادی اور اہلی زندگی اور اولاد وغیرہ کا ذکر کیا تھا تو اب اس نئی کتاب نے ان کے صلیب پر مرنے، مرکر جی اٹھنے وغیرہ عقائد کو بھی خود تراشیدہ ظاہر کر دیا ہے۔

قرآن کریم تو پہلے ہی واضح طور پر حضرت عیسیٰ b□ کی طبعی وفات کا بطور پیشگوئی اور پھر بطور واقعہ ذکر کر چکا ہے جیسے فرمایا یٰعِیْسٰٓی اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ (آل عمران:۵۶) اے عیسیٰ مَیں تجھے طبعی طور پر وفات دوں گا۔ یعنی وہ تجھے صلیب پر مارنے اور قتل کرنے پر قادر نہ ہوسکیں گے اور پھر واضح طور پر بطور واقعہ بھی بیان کر دیا کہ وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُم(النساء:۱۵۸)۔ وہ یقیناً اسے قتل نہیں کر سکے اور نہ صلیب دے (کر مار) سکے بلکہ ان پر معاملہ مشتبہ کر دیا گیا۔ آج کل جو کچھ پردہ ٔغیب سے ظہور میں آرہا ہے وہ اس صداقت کو ثابت کرنے کے لئے ہے۔

جو کچھ Michael Baigent نے اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے کہ پیلاطوس یسوع کو بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا یہ بات حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی بالواسطہ تائید کرتی ہے۔ آپؑ نے سو سال سے بھی زیادہ پہلے تحریر فرمایا تھا:

> ''پیلاطوس اپنے اس قول پر قائم نہ رہ سکا۔ اور جب اُس کو کہا گیا کہ قیصر کے پاس تیری شکایت کریں گے تو وہ ڈر گیا اور حضرت مسیحؑ کو اس نے عمداً خونخوار یہودیوں کے حوالہ کر دیا۔ گو وہ اس سپردگی سے غمگین تھا اور اس کی عورت بھی غمگین تھی کیونکہ وہ دونوں مسیح کے سخت معتقد تھے۔ لیکن یہودیوں کا سخت شوروغوغا دیکھ کر بزدلی اس پر غالب آ گئی۔ ہاں البتہ پوشیدہ طور پر اس نے بہت سعی کی کہ مسیح کی جان کو صلیب سے بچایا جاوے۔ اور اس سعی میں وہ کامیاب بھی ہو گیا۔ مگر بعد اس کے کہ مسیح صلیب پر چڑھایا گیا اور شدت درد سے ایک ایسی سخت غشی میں آ گیا کہ گویا وہ موت ہی تھی۔ بہرحال پیلاطوس رومی کی کوشش سے مسیح ابن مریم کی جان بچ گئی اور جان بچنے کے لئے پہلے سے مسیح کی دعا

منظور ہو چکی تھی ۔ دیکھو عبرانیاں باب 5 آیت 7 ۔ بعد اس کے مسیح اس زمین سے پوشیدہ طور پر بھاگ کر کشمیر کی طرف آ گیا اور وہیں فوت ہوا ۔ اور تم سن چکے ہو کہ سری نگر محلّہ خانیار میں اس کی قبر ہے ۔ یہ سب پیلاطوس کی سعی کا نتیجہ تھا‘‘ ۔

(کشتیٔ نوح ۔ روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۵۷ ۔ ۵۸)